مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد چہارم

فردوسی سے متعلق مضامین

•

مرتبہ

مظہر محمود شیرانی

•

مجلسِ ترقئ ادب
کلب روڈ ـــ لاہور



مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد چہارم

فردوسی سے متعلق مضامین

مرتبہ
مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقئ ادب
کلب روڈ ــــ لاہور

طبع اول : جون ۱۹۶۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

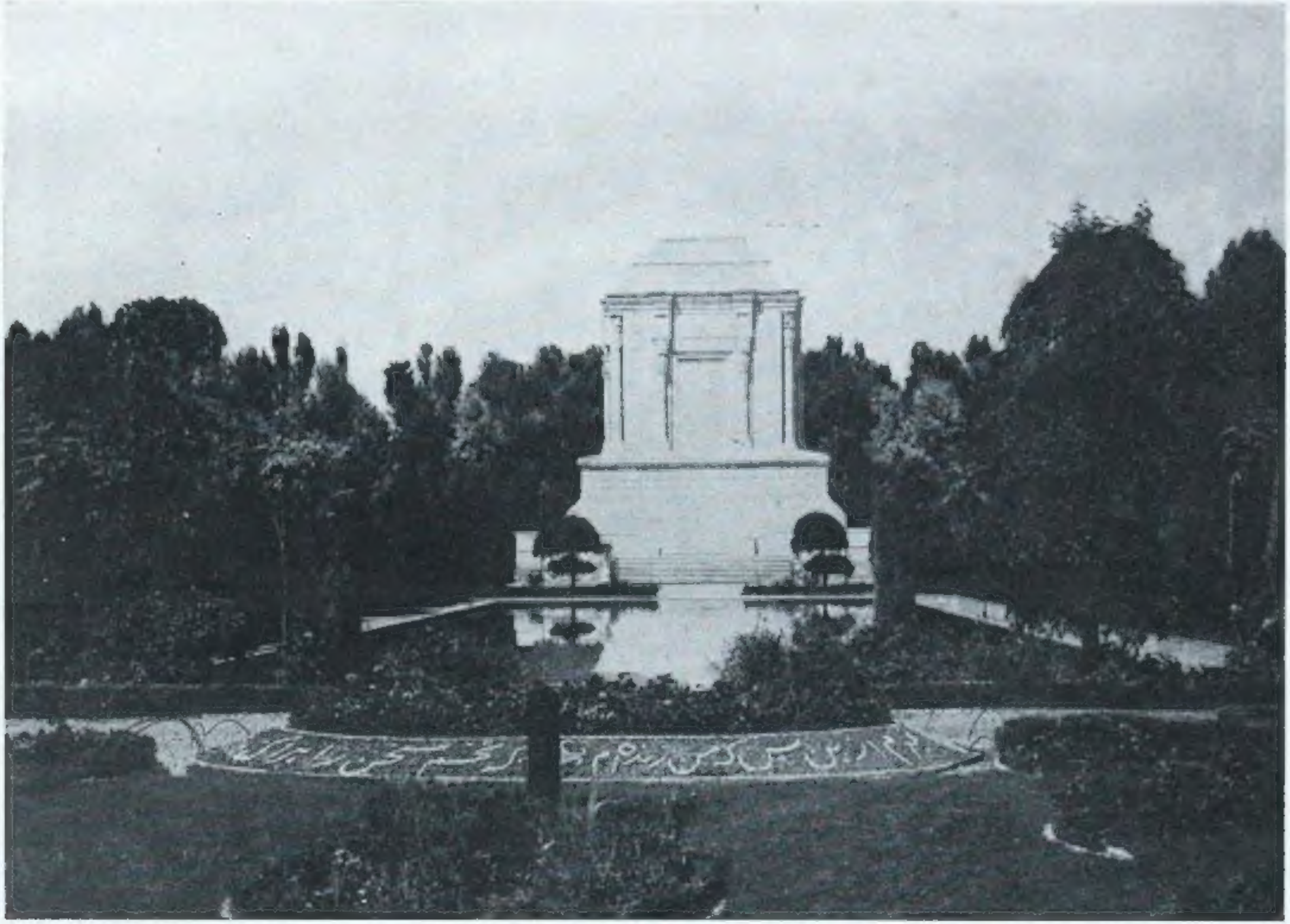
ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : سید اظہارالحسن رضوی

مطبع : مطبعِ عالیہ ۱۲۰/۵ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : بارہ روپے

فہرست



آرام گاه فردوسی - طوس مشهد

ایران کا زندۂ جاوید شاعر

فردوسی

(یہ مضمون جیسا کہ اس کے آغاز میں خود مصنف نے اعتراف کیا ہے ، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر ، جو کلکتے میں منائی جانے والی تھی ، لکھا گیا تھا ۔ اس کی تحریر سے قبل حافظ صاحب فردوسی اور شاہنامے سے متعلق بعض معرکہ آرا مضامین سپرد قلم کر چکے تھے جو پیش نظر جلد میں یکجا کر دیے گئے ہیں ۔ زیر نظر مضمون کو ایک لحاظ سے اس جلد کا مقدمہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں مصنف نے اپنے مفصل مضامین کی تلخیص پیش کی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اس کو دوسرے مضامین پر سبقت دی گئی ہے ۔ مرتب)

فردوسی کو اس وقت دنیائے ادب میں ایک بین الملی حیثیت حاصل ہے ۔ اس کی توصیف و تحسین میں مغرب مشرق سے پیچھے نہیں ہے ۔ شاہنامہ اگرچہ فارسی خواں مشرق میں بہت مقبول ہو رہا ہے لیکن خود شاعر کے حالات کی تحقیق و تنقید میں مغرب مشرق سے بازی لے گیا ہے ۔ یورپ کے دو مشہور فاضل نلدیکی اور ایتھے نے جس محنت و کاوش سے اس کے زمانے اور حالات پر روشنی ڈالی ہے ، خود فردوسی کے وطن ایران میں اس کے مقابلے کا کوئی کام نہیں ہو سکا ۔ میرے دوست پروفیسر محفوظ الحق اس امر کے محرک ہیں کہ میں فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر جو ماہ ستمبر میں

کلکتے میں منائی جائے گی ، چند سطور فردوسی کے حالات میں حوالۂ قلم کروں ۔ ان سطور میں میں کسی طویل بحث کو تو چھیڑ نہیں سکتا البتہ بعض امور اور عام نتائج جو شاہنامے کے مطالعے سے مجھ کو معلوم ہوئے ، مختصراً یہاں پیش کرتا ہوں ۔

فردوسی پر دنیا کی مختلف زبانوں میں ممالک مشرق و مغرب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ دنیا نے اس کے حالات کی جستجو میں ہر ممکن ذریعۂ معلومات اور ضروری مآخذ کو چھان مارا ہے ۔ ہر قسم کی اطلاع کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور اس انبار سے رطب کو یابس سے اور درست کو نادرست سے شناخت کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے ۔ ہم یہاں زیادہ تر اسی اطلاع پر اعتبار کریں گے جو ہمیں خود فردوسی کے اپنے بیان یا بہ الفاظ دیگر شاہنامے سے حاصل ہوتی ہے ۔ شاہنامے کی شہادت اگرچہ مبہم اور مجمل ہے مگر اس کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور فردوسی کے اپنے بیان سے زیادہ اور کون سی معتبر شہادت ہوسکتی ہے ۔ میں نے بعض موقعوں پرضرورتاً دیگر مآخذ سے کام لیا ہے ۔ ان میں شاہنامے کا دیباچۂ قدیم سب سے پرانا مآخذ ہے ۔

فردوسی کا نام ابوالقاسم منصور ہے اور وہ جماعت دہاقین[1] سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس امر پر تمام مآخذ متفق ہیں ۔ دہقان ایران میں ایک جماعت تھی جو گویا سرکار اور کاشتکار میں درمیان کا واسطہ تھی ۔ یہ طبقہ ایران میں ساسانیوں کے عہد سے موجود تھا ۔ ہر دہقان اپنی اپنی متعلقہ زمین کے مالیے کے لیے سرکار میں ذمہ دار تھا ۔ ادھر وہ کاشت کاروں کو زمین بہ غرض کاشت تقسیم کر دیا کرتا تھا ۔

---

۱ ۔ دیباچہ قدیم کی اصل عبارت یہ ہے :

''آوردہ اند کہ پدر فردوسی مرد دھقان بود ، دو فرزند داشت ۔ یکی حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی و یکی مسعود ۔'' (حاشیۂ مصنف)

دہقانوں کی جماعت[1] پانچ طبقوں میں منقسم تھی ۔ فردوسی کا جماعت دہقان سے تعلق رکھنا ایک ایسا خیال ہے جس کی تائید بار بار شاہنامے سے ہوتی ہے ۔ شاہنامے میں اس نے ایسے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے جو ایک دہقان کو زیادہ مرغوب[2] ہوں ۔ وہ اپنی ذات کے تعلق میں بھی برفباری سے فصل کے ضائع ہونے ، آمدنی کی اور صورت نہ ہونے اور سرکاری مالیے سے کسی صورت مفر نہ ہونے پر متفکر معلوم ہوتا[3] ہے ۔ ایک اور موقع پر ژالہ باری سے فصل کی تباہی کا ماتم کرتے دیکھا جاتا ہے[4] ۔

شاہنامہ فردوسی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ۔ اس کی تعریف کے سلسلے میں ہمارے اہل قلم نے مختلف خیال آرائیاں کی ہیں ۔ قدیم تذکرہ نگار بالعموم لکھتے آئے ہیں کہ خود سلطان کو تاریخ عجم سے بے حد شغف تھا اور وہ مدت سے متلاشی تھا کہ کوئی ایسا باکمال مل جائے جو اس تاریخ کو نظم کا جامہ پہنا دے ۔ یہ اور اس قسم کے دیگر بیانات بالکل غیر تاریخی ہیں ۔ خوش قسمتی سے شاہنامہ اس بارے

---

۱ ۔ تفصیل کے لیے دیکھو مروج الذہب ، صفحہ ۲۴۰-۲۴۱ ، جلد دوم ۔ (حاشیہ مصنف)

۲ ۔ مثلاً دیکھو شاہنامہ طبع کلکتہ ، صفحہ ۱۰ ، محمود کی تعریف میں :

"زفرش جہان شد چو باغ و بہار"

اور ساتھ کا شعر :

"ز ابر اندر آمد بہ ہنگام نم"

ایک اور موقع پر محمود کو خطاب کر کے لکھتا ہے :

کہ جاوید بز کس کند آفرین
بدان شاہ کاباد دارد زمین

(شاہنامہ صفحہ ۱۶۲۳ ، جلد سوم) ۔ حاشیہ مصنف ۔

۳ ۔ دیکھو صفحہ ۱۳۸۷ ، جلد ثالث :

"برآمد یکی ابرو برشد بہ ماہ"...الخ کے بعد کے اشعار ۔(حاشیہ مصنف)

۴ ۔ دیکھو صفحہ ۲۰۸۹ ، جلد رابع اور شعر :

"تگرگ آمد امسال برسان مرگ"...الخ اور بعد کا شعر"۔ (حاشیہ مصنف)

میں کافی روشنی ڈالتا ہے ۔ شاہنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظم کے لیے دنیا سلطان محمود کی مطلق ممنون نہیں ہے ، بلکہ ایک نامعلوم عورت کی جو فردوسی کی بیوی تھی ۔

بعض وقت چھوٹی باتوں سے بڑے کاموں کی ابتدا ہو جایا کرتی ہے ۔ شاہنامے کے اسباب نظم کی تلاش میں ہمیں اسی قسم کا ایک خفیف واقعہ ملتا ہے جو درحقیقت عظیم الشان شاہنامے کی تصنیف کا ذمہ دار ہے ۔ شاہنامے کی تصنیف فارسی ادبیات میں ایک عظیم‌الشان واقعہ ہے اور بادی النظر میں اس بڑے واقعے کا ایک رات کی کچھ دیر کی بے خوابی سے کیا تعلق ہوسکتا ہے مگر دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہی خفیف سا واقعہ شاہنامے کی تصنیف کا ذمہ دار ہے ۔

اس کے لیے ہمیں طوس کے ایک باغ کا تصور کرنا چاہیے جس میں فردوسی لیٹا ہوا ہے ، باغ سے ملحق اس کا مکان ہے ۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں کا چاند غروب ہو چکا ہے ، ظلمت چاروں طرف چھاؤنی چھا رہی ہے ، تاریکی سے باغ کا منظر نہایت بھیانک اور وحشت ناک معلوم ہو رہا ہے ۔ ایسی اندھیری رات میں فردوسی تن تنہا باغ میں لیٹا ہوا ہے ۔ اس نے نیند کے انتظار میں آنکھیں بند کر لی ہیں ، کروٹیں بدل رہا ہے مگر نیند ہے کہ نہیں آتی پر نہیں آتی ۔ جب وحشت زیادہ غالب ہوئی ، گھبرا کر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی جو مکان میں سو رہی تھی ۔ بیوی بیدار ہو کر باغ میں آئی ۔ ہمارے شاعر نے اس سے چراغ لانے کی درخواست کی ۔ اس نے حیرت کے لہجے میں کہا تمھیں آج رات کیا ہوگیا ہے ، سو کیوں نہیں جاتے ۔ بھلا اس قدر رات گئے چراغ کا کیا ہوگا ۔ یہاں جواب یہی تھا کہ سو کیسے جاؤں ، نیند تو آتی نہیں ، اگر چراغ لے آؤ تو مہربانی ہوگی ۔ الغرض چراغ آیا اور اس کے ساتھ کچھ میوے اور جام بھی ۔ شراب اور موسیقی کے ساتھ دل بہلایا گیا ۔ اس کے بعد اس عورت نے

ہمارے شاعر سے کہا ، میں تمھیں دفتر پاستان سے ایک کہانی سناتی ہوں جو رزم و بزم اور فریب و محبت کے واقعات پر شامل اور سنجیدہ اور دانا لوگوں کے ذکر سے مملو ہے ، اس کے سننے سے تمھیں آسمان کی نیرنگ سازیوں پر تعجب ہوگا ۔ فردوسی نے بڑے اصرار سے کہا کہ اے ماہ رو آج کی رات تم یہ داستان مجھ کو ضرور سناؤ ۔ بیوی نے کہا ، میں یہ داستان تمھیں سناتی تو ہوں مگر تم کو چاہیے کہ سننے کے بعد اس کو نظم کا جامہ پہنا دو ۔ فردوسی نے جواب میں کہا کہ ہاں منظور ہے ۔ قصہ جس طرح تمھاری زبان سے سنوں گا ، نظم کر دوں گا ۔ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہوگا ۔ اے نیکی شناس مہربان جفت ، میں تمھارے اس خیال دلانے کا خدا کی جناب میں شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ فکر شعر میں مزے سے مجھ کو نیند بھی آ جائے گی[1] ۔

اس تمہید کے بعد یہ داستان سنائی جاتی ہے ۔ یہ خوش قسمت داستان جو فردوسی نے اپنی بیوی کی زبانی سنی ، داستان بیژن تھی ۔ داستان بیژن کے واقعات کی کڑیاں کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہیں کہ ان میں جنس لطیف کی تحسین و ستائش حاصل کر لینے کا کافی سامان موجود ہے ۔ میں یہاں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا اور اسی گزارش پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ داستان بیژن ہی تھی جو سب سے پہلے فردوسی نے اپنی اہلیہ کی فرمائش سے نظم کر دی تھی لیکن جب یہ داستان نظم ہو کر شائع ہوئی اور قدر دانانِ کمال نے اسے دیکھا اور پڑھا تو دوستوں اور مداحوں کے اصرار نے آسے آخر کار تمام شاہنامے کی نظم پر آمادہ کر دیا ۔

میرا یہ اعتقاد کہ داستان بیژن سب سے پہلی داستان ہے

---

۱ ۔ اوپر کا بیان میں نے داستان بیژن کی تمہید سے اخذ کیا ہے ۔ جو میکن کے شاہنامے میں صفحہ ۷۵۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۰۶ پر ختم ہوتی ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

جس پر فردوسی نے اپنا قلم اٹھایا ہے ، ان بعض داخلی اور خارجی دلائل کے زیر اثر ہے جن کو میں نے اپنے مضمون ''شاہنامے کی نظم کے اسباب اور زمانہ'' میں (جو جولائی ۱۹۲۱ع کے رسالہ اردو میں شائع ہوا ہے) مفصل بیان کیا ہے[1] ، یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے - ہمیں یہاں اس قدر جان لینا کافی ہوگا کہ فردوسی شاہنامے کی نظم کا مستقل ارادہ کر لینے سے پیشتر رزم نگاری کے میدان میں شہرت حاصل کر چکا تھا ، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کا ایک دوست جیسا کہ شاعر نے سبب تالیف میں بیان کیا ہے ، شاہنامے کی نظم کی تشویق و تحریص کی غرض سے کہتا ہے :

کشادہ زبان و جوانیت ہست
سخن گفتن پہلوانیت ہست

یعنی تم جوان ہو ، خوش گفتار ہو اور رزمیہ شعر کہنے کا خوب طریقہ رکھتے ہو - یہ شہرت ، ہم کہتے ہیں ، اس کو داستان بیژن کے طفیل حاصل ہوئی تھی -

علیٰ ہذا فردوسی کے بعض مغربی نقاد ، جن میں میکن خاص طور پر قابل ذکر ہے ، کہتے ہیں کہ فردوسی کے بیانات بسلسلۂ مدت نظم شاہنامہ زیادہ تر سرسری اور ناقابل اعتبار ہیں مثلاً کہیں یہ مدت تیس سال کہتا ہے اور کہیں پینتیس - معترضین کی نگاہ میں شاہنامے کے اشعار ذیل ہیں :

سی و پنج سال از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج
چو برباد دادند رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا

(صفحہ ۲۰۹۵ ، جلد چہارم)

---

۱ - یہ مضمون اسی جلد میں دوسری جگہ دیکھا جا سکتا ہے - (مرتب)

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی
(صفحہ ٦٥ ، جلد اول)

اعتراض اگرچہ بہ ظاہر معقول ہے مگر صحیح نہیں ، کیوں کہ فردوسی اس تیس سال میں جملہ مدت نظم شاہنامہ شامل کر رہا ہے لیکن جب وہ پینتیس سال کہتا ہے تو اس میں وہ داستان بیژن کا زمانہ بھی شامل کر لیتا ہے ۔ مختصر یہ ہے کہ شاہنامے کی نظم کے مستقل ارادے سے پانچ سال پیشتر وہ داستان بیژن لکھ چکا ہے ۔ یہ مان کر کہ شاہنامہ اس نے ۳۷۰ھ میں شروع کیا ، داستان بیژن کو اس سے پانچ سال قبل یعنی ۳٦٥ ھ کے گرد و پیش میں لکھا جانا چاہیے ۔

جب دوست و احباب کی تحسین و آفرین نے فردوسی کو آخرکار شاہنامے کی نظم کے لیے آمادہ کر دیا تو ذخیرہ فراہم کرنے کی نیت سے سب سے پہلے اسے بخارا ، جو ان ایام میں سامانیوں کا پایہ تخت تھا ، جانا پڑا ۔ یہاں اسے شاہنامے کے مکمل نسخے کے حاصل کرنے کی امید تھی :

دلِ روشنِ من چو برگشت ازوی
سوے تختِ شاہِ جہان کرد روی
کہ این نامہ را دست پیش آورم
ز دفتر بہ گفتار خویش آورم

اس تلاش میں وہ مرو ، بلخ اور ہرات کا بھی سفر اختیار کرتا ہے ۔ ہرات میں پیر خراسان ماخ سے ملتا ہے ۔ داستان ہرمز[1] فردوسی کو اسی سے ملتی ہے ۔ مرو میں احمد بن سہل کے یہاں آزاد سرو سے مل کر داستان شغاد[2] کے واقعات معلوم کیے ۔ بلخ

---

۱ ۔ صفحہ ۱۷۹۱ ، جلد چہارم ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ ۔ صفحہ ۱۲۲۹ ، جلد ثالث ۔ (حاشیۂ مصنف)

میں کسی موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات دریافت کیے :

چنین یاد دارم ز موبد بہ بلخ
بہ خسرو چو شد این جہان تار و تلخ[1]

الغرض جہاں جہاں گیا ، اپنی تلاش میں مصرف رہا اور جس جس سے ملا ، کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کی :

بہ پرسیدم از هر کسی بی شمار
بہ ترسیدم از گردش روزگار

وہ ایک ہنگامہ پرور زمانہ تھا ، چاروں طرف جنگ و خوں ریزی کی آگ بھڑکی ہوئی تھی اور مسافروں کو آمد و رفت میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی :

زمانہ سرای پر از جنگ بود
بہ جویندگان بر جہان تنگ بود

نوح بن منصور (۳۶۵ھ و ۳۸۷ ھ) کا زمانہ طاقت ور امرا کی بغاوت اور سرکشی کے لیے مشہور ہے جس میں سیمجوریوں کی مخالفت عرصے تک قائم رہی ۔

جب کوئی کام ہونے والا ہوتا ہے تو خدا غیب سے اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے ۔ فردوسی کو ایک قدر دان سر پرست کی ضرورت تھی جو اسے فکر معاش سے فارغ کر دے ۔ اتفاق حسنہ سے یہ مربی بھی اسے مل گیا ۔ فردوسی نے اس کا نام شاہنامے میں بیان نہیں کیا ہے اور صرف توصیفی جملے 'مہتر گردن فراز' کے الفاظ سے اسے یاد کرتا ہے ۔ یہ رئیس خواہ کوئی ہو مگر گمان ہوتا ہے کہ سیمجوریوں کے متوسلین سے تھا کیوں کہ ان ایام میں خراسان انھی کے قبضے میں تھا ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ فردوسی نے اس کا نام

---

۱ ۔ از مخطوطہ شاہنامہ ، نوشتہ ۷۵۲ ھ ۔ (حاشیہ مصنف)

جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام پر معنون کیا، شاہنامے سے دانستہ نکال دیا۔ قصہ مختصر کچھ ایسے اسباب و واقعات تھے جنھوں نے فردوسی کو بالآخر شاہنامے کی نظم کے لیے آمادہ کر دیا۔ یہ زمانہ ہمارے شاعر کے لیے بہت مبارک تھا اور مستقبل خوش آیند امیدوں سے معمور تھا۔ جب وہ اپنی عمر کے شصت سالہ مرحلے پر پہنچا ہے، اطمینان اور فارغ البالی اس سے کنارہ کر چکے ہیں، شاعر اپنے ماضی پر ایک نظر بازگشت ڈالتا اور اس زمانے کو خوش فال اور مبارک مانتا ہے، گویا شاہنامے کے آغاز کا زمانہ اس کی زندگی کا گل و گلزار تھا۔ اس وقت اس کی عمر اڑتالیس سال کی تھی، چناں چہ لکھتا ہے:

چل و هشت بد عهد نوشیروان

تو بر شصت رفتی نمانی جوان[1]

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامے کی داستانیں موجودہ ترتیب میں نظم نہیں کی ہیں بلکہ مختلف موقعوں پر متفرق داستانیں نظم کر کے بعد میں انھیں موجودہ یا تاریخی ترتیب میں منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح شاہنامے کی داستانیں تین دوروں میں منقسم کی جا سکتی ہیں۔

پہلا طوسی دور: اس سے مراد وہ بیس یا اٹھارہ سال کا زمانہ ہے جو فردوسی نے غزنی پہنچنے سے پیشتر طوس میں شاہنامے پر صرف کیا۔ اس مدت میں وہ موجودہ چار جلدوں سے تخمیناً ڈھائی یا پونے تین جلد کا ذخیرہ نظم کر چکا تھا۔

دوسرا غزنوی دور ہے جس میں وہ ایک جلد یا اس سے کچھ زیادہ نظم کر چکتا ہے۔ غزنی میں اس کا قیام کم از کم چھ سال تک رہتا ہے۔ اس کے بعد سلطان کی طرف سے مایوس ہو کر وہ غزنی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اب ایک آخری دور شروع ہوتا ہے جس میں

---

۱ ۔ خاتمہ، جلد ثالث۔ (حاشیہ مصنف)

فردوسی شاہنامے کا بقیہ حصہ نظم کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہے۔ اس دور میں اس کا سر پرست اور کفیل ، حسین بن قتیب یا حیبی قتیب ہے۔

طوس میں فردوسی نے جو بیس یا اٹھارہ سال کا زمانہ گزارا ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر حصہ فراغت اور اطمینان کے ساتھ بسر ہوا ہے اور جو داستانیں اس دور میں لکھی گئی ہیں ، زور اور جوش میں بے مثال ہیں مثلاً داستان زال ، داستان سہراب اور داستان بیژن ۔ غزنی کے قیام کا زمانہ اگرچہ دربار شاہی میں گزرا ہے ، سلطان کے شاعر کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں مگر اسے اطمینان نہیں ہے ۔ اس دور میں اسے بے حد محنت اور تن دہی سے کام لینا پڑا ہے ، اور وہ چوتھائی شاہنامے سے زیادہ نظم کر ڈالتا ہے ۔ داستان رستم و اسفند یار اس عہد کی شاعری کی بہترین مثال ہے ۔ طوسی اور غزنوی دور کے کلام کی شناخت کے لیے ہمارے پاس یہ معیار ہے کہ ایک میں سلطان محمود کی مدح موجود ہے اور ایک میں نہیں ہے ۔ اگرچہ بعض ایسی داستانیں بھی ہیں جن میں شاعر نے نظر ثانی کرتے وقت محمود کی مدح میں ایک آدھ بیت کا اضافہ کر دیا ہے ۔ اپنی عمر کے اٹھاونویں مرحلے تک شاعر طوس میں بیٹھا ہوا نہایت فراغت کے ساتھ اپنی نظم میں مصروف رہا ہے ۔ اس سال اس پر کئی انقلاب گزرتے ہیں جن میں ایک مالی نقصان کی شکل میں ہے :

ازان پس کہ بنمود پنجاہ و ہشت
بسر بر فراوان شگفتی گذشت[1]

اس کے بعد وہ کئی موقعوں پر اپنی تنگد ستی اور پریشان حالی کا شاکی نظر آتا ہے :

---

۱ - صفحہ ۳۷۸ ، جلد اول ۔ (حاشیہ مصنف)

بجای عنانم عصا داد سال
پراگنده شد مال و برگشت حال[1]

دو گوش و دو پای من آهو گرفت
تهیدستی و سال نیرو گرفت[2]

همی خورد باید کسی را که هست
منم تنگ دل تا شدم تنگ دست

ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر فردوسی کے پہلے سر پرست 'مہتر گردن فراز' نے بھی اسی سال وفات پائی ہو ۔ اس وقت شاہنامہ ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا ۔ فردوسی نے اس رئیس کا مرثیہ نہایت دردناک الفاظ میں لکھا ہے ۔

ان واقعات سے آٹھ یا دس سال بعد دو ایسے واقعے پیش آئے جن سے وہ اپنا وطن طوس چھوڑنے پر مجبور ہوا ۔ وہ اپنی عمر کا پینسٹھواں مرحلہ طے کر رہا تھا جب اس کے جوان جہان اکلوتے فرزند کی وفات کا واقعہ پیش آیا ۔ فردوسی نے اس کا ایک مختصر مگر دردناک مرثیہ شاہنامے میں لکھا ہے :

مگر بہرہ بر گیرم از بند خویش
بیاد آرم از مرگ فرزند خویش

یہ مختصر مرثیہ آج بھی ہمارے کلیجے پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے ۔ اس کے سادہ جذبات آج بھی ہم پر غم کی بجلیاں گراتے ہیں :

مرا شصت و پنج دو راسی و هفت
نہ پرسید ازین پیر و تنہا برفت
جوان بود همواره با من درشت
بر آشفت و یک باره بنمود پشت

۱ ۔ صفحہ ۳۸۶ ، جلد اول ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ ۔ صفحہ ۱۲۲۹ ، جلد سوم ۔ (حاشیۂ مصنف)

پھر فرزند کو خطاب کر کے کہتا ہے :

مگر همرهانِ جوان یافتی
که ناگه ز من روی بر تافتی

اس واقعے کے قریب ۳۸۸ھ میں غزنی میں امیر سبکتگین کی وفات اور اسماعیل کی مختصر حکومت ختم ہونے کے بعد جو صرف چند ماہ تک رہی ، دنیا کے اولوالعزم سلطان یمین الدولہ و امین الملۃ نظام الدین محمود غزنوی کا جشن تاج پوشی منایا جا چکا تھا ۔ فردوسی بھی غزنی میں پہنچ جاتا ہے ، اس کو کسی قدردان سرپرست کی ضرورت تھی ۔ ہمارا شاعر سلطان کی جنگی قابلیت ، اس کی دلاوری و دیگر جنگی اوصاف سے متاثر ہو کر غزنی کا رخ کرتا ہے ، ورنہ اس زمانے میں اور سلاطین بھی موجود تھے ۔ فردوسی اپنی اس خواہش کو ایک خواب کے رنگ میں پیش کرتا ہے کہ خواب میں وہ ایک دربار دیکھتا ہے جس میں ایک بلند اقبال تاج ور تخت پر جلوہ فرما ہے ۔ فردوسی حیرت سے دریافت کرتا ہے کہ یہ کس بادشاہ والا جاہ کا دربار ہے ۔ اسے جواب ملتا ہے کہ تم نہیں جانتے ، یہ دربار محمودی ہے :

چو کودک لب از شیر مادر بشست
به گهواره محمود گوید نخست

خواب بالکل ممکن ہے کہ صحیح ہو اور کوئی تعجب نہیں کہ اسی خواب کی بنا پر اس نے غزنی کا رخ کیا ہو ۔ فردوسی، اس میں شک نہیں کہ بے حد ذکی الحس تھا اور خوابوں کا بے حد معتقد ۔ وہ خواب کو دانش پیغمبری کا ایک جزو سمجھتا ہے :

نگر خواب را بیهده نشمری
یکی بهره دانش ز پیغمبری

وہ کہتا ہے کہ حساس طبائع آیندہ واقعات کا عکس خواب میں دیکھ سکتی ہیں :

روان ھای بیدار بند بہخواب
ھمہ بودلیہا چو آتش بر آب

غزنی پہنچ کر وہ ابوالعباس فضل بن احمد وزیر اول سلطان کی معرفت یا امیر المظفرنصربن سبکتگین کے ذریعے سے سلطان کی خدمت میں رسائی حاصل کرتا ہے اور ۳۸۸ھ سے ۳۹۴ھ کے اختتام تک یا اپنی عمر کے پینسٹھویں سال سے اکہترویں سال کے اختتام تک مستقلاً غزنی میں رہتا ہے اور شاہنامے پر دن رات مصروف ہے :

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج
فزون کردم اندیشہ و درد و رنج

اس چھ سال کی مدت میں اس نے باقی شاہنامہ تقریباً ختم کردیا ہے ۔ سلطان محمود کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے ہیں ۔ دربار میں اس کی آمد و رفت ہے ۔ بعض داستانیں وہ سلطان کی خدمت میں سناتا ہے ۔ داستان ہفت خوان اسفندیار اس نے غالباً دربار میں سنائی ہے :

اگر شاہ پیروز بپسندد این
نہادیم بر چرخ گردندہ زین

داستان بابک کی تمہید میں بھی ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ داستانیں محمود کو سناتا رہا ہے :

ز ساسان و بابک چہ داری خبر
بخوان پین بشہ بر ھمہ سر بہ سر

ایک عجیب امر یہ ہے کہ وہ اکثر اولوالعزم سلاطین مثلاً کیخسرو ، سکندر اعظم اور نوشیروان عادل کی داستانیں خاص طور پر محمود کو خطاب کر کے لکھ رہا ہے ۔ شاعر اپنی دیرینہ عمری سے فائدہ اٹھا کر کئی موقعوں پر سلطان کو نصیحت و پند بھی کرتا ہے :

اگر دادگر باشی ای شهر یار
بگیتی بمانی یکی یادگار
که جاوید هر کس کند آفرین
بدان شاه کاباد دارد زمین[1]

اس کے علاوہ اور موقعے ہیں جہاں وہ سلطان کو نصیحت کرتا نظر آتا ہے :

ز دانا سخن بشنو ای شهر یار
جهان را بدینگونه آباد دار[2]

اس مدت میں جو بعض اہم واقعات محمودی تاریخ میں پیش آتے ہیں ، فردوسی اُن کی طرف بھی ایما کرتا ہے ۔ مثلاً تخت نشینی کے بعد سلطان نے ایک سالہ خراج کی معافی کا اعلان کیا ہے ۔ فردوسی اس کا ذکر کر رہا ہے :

که سالی خراجی نخواهد ز پیش
ز دیندار بیدار و از مرد کیش

خلیفۂ بغداد القادر باللہ سلطان کو یمین‌الدولہ و امین‌الملۃ کا خطاب بھیجتا ہے ۔ فردوسی کے ہاں اس کی طرف بھی ایک اشارہ ہے :

یمین دول شاه محمود باد
همه کار . . . .

جب محمود کے حملاتِ ہند شروع ہوجاتے ہیں ، وہ ان کی طرف بھی ایما کرتا ہے :

جهان بستد از مردم بت پرست
بدیبای دین بر دل آذین به بست

ایک اور موقع پر لکھا ہے :

---

۱ ۔ صفحہ ۱۲٦۳ ، جلد سوم ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ ۔ داستان خردمندی اردشیر ۔ (حاشیۂ مصنف)

جہان بستد از بت پرستان ہند
بتیغی کہ دارد چو وحشی پرند

شاہنامے میں آخری تلمیح سیستان میں کانِ طلا کے انکشاف کے متعلق ہے ۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ سنہ ۳۹۴ھ میں سیستان میں زلزلہ آنے کے بعد سونے کی کان دریافت ہوئی جو ایک اوندھے درخت کی مانند تھی اور جس قدر اسے زیادہ کھودتے تھے ، زیادہ پھیلتی جاتی تھی ۔ تاریخ میں اس کان طلا کا ذکر آتا ہے ۔ قاضی احمد غفاری نگارستان میں اور فرشتہ اپنی تالیف میں اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ فردوسی اس واقعے کو سلطانی اقبال و فر کی دلیل مانتا ہے ۔ چناں چہ :

ز خاور بیاراست تا باختر
پدید آمد از فر او کان زر[1]

سلطان کے علاوہ غزنی میں سلطان کے وزیر فضل بن احمد اور سلطان کے بھائی امیر نصر سے بھی فردوسی کے خوش گوار تعلقات

---

۱ ۔ مگر دیوان فرخی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کان زر کوہ زر رویان میں تھی جو غزنی کے قریب تھا ۔ چناں چہ :

بگنجت اندر نقصان کجا پدید آید
کہ باشد او را ہمسایہ کوہ زر رویان
(فرخی ، صفحہ ۲۵۳ ، طبع طہران)

دیگر :

بدہ چندان کہ در دہ سال ازان کشور خراج آید
بیک ھفتہ بر آید مر ترا از کوہ زر رویان
(ایضاً ، صفحہ ۲۵۹)

دیگر :

اگر نیستی کوہ غزنین توانگر
بدین سیم روینده و زر کانی
(ایضاً ، صفحہ ۳۵۹) (حاشیۂ مصنف)

تھے - شاہنامے میں دونوں کا ذکر ایک سے زیادہ موقعوں پر آتا ہے - دستور شاہ کا فردوسی ایک موقع پر شکریہ بھی ادا کرتا ہے :

ز دستور فرزانۂ دادگر
پراگندہ رنج من آمد بسر

فردوسی کی عمر کے اکہترویں سال میں شاہنامہ تقریباً ختم ہوجاتا ہے جسے سال ہجری ۳۹۴ سمجھنا چاہیے - اس وقت بعض وجوہ کی بنا پر جن کی اصلیت سے ہم ناواقف ہیں ، سلطان ہمارے شاعر کے ساتھ بے التفاتی کا سلوک روا رکھتا ہے اور اُس انعام و اکرام سے ، جس کی شاہنامے کے اختتام پر سلطان سے اُس کو امید تھی ، محروم رکھا جاتا ہے - ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کن اسباب کے ماتحت سلطان اس سے ناراض ہوا - اور کوئی تعجب نہیں اگر خود ہمارا شاعر بھی اس کے حقیقی باعث سے بے خبر ہو - مشرقی درباروں میں ایک شخص کی کامیابی اور ناکامی کچھ اس قدر اس کے اپنے استحقاق کی بنا پر نہیں ہوتی جس قدر کہ اس کے حامی کی حمایت اور دسترس پر منحصر ہے - یہ بہت ممکن ہے کہ ایک مستحق شخص اپنے مقصد میں محروم رہے اور ایک غیرمستحق شخص محض اپنے حمایتی کی بنا پر کامیاب ہو - سلطان کے ہاں فردوسی کی کامیابی اس کے اپنے حامی کے اثر کی بنا پر ہو سکتی تھی - بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ فردوسی کو سلطان کے دربار سے بے نیل مرام جانا پڑا - ہم ان بیانات سے قطع نظر کر کے جو فردوسی کے تذکرہ نگاروں نے دیے ہیں ، کہہ سکتے ہیں کہ پیاسا کنوئیں سے اور قطرہ دریا سے محروم گیا - داستان شیریں و خسرو کی ابتدا میں فردوسی اپنی ناکامی کا ایک نہایت تعجب اور حیرت کے لہجے میں ذکر کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ یہ کتاب ، جس میں ساٹھ ہزار اشعار ہیں ، حالاں کہ ابھی تک فارسی میں تین ہزار شعر سے زیادہ تعداد کی بھی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے ، اس تالیف سے میرے منتقدین کمزور اور خراب اشعار کی زیادہ سے زیادہ تعداد

پانچ سو نکال سکتے ہیں ۔ اب ایسا سلطان ، جو دنیا کے سلاطین میں ممتاز ہے اور فیاضی میں مشہور ، میں تعجب سے دیکھتا ہوں کہ اس نے میری کتاب کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جو سرا سر میری کوتاہ نصیبی اور میرے دشمن کی بدگوئی کی بنا پر ہے ۔ دشمن نے میرے معاملات میں در اندازی کی اور بادشاہ کے سامنے میری عزت و حرمت بالکل تباہ ہو گئی :

بود بیت شش بار بیور ہزار
سخنہای شایستہٴ غم گسار

نہ بیند کسی نامہٴ پارسی
نبشتہ بابیات صد بار سی

وگر باز جویند ازو بیت بد
ہمانا کہ باشد کم از پنج صد

چنین شہریاری و بخشندہ ای
بہ گیتی ز شاہان درخشندہ ای

نکرد اندرین داستانہا نگاہ
ز بدگوی و بخت بد آمد گناہ

در افتاد بدگوی در کار من
تبہ شد بر شاہ بازار من

یہ اشعار اس وقت لکھے گئے ہوں گے جب شاہنامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے اور شاعر کو اپنے ابیات کا اندازہ ہو گیا ہے ۔

آئندہ فردوسی نے کیا طرز عمل اختیار کیا ۔ اگر ہم اس کے تذکرہ نگاروں پر یقین کریں تو ماننا ہوگا کہ وہ سلطان کی ہجو لکھ کر غزنی سے غائب ہو گیا ، طبرستان گیا ، مازندران گیا اور بغداد پہنچا وغیرہ وغیرہ ، لیکن شاہنامہ ایسے بیانات کی مطلق تائید نہیں کرتا ۔ شاہنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نہ بغداد گیا اور نہ طبرستان ، بلکہ اس نے وہ طریقہ اختیار کیا جو اس

صورت حالات کے مناسب تھا ۔ سلطان سے جب وہ آخر کار مایوس ہو گیا تو اپنی مقصد برآری کے لیے امیر نصر بن ناصرالدین کی خدمت میں پہنچا ۔ امیر نصر ان ایام میں امیر الجیوش خراسان تھے ۔ فردوسی بہر حال ان کی خدمت میں پہنچتا ہے اور اشعارِ بالا سنا کر عرض پرداز ہے :

چو سالار شه آن سخنهای نغز
بخواند به بیند بپاکیزه مغز

ز گنجش من ایدر بوم شادمان
کزو دور بادا بد بد گمان

و زان پس کند یاد بر شهریار
مگر تخم رنج من آید ببار

که جاوید باد افسر و تخت اوی
ز خورشید تابنده تر بخت اوی

جب آپ اس کلام کو پڑھیں گے ، میں امید کرتا ہوں کہ قدردانی کریں گے اور میں آپ کی فیاضی سے بے نیل مرام نہیں جاؤں گا ، نیز یہ کہ سلطان کی خدمت میں بھی عرض کریں تاکہ مجھ کو میری محنت کی داد مل سکے اور میں کامیاب ہو جاؤں ۔

شاہنامہ چوں کہ اس وقت تک ختم ہو چکا ہے ، اس لیے بعد کے واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا اور ہمیں معلوم نہیں کہ امیر نصر کے دربار سے اس کی مساعی کا کیا حشر ہوا ، آیا کامیاب ہوا یا بدستور محروم رہا ۔ ہمیں معلوم نہیں لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود سے وہ مایوس ہی رہا ۔ فردوسی کی محرومی اور اس کے مایوسانہ جذبات کا یہ قطعہ شاہد ہے :

حکیم گفت کسی را که بخت والا نیست
بهیچ وجه مر او را زمانه جویا نیست

برو مجاور دریا نشین مگر روزی
بدستت افتد درّی کجاش همتا نیست

خجسته درگه محمود زابلی دریاست
کدام دریا کان را کرانه پیدا نیست

شدم بدریا، غوطه زدم، ندیدم در
گناه بخت من است این گناه دریا نیست

یہ قطعہ اگرچہ فردوسی کی مایوسی اور محرومی کا افسانہ خواں ہے لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کے قائل کے دل میں کوئی انتقامی جذبہ پیدا ہوا ہے یا وہ ہجو کہہ کر بادشاہ وقت سے انتقام لینا چاہتا ہے۔

اس واقعے کے کئی سال بعد ۴۰۰ھ میں جب وہ شاہنامے کا خاتمہ لکھتا ہے اور سلطان کی طرف سے بالکل مایوس ہے، وہ حسب معمول اپنے بادشاہ کے حق میں ہاتھ اٹھا کر یہی دعا دیتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے:

تنِ شاہ محمود آباد باد
همیشه بکام دلش شاد باد
چنانش ستودم که اندر جهان
سخن ماند از و آشکار و نهان
همش رای و هم دانش و هم نسب
چراغ عجم آفتاب عرب [۱]

یہاں موقع آ گیا ہے کہ چند سطور ہجو کے سلسلے میں بھی لکھی جائیں۔ ہجو کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ فردوسی نے لکھی یا نہیں۔ دیباچۂ قدیم کے بیان کی رو سے ہجو کی تعداد دو

۱۔ یہ شعر مطبوعہ شاہناموں میں نہیں ملتا۔ میں نے ایک قلمی مخطوطے سے، جس کی تاریخ ۷۵۲ھ ہے، نقل کیا ہے۔ (حاشیۂ مصنف)

تین شعر سے زیادہ نہ تھی - نظامی کہتا ہے کہ فردوسی نے پورے سو شعر لکھے تھے مگر شہریار والیِ طبرستان کی درخواست پر شاعر نے اسے شاہنامے سے محو کر دیا اور صرف چھ شعر باقی رہ گئے جو زبان زد ہو گئے[1] -

---

۱ - ہجو فردوسی نے لکھی یا نہ لکھی ، اس سوال کو چھوڑ کر ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ وہ ہجو لکھنے کا حق بھی رکھتا ہے یا نہیں - جو لوگ اس امر کے مدعی ہیں کہ فردوسی نے ہجو لکھی ، ان کا گمان یہ ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کے حکم سے فردوسی نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن ہمیں شاہنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامے کے سلسلے میں سلطان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا ، بلکہ شاعر نے محمود کی تخت نشینی کے بیس سال پہلے سے لکھنا شروع کیا تھا :

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست
همی گفتم این نامہ را چند گاه
نهان بود از چشم خورشید و ماه
چو تاج سخن نام محمود گشت
ستائش بآفاق موجود گشت

شاہنامہ اگرچہ اس نے محض بقائے عام کے لیے شروع کیا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنی قدر افزائی بھی چاہتا تھا - جب ۳۸۸ھ میں محمود تخت نشین ہوتا ہے، شاعر قدردانی کی امید میں غزنی کا رخ کرتا ہے اور اسے امید بندھتی ہے کہ میری محنت کا صلہ مل جائے گا لیکن آخر میں اسے مایوسی سے ہم‌دوش ہونا پڑا اور کوئی صلہ نہ ملا - فردوسی بے شک سلطان کے ہاں امید لگا کر آیا تھا مگر سلطان پر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا تھا ، اگرچہ اخلاقاً سلطان پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے - بہر حال اس صورت حالات میں فردوسی سلطان کی ہجو لکھنے میں حق بہ جانب نہیں مانا جا سکتا - بے شک اس کو محروم ہونا پڑا ، اس کی ساری عمر کی محنت برباد ہوئی ، دل شکنی ہوئی مگر محمود کی ہجو لکھنے کا اس کو پھر بھی حق نہیں تھا اور نہ وہ ایسا کر سکتا تھا - (حاشیہ مصنف)

موجودہ ہجو کی تعداد جو شاہنامے کے ساتھ شائع ہو رہی ہے، ایک سو اشعار سے اوپر ہے ۔ میں نے اس مسئلے پر ایک علیحدہ مضمون[1] میں (جو اکتوبر ۱۹۲۱ع کے رسالہ اردو میں شائع ہوا ہے) تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے ۔ یہاں میں اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہجو یقیناً فردوسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ۔ وہ ایک مجعول دستاویز ہے جس کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ ذخیرہ شاہنامے سے سرقہ کیا گیا ہے اور ہجو نگار نے اپنے مطلب کے اشعار شاہنامے سے لے کر ربط و تسلسل کی غرض سے بعض جدید اشعار اس میں اضافہ کر کے اس کی موجودہ شکل میں مرتب کر دیا ہے، وہ شاہنامے کے ہر نسخے کے ساتھ شائع ہو رہی ہے ۔ متأخرین نے کہیں اس کی مصنوعی ہستی کا احتمال تک نہیں کیا اور آج یہ جعلی نمونہ اسی قدر فردوسی کا اصلی کلام مانا جاتا ہے ، جس قدر اور فردوسی کا صحیح کلام ۔ درحقیقت اشاعت نسخہ بایسنغری کے مرتبین ہجو کو ایک سو اشعار کی حد تک پہنچانے کے ذمہ‌دار ہیں ورنہ ایسی اشاعتوں میں ، جن میں دیباچہ قدیم موجود ہے ، ان اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور شاہنامے کا نسخہ جس قدر زیادہ قدیم ہوگا ، اسی قدر ہجویہ اشعار کی تعداد اس میں کم پائی جائے گی ۔

ہجو کے مرتبین نے اپنے مطلب کے بعض اشعار شاہنامے کے مختلف مقامات سے لیے ہیں اور تسلسل کی غرض سے اور اشعار اضافہ کر کے اس کو موجودہ شکل میں پہنچا دیا ہے ۔

بایسنغری نسخے کے علاوہ ایک اور ہجو چل رہی ہے جو اپنی تعمیر میں بایسنغری ہجو سے بھی متأخر ہے ۔

بایسنغری ہجو سے پایا جاتا ہے کہ سلطان نے شاعر پر محبتِ رسولؐ اور محبت علیؓ کی بنا پر بے دینی کا الزام لگایا :

---

۱ ۔ یہ مضمون بھی زیر نظر جلد میں شامل ہے (مرتب)

مرا غمز کردند کان پر سخن
بمہر نبیؐ و علیؓ شد کہن
ہر آنکس کہ در دلش بغض علیؓ است
ازو در جہان خوار تر گو کہ کیست

ہجو بایسنغری میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جب بادشاہ تخت نشین ہوا تو مجھ سے شاہنامے کی نظم کی فرمائش کی اور صلہ فی بیت ایک دینار قرار پایا ۔ جب میں نے پینتیس سال لگا تار کام کرکے چھیاسٹھ ہزار ابیات پر کتاب کو ختم کیا اور انعام کا وقت آیا ، اس نے مجھ کو بالکل محروم التفات رکھا ۔ اس ہجو کی ابتدا ہے :

الا ای خردمند صاحب خبر
بہ گفتار و کردار من در نگر
مبانجی میان من و شاہ باش
بحق خدا کز حق آگاہ باش

اب ہم ہجو بایسنغری کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہاں بعض ایسے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں جن کو ہجو نگار نے شاہنامے سے لیا ہے :

چہ گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیّم در است
درست این سخن قول پیغمبرؐ است
گواہی دہم کین سخن راز اوست
تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست

(ہجو بایسنغری صفحہ ۶۳)

چہ گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیّم در است
درست این سخن قول پیغمبر است

گواهی دهم کاین سخن راز اوست
تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
(شاهنامه صفحه ۵ ، دیباچه)

چو باشد ترا عقل و تدبیر و رای
بنزد نبی ص و علی رض گیر جای
گرت زین بد آید گناه من است
چنین است و این رسم و راه من است
(هجو بایسنغری صفحه ۶۱)

اگر چشم داری بدیگر سرای
بنزد نبی ص و وصی گیر جای
گرت زین بد آید گناه منست
چنین است آئین و راه منست
(شاهنامه صفحه ۶)

منم بندهٔ اهلِ بیت نبی ص
ستایندهٔ خاک پای وصی
(هجو بایسنغری صفحه ۶۳)

منم بندهٔ اهل بیت نبی ص
سر افگنده بر خاکپای وصی
(شاهنامه صفحه ۲۸۶ ، جلد ۳)

نکردی درین نامهٔ منِ نگاه
بگفتار بدگوی گشتی ز راه
(هجو بایسنغری صفحه ۶۴)

نکرد اندرین داستانها نگاه
ز بد گوی و بخت بد آمد گناه
(شاهنامه صفحه ۱۹۹۸ ، جلد ۴)

من این نامهٔ شهریاران پیش
بگفتم بدین نغز گفتار خویش
(هجو بایسنغری صفحه ۶۳)

که این نامهٔ شهریاران پیش
به پیوندم از خوب گفتار خویش
(شاهنامه صفحه ۱۰۶۳ ، جلد ۲)

چو عمرم بنزدیک هشتاد شد
امیدم بیکباره برباد شد
بسی سال اندر سرای سپنج
چنین رنج برده بامید گنج
(هجو بایسنغری صفحه ۶۳)

کنون عمر نزدیک هشتاد شد
امیدم بیکباره برباد شد
سی و پنج سال از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج
(شاهنامه صفحه ۲۰۹۵ ، جلد ۳)

چنین نامداران و گردن کشان
که دادم یکایک از ایشان نشان
همه مرده از روزگار دراز
شد از گفت من نامشان زنده باز
چو عیسلی من این مردگان را تمام
سراسر همه زنده کردم بنام
(هجو بایسنغری صفحه ۶۵)

همه پهلوانان و گردن کشان
که دادم درین قصه زیشان نشان

همه مرده از روزگار دراز
شد از گفت من نام شان زنده باد
منم عیسی آن مردگان را کنون
روان شان بمینو شده رهنمون
(شاهنامه صفحه ۱۱۲۷، جلد ۳)

یکی بندگی کردم ای شهریار
که ماند ز تو در جهان یادگار
بناهای آباد گردد خراب
ز باران و از تابش آفتاب
پی افگندم از نظم کاخ بلند
که از باد و باران نیابد گزند
(هجو بایسنغری صفحه ۶۵)

یکی بندگی کردم ای شهریار
که ماند زمن در جهان یادگار
بناهای آباد گردد خراب
ز باران و از تابش آفتاب
پی افگندم از نظم کاخی بلند
که از باد و باران نیابد گزند
(شاهنامه صفحه ۹۰۳، جلد ۳)

پشیزی به از شهریار چنین
که نه کیش دارد نه آئین و دین
(هجو بایسنغری صفحه ۶۶)

پلنگی به از شهریار چنین
که نه شرم دارد نه آئین و دین
(شاهنامه صفحه ۱۶۲۳، جلد ۳)

چو گودرز و هشتاد پور گزین
سواران میدان و شیران کین
جو جاماسپ کاندر شمار سپهر
فروزنده تر بد ز تابنده مهر
(هجو بایسنغری صفحہ ۶۴)

چو گودرز و هفتاد پور گزین
سواران میدان و شیران کین
جو جاماسپ کاندر شمار سپهر
فروزنده تر بد ز ناهید و مهر
(شاهنامہ صفحہ ۲۰۳۸ ، جلد ۴)

بنالم بدرگاه یزدان پاک
فشانده بر سر پراگنده خاک
(هجو بایسنغری صفحہ ٦٦)

بنالم ز تو پیش یزدان پاک
خروشان بسر بر پراگنده خاک
(شاهنامہ صفحہ ۱۳٦۱ ، جلد ۳)

پرستار زاده نیاید بکار
اگر چند دارد پدر شهریار
(هجو بایسنغری صفحہ ٦٦)

پرستار زاده نیاید بکار
اگر چند باشد پدر شهر یار
(شاهنامہ صفحہ ۱۷۰۱ ، جلد ۳)

ہجو کی روایت اگرچہ قدیم ہے ، دیباچہ ٔقدیم اور نظامی عروضی کے علاوہ مختاری شاعر اپنی تالیف 'شہریار نامہ' میں بعض ایسے شعر لا رہا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فردوسی نے ہجو لکھی ہے - وہ کہتا ہے :

وگر هدیہ ندھی ایا شہریار
نرنجم کہ ہستی خداوندگار
زبان من از ہجو کوتاہ باد
ہمیشہ ثناگوی این شاہ باد

اگرچہ فردوسی کا نام نہیں لیا گیا ہے مگر ان اشعار سے ظاہر ہے کہ فردوسی ہی کی طرف ایما ہے ۔ نظامی 'سکندر نامہ' میں فردوسی کی محرومی کے معتقد ہیں ، اگرچہ ہجو کا ذکر نہیں کرتے :

ستانی باین طاس طوسی نواز
حق شاہنامہ ز محمود باز
دو وارث شمار از دوکان کہن
ترا در سخا و مرا در سخن
بوامی کہ نادادہ باشد نخست
حق وارث از وارث آید درست

لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ سلجوقیوں کے زمانے میں فردوسی کی محرومی اور ہجو ہر عام طور پر یقین کیا جاتا ہے ۔ شیخ فریدالدین عطار اگرچہ صوفی ہیں لیکن وہ قدیم تاریخ و سیر سے بخوبی واقف ہیں ۔ وہ پہلے شخص ہیں جو فردوسی کے جنازے پر شیخ ابوالحسن خرقانی کے نماز ادا نہ کرنے ، فردوسی کے شیخ کے خواب میں آنے اور اپنی مغفرت بیان کرنے کے قصے کے راوی ہیں ۔ اس کے علاوہ 'الٰہی‌نامہ' میں وہ فردوسی کی بلند ہمتی کے ذکر میں کہتے ہیں کہ سلطان نے شاہنامے کے صلے میں پیل بار انعام بخشی کی لیکن شاعر نے اپنی سیر چشمی کی بنا پر اس پیل بار انعام کو فقاع خریدنے کے قابل بھی نہ سمجھا :

اگر محمود اخبار عجم را
بداد آن فیل و لشکر وان درم را

اگر تو شعر آری فیل واری
نیابی یک درم در روزگاری
چہ آن گر فیل دارش کم نہ ارزید
بر شاعر فقاعی ہم نہ ارزید
زہی ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ
کنون بنگر کہ چون برگشت از راہ[1]

چوں کہ قدیم روایات میں فردوسی پر بد مذہبی کا الزام لگایا گیا ہے اور سلطانی دربار میں اس کے مذہب کو اس کی محرومی کا باعث بیان کیا گیا ہے ، اس لیے ضروری ہوا کہ یہاں چند الفاظ اس کے مذہب کے متعلق بھی بیان کیے جائیں ۔ اگر شاہنامے پر اعتبار کیا جائے تو اس میں متضاد شہادت ملتی ہے ، جس کی رو سے فردوسی شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سنی بھی ۔ ایک بات یقینی ہے کہ جہاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی ، فلسفی ، دہریہ ، ملحد ، کافر اور معتزلی کہا ہے ، وہاں اس کو رافضی بھی بیان کیا ہے ۔ اب دشمنوں کے بیانات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن ہم یہاں قدیم روایات کا جائزہ لیتے ہیں ۔

دیباچۂ قدیم میں مذکور ہے :

”اما بر سر شاہنامہ شرط ادب نگاہ نداشتہ بود و سخن در مذہب خود گفتہ :

گرت زین بد آید گناہ منست
چنین است و این رسم و راہ منست“[2]

نظامی عروضی کی روایت کی رو سے اس پر اعتزال اور رفض کی تہمت لگائی گئی ہے :

---

۱ ۔ کلیات عطار ، الٰہی نامہ ، صفحہ ۹۳۴ ، نول کشور ۔
۲ ۔ دیباچۂ قدیم شاہنامہ ۔

"که او مردی رافضی است و معتزلی مذهب ، و این بیت بر اعتزال او دلیل کند که او گفت :

به بینندگان آفریننده را
نه بینی مرنجان دو بیننده را

و بر رفض او این بیتها دلیل است که او گفت :

خرد مند گیتی چو دریا نهاد
بر انگیخته موج ازو تند باد

چو هفتاد کشتی درو ساخته
همه بادبان ها بر افراخته

میانه یکی خوب کشتی عروس
بر آراسته هم چو چشم خروس

پیمبر بدون اندرون با علیؓ
همه اهلبیت نبیؐ و وصی

اگر خلد خواهی بدیگر سرای
بنزدِ نبیؐ و وصی گیر جای

گرت زین بد آید گناه منست
چنین دان و این راه راه منست

برین زادم و هم برین بگذرم
یقین دان که خاک پی حیدرم

(چهار مقاله ، طبع یورپ ، صفحه ۴۹)

شاہنامے کے دیباچے میں خلفائے راشدین کا نام بہ نام ذکر کرنے کے فوراً بعد ، جیسا کہ اہلِ تسنن کا دستور ہے ، شیعی عقیدے کے یہ شعر ملتے ہیں جو نظامی کے ہاں اوپر نقل ہوئے ہیں ۔ ان میں ابیاتِ ذیل قابل غور ہیں :

اگر چشم داری بدیگر سرای
بنزد نبیؐ و وصی گیر جای

گرت زین بد آید گناه منست
چنین است این رسم و راه منست

دلت گر براه خطا مایل است
ترا دشمن اندر جهان خود دلست

نباشد جز از بی پدر دشمنش
که یزدان بآتش بسوزد تنش

اب میں فردوسی کے اعتزال کو لیتا ہوں ۔ شاہنامے کے دیباچے میں فردوسی نے حمد باری میں جو اشعار لکھے ہیں ، ان میں وہ شعر بھی آتا ہے جس سے فردوسی کے اعتزال کا استدلال کیا گیا ہے ۔ علاوہ اور تفریقی مسائل کے جو اشاعرہ اور معتزلہ میں بحث و جدال کا مورث بنے ہیں ، ایک مسئلۂ رویت باری ہے ۔ اشاعرہ کا اعتقاد ہے کہ قیامت کے روز خدا کا دیدار بلا کیف ہوگا ۔ وہ اپنے مذہب کی سند میں یہ آیت پیش کرتے ہیں : و جوہ یومئذ ناضرة الٰی ربھا ناظر ۔ لیکن معتزلہ ، جو رویت کے قائل نہیں ہیں ، اس آیۂ شریفہ سے متمسک ہوتے ہیں : لا تدرکہ الابصار و ھو یدرک الابصار و ھو اللطیف الخبیر ۔ اس آیت کی دلیل پر یہ معتزلی عقیدہ کہ دنیا و عقبیٰ میں خدا کا دیدار نا ممکن ہے ۔ فردوسی نے شاہنامے میں حمد باری کے موقع پر ایک شعر لکھا ہے :

بہ بینندگان آفریننده را
نہ بینی مرنجان دو بیننده را

یہ شعر فردوسی کے معترضین نے اس کے اعتزال کے ثبوت میں پیش کیا ہے ۔ شعر کے معنی یہ ہیں کہ ذات باری کا مشاہدہ باصرہ کے ذریعے سے ممکن نہیں ، اس لیے اپنی آنکھوں کو اس کے دیدار کی جستجو میں زحمت نہ دے ۔

کسی مسلسل نظم سے ایک شعر لے کر اس کو خاص معنی پہنا دینا اور اس بنا پر شاعر پر اعتراض کرنا میرے نزدیک صریح

بے انصافی ہے ۔ بھلا اس شعر سے کون معقول پسند انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ فردوسی رویت باری کا منکر ہے ۔ شاعر کا صحیح مفہوم دریافت کرنے کے لیے ہمیں اس شعر کو فردوسی کے اور اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے تا کہ تسلسل قائم رہے ، یعنی اس طرح :

خرد گر سخن بر گزیند همی
همان را گزیند که بیند همی
به بینندگان آفریننده را
نه بینی مرنجان دو بیننده را
نیابد بدو نیز اندیشه راه
که او برتر از نام و از جایگاه[1]

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ذات باری کے ادراک سے قاصر ہیں ۔ ہمارا تعقل انھیں اشیاء کے وجود کا قائل ہو سکتا ہے جو حواس کی معرفت اس تک پہنچیں مگر ذات باری کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہوسکتا ۔ حواس ایک طرف ، خدا کی ذات تو ہمارے تخیل کے تصرفات سے بھی بالا ہے ۔

نظامی گنجوی ، جو اہل تسنن سے ہیں ، فردوسی کی تقلید میں قریب قریب یہی خیال ادا کر رہے ہیں :

بآن چیز ها یابد اندیشه راه
که باشد برو دیده را دست گاه

---

۱ ۔ میکن کے یہاں ان اشعار کی ترتیب ۱ ، ۲ ، ۵ ، ۶ ہے لیکن تسلسل کا تقاضا ہے کہ وہ اسی ترتیب میں پڑھے جائیں ، جس میں میں نے اوپر لکھے ہیں ۔ حمد کے میدان میں فردوسی کے لیے یہ خیال کرنا کہ فرقہ وارانہ عقیدے کا اظہار کر رہا ہے ، میرے نزدیک دور از کار امر ہے ۔ (حاشیہ مصنف)

خدا را نشاید باندیشہ جست
کہ درتست ہر چہ آن ز اندیشہ رست
(سکندر نامہ بحری)

اب فردوسی ایک شعر کی بنا پر جس کا تسلسل توڑ دیا گیا ہے ، معتزلی کیوں کر مانا جا سکتا ہے ؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے ہاں یہ ایک مقبول خیال رہا ہے ۔ شاہنامے میں ایک اور موقع پر شاعر فلسفیوں کی تردید اور بطلان میں قریب یہی خیال ادا کرتا ہے :

ایا فلسفہ‌دان بسیار گوی
نپویم براھی کہ گویی بپوی
ترا ہر چہ بر چشم بر بگذرد
بگنجد ھمی در دلت با خرد
چنان دان کہ یزادن نیکی دھش
جز آنست و زین بر مگر دان منش

شاہنامے میں ایسے ابیات موجود ہیں جن کی رو سے فردوسی کو شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سنی بھی ۔ دیباچے کے علاوہ شاہنامے میں دو اور مقام ایسے ہیں جہاں شیعہ رنگ کے اشعار ملتے ہیں مثلاً خاتمۂ داستانِ سیاوُش کے دو شعر اور داستان نوشزاد کے خاتمے کے دو شعر ۔ اسی طرح سنی رنگ کے اشعار دیباچے کے علاوہ صفحہ ۳۴۴ جلد اول ، ساختن سیاوُش کنگ دژ ، دو شعر جلد سوم ، خاتمۂ داستانِ اردشیر بابکان ، دو شعر ۔ جلد سوم ، خاتمۂ داستانِ سکندر ، ایک شعر ۔ جلد چہارم ، داستانِ یزد جرد کے آغاز میں حضرت عمرؓ کے ذکر میں ، دو شعر ۔ یہ وہ مواد ہے جس کی رو سے فردوسی کو شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سنی بھی ۔ لیکن شاہنامے میں یہ متضاد عنصر کس طرح داخل ہو گیا ، ہماری فہم سے بالا ہے ۔ فردوسی یا شیعہ ہوگا یا سنی ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ سنی بھی ہو اور شیعہ

بھی ہو ۔ اس عقدے کا حل یوں ممکن ہے کہ دونوں فرقوں نے بڑے شاعر کو اپنے اپنے مذہب کا رکن بنانے کی کوشش کی ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مذہبوں کے اشعار شاہنامے میں داخل ہو گئے ۔

قاضی نوراللہ شوستری کا خیال ہے کہ فردوسی نے تقیہ کر کے سنی رنگ کے اشعار بخوفِ سلطان محمود داخل کر دیے ہیں لیکن اگر واقعہ ایسا ہوتا تو شاہنامے میں صرف سنی رنگ کے اشعار پائے جاتے کیوں کہ تقیہ کی صورت میں فردوسی اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا ۔ فردوسی اس پائے کا شخص ہے کہ اپنے مذہب کو چھپانا یا تقیہ کرنا اس کے لیے ہتک کہا جا سکتا ہے ۔ دوسرے سلطان محمود کے دربار میں ہر ملت و مذہب کے شخص کا گزر تھا ۔ ہندو اس کی فیوج میں موجود تھے ۔ عیسائی طبیب اس کے ہاں تھے ۔ پھر کیا وہ ایک شیعہ شاعر کے وجود کا اپنے دربار میں روادار نہ ہوتا ۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسی سلطان نے ایک اور شیعہ شاعر غضائری رازی کو پیل بار انعام بخشی کی ہے :

امید وارم کہ این بار صد هزار تمام
بمن بیارد بر پشت فیل بر فیال

ابو ریحان البیرونی ، ایک اور شیعہ فاضل کو خود محمود نے خواہش کر کے اپنے دربار میں بلایا ہے ۔ محمود کی دو لڑکیاں شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس اور عنصر المعالی کیکاؤس کے ساتھ بیاہی گئی ہیں ۔ آل بویہ کے یہاں بھی محمود ایک شہزادی دینا چاہتا تھا ۔ اس لیے فردوسی کی نسبت تقیہ کا گمان کرنا بالکل غیر موزوں ہے ۔

فردوسی کے مذہب کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہم کو کسی اور شہادت کی ضرورت ہے جو بالکل غیر مشتبہ اور معتبر ہو ۔ یہ شہادت بھی شاہنامے میں موجود ہے اور میں اس کا ذکر ذیل میں کرتا ہوں ۔

۱ ۔ اشاعرہ و معتزلہ میں مسئلہ جبر و قدر سنگ تفرقہ انداز

رہا ہے ۔ متکلمین کے نزدیک جبر ضدِ عدل ہے ۔ اس سے ان کی مراد بندوں کی مقہوریت اور مغلوبیت ہے جس کے اثر میں انسان کے تمام افعال مہد سے لے کر لحد تک گویا اقوال و افعال خدا ہیں ، جو ان کے ہاتھ اور زبان سے ان کے اختیار اور ارادے کے بغیر جاری کرتا ہے یعنی اعمال خیر و شر ، جو کچھ اس زندگی میں ہم سے سرزد ہونے والا ہے خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے اور اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا جا سکتا ۔ صاحب گلشن راز کہتے ہیں :

هر آنکس را کہ مذهب غیر جبر است
نبیؐ فرمود کو مانند گبر است

لیکن معتزلہ کا مختار یہ ہے کہ عباد اپنے اقوال و افعال میں فاعل و موجد ہیں ، بہ الفاظ دیگر اپنے افعال میں مختار ہیں اور یہی ان کا مسئلہ قدر ہے ۔ اب شیعوں اور معتزلیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اکثر مسائل ان میں عام ہیں ۔ چناں چہ اس مسئلے میں دونوں فرقے متحد ہیں ۔

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں :

”و بندگان در فعل خود مختار اند و خود فاعل فعل خود اند خواه اطاعت باشد خواه معصیت و اکثر امامیہ و معتزلہ باین قول قائل اند و اشاعره کہ اکثر اهل سنت اند میگویند فاعل همہ افعال بندهٔ خداست و بندگان مطلق در آنها اختیار ندارند بلکہ خدا بر دست ایشان افعال را جاری میکند و در آن فعل مجبور اند ۔“
(حق الیقین)

یہ شیعہ نقطۂ نظر ہے ۔ اس مسئلے پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی معتزلہ کے برخلاف اشاعرہ کا ہم زبان ہے ۔ فردوسی کا اعتقاد ہے کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ ازل کے دن ہمارے

مقدرات میں لکھ دیا ہے ، انھی احکام کے مطابق ہم چلتے ہیں ۔ وہ احکام ایسے زبردست اور طاقت ور ہیں کہ نہ ہم ان پر چون و چرا کر سکتے ہیں اور نہ احتراز کر سکتے ہیں ، نہ ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش ہے ۔ نوشتۂ تقدیر امٹ اور اٹل ہے ۔ حیلے اور پرہیز سے کوئی تبدیلی اس میں پیدا نہیں کی جا سکتی ۔ بعض مثالیں یہاں عرض ہیں :

بدانگہ کہ لوح آفرید و قلم
بزد بر ہمہ بودنیہا رقم

کہ ہر چیز کاو آفرید از بوش
بدان سو کشد بندگان را روش

کہ کار خدایی نہ کاریست خورد
قضای نبشتہ نشاید سترد

چنین گفت دستان کہ دانا یکیست
بہ تقدیر او راہ تدبیر نیست

نبشتہ بسر برد گر گونہ بود
ز فرمان نکاھد نخواھد فزود

قضا چون ز گردون فرو ھشت پر
ھمہ زیرکان کور گردند و کر

بکوشیم و از کوشش ما چہ سود
کز آغاز بود آنچہ بایست بود

نوشتہ چنین بود و بود آنچہ بود
ز فرمان نکاھد نخواھد فزود

۲ - معتزلہ ، جو اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں ، اس عقیدے کے پابند ہیں کہ خدائے تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم سے خیر و صلاح کے سوا اور کچھ صادر نہیں ہو سکتا اور بہ حکم عقل رعایت مصالح عباد اس پر واجب ہے - پس خدا کی نسبت یہ اعتقاد کرنا کہ وہ بندوں کو اول تو اعمال خیر و شر پر مجبور کرے اور بعد میں ان کی پاداش میں سزا دے ، قبیح معلوم ہوتا ہے -

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں :

''حق تعالیٰ حکیم است و کارهای او منوط بہ حکمت و مصلحت است و فعل عبث و بی فائدہ ازو صادر نمی شود - او را در افعال اغراض صحیح و حکمت های عظیمہ ملحوظ می باشد و لیکن غرض در افعال الٰہی عاید بہ بندگان می گردد - غرض او تحصیل نفع از برای خود نیست ...... و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ آنچہ اصلح باشد از برای خلق و نظام عالم فعلش برحق تعالیٰ واجب است''

(حق الیقین)

برخلاف اس کے اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ بروے عقل خدا پر کچھ واجب نہیں - وہ قادر مطلق اور فعال مایشا ہے - وہ جو چاہے اور جب چاہے کرے ، جس کو چاہے بلند کرے اور جس کو چاہے پست کرے - ذلیل کو عزت دے اور عزت والے کو ذلیل کر دے ، جس کو چاہے راہ راست پر لائے اور جس کو چاہے سیدھی راہ سے الگ کر دے - جس کو جو چاہے دے اور جو چاہے چھین لے - وہ جو کچھ کرتا ہے یا کرے گا وہی عدل اور انصاف ہے - نفع و ضرر اس کے ہاتھ میں ہے - اللہ عز و جل پر ثواب یا عذاب یا بندے کے ساتھ لطف یا اس کے ساتھ وہ کرنا جو اس کے حق میں بہتر ہو کچھ واجب نہیں - مالک علی الاطلاق ہے جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے اس پر کوئی جور و حیف لازم نہیں آتا -

اس مسئلے میں فردوسی اشاعرہ کا ہم زبان ہے ۔ چناں چہ :

۱ - یکی را برآری بچرخ بلند
یکی را کنی خوار و زار و نژند
یکی را ز ماہ اندر آری بچاہ
یکی را ز چاہ اندر آری بماہ
یکی را برآری و شاہی دہی
یکی را بدریا بماہی دہی
نہ با آنت مہر و نہ با اینت کین
کہ بہ دان توئی ای جہان آفرین

۲ - غم و اندہ و رنج و تیمار و درد
ز نیک و ز بد ہر چہ آید بمرد
کمی و فزونی و نیک اختری
بلندی و پستی و کند آوری
ز داد تو بینم ہمی ہر چہ ہست
دگر کس ندارد درین کار دست

۳ - توانائی او راست ما بندہ ایم
ہم از راستی ہاش گویندہ ایم
یکی را دہد تاج و تخت بلند
یکی را کند خوار و زار و نژند
نہ با آنش مہر و نہ با اینش کین
نمیداند این جز جہان آفرین

۴ - و زویست پیروزی و ہم شکست
بہ نیک وبہ بد زان بود کام دست
زمان و مکان و جہان آفرید
پی مور و کوہ گران آفرید

خرد داد و جان و تن زور مند
بزرگی و دیہیم و تخت بلند

رہایی نیابد سر از بند او
یکی را بود فر و اورند او

یکی را دگر شور بختی بود
نیاز و غم و رنج و سختی بود

ز رخشندہ خورشید تا تیرہ خاک
ہمہ داد بینم ز یزدان پاک

۳ ۔ فرقہ اہل تسنن و تشیع میں ہاروت و ماروت کے متعلق بھی اختلاف رائے ہے ۔ ان فرشتوں کی بابت وہ قصہ جن سے ان کا بشری حیثیت اختیار کرکے دنیا میں آنا ، لوگوں کو جادو کی تعلیم دینا ، زہرہ پر عاشق ہونا اور اسم اعظم سکھانا ، جو اہل سنت و جماعت کے ہاں مقبول ہے اہل تشیع نہیں مانتے ۔ فردوسی شاہنامے میں ایک سے زیادہ موقع پر ہاروت کا ذکر کرتا ہے اور اس طریقے سے کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قصے پر اس کا اعتقاد تھا کیوں کہ وہ ان کی جادوگری کا ذکر کرتا ہے :

گہی میگسارید و گہ چنگ ساخت
تو گفتی کہ ہاروت نیرنگ ساخت

(تمہید داستان بیژن)

۴ ۔ سکندر کے حالات جو شاہنامے میں ملتے ہیں ، وہ معلوم ہوتا ہے زیادہ تر سنی مآخذ سے لیے گئے ہیں ۔

۵ ۔ صوفیوں کے متعلق اس کی رائے نہایت محترمانہ ہے جو سنیوں کے مطابق ہے ۔ سکندر کی داستان میں کہتا ہے :

غریبان کہ بر شہر ما بگذرند
چمانندہ پای و لبان نا چرند

دل از عیب صاف و صوفی بنام
بہ درویشی اندر شدہ شاد کام
ز خواھندگان نام شان بر کنید
شمار اندر آغاز دفتر کنید
(جلد ۳)

اہل تشیع ابتدا ہی سے صوفیوں کی نسبت معاندانہ رائے رکھتے ہیں ۔ امام علی نقی ان کو امت کے نصاریٰ اور مجوس کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ حضرت امام جعفر صادق سے کسی نے دریافت کیا کہ اس زمانے میں ایک فرقہ مبعوث ہوا ہے جس کو صوفی کہا جاتا ہے۔ آپ کی ان کی بابت کیا رائے ہے ۔ جواب میں فرمایا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں ، جو ان کی طرف مائل ہوا وہ انھی سے ہے اور انھی کے ساتھ محشور ہوگا ۔

بروایت امام حسن عسکری ابوہاشم کوفی الصوفی کے متعلق ، جنھوں نے سب سے پیشتر صوفی کے لفظ کو رواج دیا ہے ، حضرت امام جعفر صادق کی رائے یہ ہے کہ وہ سخت بد عقیدہ شخص ہے ۔

ان معتبر مسائل سے ، جو اتفاقیہ شاہنامے میں آ گئے ہیں اور جو ہر قسم کے شبہے سے بری ہیں ، دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی اہل تسنن کا ہم نوا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی سنیوں میں بوجہ تصنیفِ شاہنامہ جس کو ادب و شعر کی خدمت کی بجائے صریحاً مجوسیوں کی خدمت کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا ، بدنام تھا اور اسی بنا پر اس کی وفات پر شیخ الاکابر شیخ ابوالقاسم طوسی نے (جنھیں متأخرین نے ابوالقاسم خرقانی کہا ہے) اس کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ قصہ اگرچہ دیباچۂ بایسنغری کی وجہ سے عام طور پر مشہور ہے لیکن اس کا کوئی قدیم ماخذ معلوم نہ تھا ۔ شیخ فریدالدین عطار بہرحال اس قصے کے راوی ہیں ۔ 'اسرار نامہ' میں لکھتے ہیں :

شنودم من که فردوسی طوسی
که کرد او در حکایت بی فسوسی
به بست و پنج سال از نوک خامه
بسر می برد بیت شاهنامه
بآخر چون رسیدش دم بآخر
ابوالقاسم که بد شیخ الاکابر
اگرچه بود پیر پر نیاز او
نکرد از راه دین بروی نماز او
چنین گفت او که فردوسی بسی گفت
همه در حق گبری نا کسی گفت
بمدح گبرگان عمری بسر برد
چو وقت مردن آمد بی خبر مرد
مرا در کار او برگ ریا نیست
نمازم بر چنین شاعر روا نیست
چو فردوسی مسکین را ببردند
به زیر خاک تاریکش سپردند
درآن شب شیخ اورا دید درخواب
که پیش شیخ آمد دیده پر آب
زمرد رنگ تاجی سبز بر سر
لباسی سبز تر از سبزه در بر
به پیش شیخ بنشست و چنین گفت
که ای جان تو با نور یقین جفت
نکردی آن نماز از بی نیازی
بلی ننگ آمدت زین بی نمازی
خدای ما جهانی پر فرشته
همه از فیض روحانی سرشته

فرستاد اینت لطف کار سازی
که تا گردند بر جانم نمازی
خطم دادند بر فردوس اعلیٰ
که فردوسی بفردوس است اولیٰ
خطاب آمد که ای فردوسی پیر
اگر راندت ز پیش آن طوسی پیر
پذیرفتم منت تا خوش به خفتی
بدان یک بیت توحیدم که گفتی
مشو نومید از فضل الٰہی
مده بر فضل ما بخلی گواہی

یہ یقینی ہے کہ اگر فردوسی شیعہ ہوتا تو سنیوں میں ایسے قصوں کے تراشنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ فردوسی اپنی زندگی میں ممکن ہے کہ بدنام رہا ہو لیکن وفات کے بعد وہ سنی حلقوں میں ہردل عزیز معلوم ہوتا ہے ۔ سب سے پہلے اسدی طوسی 'گرشاسپ نامہ' میں اس کا ذکر کرتا ہے ۔ امام احمد غزالی نے ، جو اس عہد کے مشہور واعظ ہیں ، ایک موقع پر اثنائے وعظ میں کہا کہ اے مسلمانو ! مجھے تمھیں وعظ و نصیحت کرتے چالیس سال ہو گئے ۔ اس عرصے میں جو کچھ پند و موعظت میں نے کی ، اس کا خلاصہ فردوسی نے ان دو شعروں میں ادا کر دیا ہے :

ز روز گزر کردن اندیشہ کن
پرستیدن دادگر پیشہ کن
بہ نیکی گرای و میازار کس
رہ رستگاری ہمین است و بس

یہی حال شیخ عطار اور نظامی گنجوی کا ہے ۔ یہ تینوں بزرگ اہل تسنن میں اپنے اپنے مرکز میں بہ لحاظ شہرت و تقدس نہایت محترم مانے جاتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کا مذہب سے قریبی تعلق رہا ہے ۔

یہ بزرگوار فردوسی کا ذکر عزت کے ساتھ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی ان کے نزدیک اہل تسنن سے تھا ۔

یہاں میں مثنوی یوسف زلیخا کے متعلق بھی ، جو فردوسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے ، اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں ۔ مغربی محققین میں نلدیکی اور ایتھے اور ان کی تقلید میں دیگر مستشرقین نے اس کو فردوسی کی تصنیف مانا ہے ۔ مشرقی اہل قلم بالعموم اس کو فردوسی کی یادگار مانتے ہیں ۔ یہ عقیدہ خواہ کتنا ہی عالم گیر کیوں نہ ہو لیکن میرے خیال میں صحت پر مبنی نہیں ۔ میں یہاں ان تمام دلائل سے ، جو اس عام عقیدے کی تردید میں لائے جا سکتے ہیں ، صرف چند مختصراً ذیل میں عرض کرتا ہوں ۔ اس مسئلے پر میں نے تفصیل کے ساتھ ایک اور مضمون میں[1] (جو اپریل ۱۹۲۲ع کے رسالۂ اردو میں شائع ہوا ہے) بحث کی ہے ۔

۸۲۸ھ تک ہمارے پاس کوئی ایسی سند نہیں جو اس کتاب کو فردوسی کی طرف منسوب کرے ، سب سے پہلے شرف الدین یزدی اور دیباچہ نگار بایسنغرخانی نے یہ قصہ اٹھایا ہے ۔ ان کی تقلید دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی کی ہے ۔ قصہ یوں چلتا ہے کہ جب فردوسی سلطان کی ہجو لکھ کر غزنی سے فرار ہوا اور محمود کے خوف سے ایرانی والیان ملک اس کو اپنے ہاں پناہ نہیں دے سکتے تھے ، اس نے بغداد کا رخ کیا اور بارگاہ خلافت میں پہنچا ۔ شاہنامہ اس کی زندگی کا کارنامہ چوں کہ احوال ملوک عجم میں تھا ، اس لیے یہاں پسند عام کا خلعت حاصل نہ کر سکا ۔ فردوسی نے بغدادیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کتاب 'یوسف و زلیخا' نظم کی جو عام طور پر پسند کی گئی اور دربار خلافت میں اس سے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا ۔ جب بغداد میں فردوسی کے پہنچنے کی اطلاع

---

۱ - دیکھیے مضمون 'یوسف زلیخاے فردوسی' (مرتب)

سلطان محمود کو ہوئی ، اس نے فردوسی کی طلب میں ایک عریضہ بارگاہ خلافت میں ارسال کیا اور لکھا کہ اگر امیرالمومنین نے شاعر کو میرے پاس روانہ نہ کیا تو میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور دارالخلافے کی خاک ہاتھیوں پر لدوا کر غزنی لے آؤں گا ۔ خلیفہ القادر باللہ سلطان کی اس دھمکی سے مطلق سراسیمہ نہیں ہوا ۔ اس نے جواب میں صرف ایک لفظ "الم" لکھ بھیجا ۔ محمود کے دبیر خلیفہ کے اس جواب کی عقدہ کشائی سے عاجز رہے ۔ آخر یہ رائے قائم ہوئی کہ چوں کہ سلطان نے اپنے عریضے میں خلیفہ کو ہاتھیوں کی تہدید دی تھی ، اس لیے جواب میں خلیفہ نے سورۂ "الفیل" کی طرف تلمیح کی ہے کہ الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل ۔

اگرچہ نگارستان اور تاریخ گزیدہ میں سلطان اور خلیفہ کے مابین فردوسی کو بنائے مخاصمت بتایا گیا ہے لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی کا اس قصے کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ۔ حقیقت نفس‌الامر یہ ہے کہ سلطان اور خلیفہ کے درمیان ملک ماوراء النہر متنازعہ فیہ تھا ۔ سلطان خواہش مند تھا کہ ملک ترکستان پر متصرف ہو مگر خلیفہ مانع تھا ۔ جب سلطان نے دیکھا کہ عجز و الحاح سے کار بر آری دشوار ہے ، تشدد کا رنگ اختیار کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے وہ مشہور لفظ "الم" لکھا ۔ امیر عنصرالمعالی کیکاؤس والیِ طبرستان نے اپنی کتاب 'قابوس نامہ' میں یہ حکایت مفصل (بابِ سی و نہم در آئین کاتب) درج کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزاع ملک ماوراء النہر کے لیے تھا ، نہ فردوسی کے لیے ۔ لیکن جو لوگ اس تالیف کو فردوسی کی ملک مانتے ہیں اس کی وجہ شاید وہ بیانات ٹھہرا سکتے ہیں جو اس کے دیباچے میں مذکور ہیں ۔

'یوسف زلیخا' کے دیباچے میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے اکثر داستانیں اور پرانے قصے نظم کیے ہیں جن میں رزم بزم ، دوستی ، عداوت ، بلندی اور پستی سے بحث کی ہے ۔ عشاق کے حالات لکھے ،

معشوقوں کا تذکرہ لکھا ۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کی نظم لکھی ۔ ایسے مشغلوں سے اگرچہ دل کو فرحت حاصل ہوئی لیکن فی الواقع میں نے تکلیف اور گناہ کی کشت‌کاری کی جس سے اب پشیمان ہوں ۔ دل و زبان پر سکوت کی گرہ دیتا ہوں ۔ آیندہ جھوٹے افسانے لکھ کر رنج و معصیت کی تخم ریزی نہیں کروں گا ۔ فریدوں سے میں سیر ہوں مجھے کیا نفع اگر ضحاک تازی کا تخت اس نے چھینا ۔ کیقباد اور اس کی مملکت سے دل‌گیر ہوں ۔ تخت کیکاؤسی برباد ہوچکا ہے ۔ کیخسرو اور افراسیاب کی داستانیں لکھنے سے عذاب کے سوا اور کوئی پاداش نہیں ۔ میری اس حماقت پر، جس میں نصف عمر کھو کر رستم کا نام زندہ کیا ، اگر عقلا ہنسیں تو موزوں ہے ۔ اس بیان کے اثر میں غالباً یہ عقیدہ قائم ہوگیا کہ یہ کتاب فردوسی کی تصنیف ہے لیکن کیا ان کا قائل کوئی غیر فردوسی نہیں ہو سکتا ، جس نے فردوسی کی طرح ان داستانوں پر قلم اٹھایا ہو ۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس کے بعض بیانات کا امتحان لیں ۔ کیا یہ شخص فردوسی ہے ؟ اگر فردوسی ہے تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا ، جب اس نے 'زلیخا' میں یہ اشعار لکھے :

برین می سزد گر بخندد خرد
زمن خود کجا کی پسندد خرد
کہ یک‌نیمہ از عمر خود گم کنم
جہانی پر از نام رستم کنم

پور زال سے فردوسی کے بغاوت کے قصے پر ہمارے کان مشکل سے یقین کر سکتے ہیں ۔ اسی رستم کے لیے وہ شاہنامے میں کہتا ہے :

جہان آفرین تا جہان آفرید
سواری چو رستم نیامد پدید

ایک اور جگہ لکھتا ہے :

کسی را کہ رستم بود پہلوان
سزد گر بماند همیشه جوان

شاہنامہ نظم کرتے وقت فردوسی ان داستانوں کے لیے گویا ہے کہ تم ان کو دروغ اور افسانہ مت جانو اور واقعات کی رفتار کو اپنے زمانے کے معیار کے مطابق قیاس مت کرو ۔ جو باتیں قرین عقل ہوں ان کو باور کرو ، باقی کی ترجمانی رمز و ایما کے ساتھ کی جا سکتی ہے :

تو این را دروغ و فسانہ مدان
بیکسان روش در زمانہ مدان
از و هرچه اندر خورد با خرد
دگر بر ره رمز و معنی برد

اساطیر عجم کی نسبت شاعر کا یہ نقطۂ نظر معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن 'زلیخا' میں غیر ضروری سختی کے ساتھ کہتا ہے :

که آن داستانها دروغ است پاک
دو صد شان نیرزد بیک مشت خاک
چه باشد سخن های بر ساخته
شب و روز ز اندیشه پرداخته

یہ عام تکذیب و تردید پہلے نقطۂ نظر کے مقابلے میں نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ معاندانہ ہے ۔

فردوسی کو شاہنامے میں اپنے کارنامے پر ایک غیر معمولی فخر اور ناز تھا ۔ تمثیلاً سلطان محمود کو خطاب کرکے فخریہ لہجے میں یہ غیر فانی ابیات لکھتا ہے :

یکی بندگی کردم ای شهریار
که ماند ز من در جهان یادگار
بنا های آباد گردد خراب
ز باران و از تابش آفتاب

بنا کردم از نظم کاخی بلند
کہ از باد و باران نیابد گزند

کسی اور موقع پر یہی جوش مفاخرت یوں ادا ہوا ہے :

بسی رنج بر دم درین سال سی
عجم گرم کردم بدین پارسی

مگر جب توبۂ نصوح سے ذوق باب ہو چکا ہے ، خیالات میں ایک انقلاب عظیم مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ 'زلیخا' :

ازان تخم کشتن پشیمان شدم
زبان را و دل را گرہ بر زدم
نگویم کنون نامہای دروغ
سخن را ز گفتار ندہم فروغ

ہم ان دعاوی پر صدق دل سے ایمان نہیں لا سکتے کیوں کہ عمر بھر عجم اور صنادید عجم کی پرستاری میں مصروف رہ کر آخر وقت میں فردوسی کے لیے زندگی کا نیا ورق ، انبیاء کرام کی خدمت گزاری کے لیے لوٹنا ، تمام واقعات پر نظر رکھتے ہوئے مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے ۔

اگر 'یوسف زلیخا' فردوسی نے لکھی ہے تو ظاہر ہے کہ شاہنامہ ختم کرنے کے بعد لکھی ہوگی جب وہ نزدیک ہشتاد تھا اور شاہنامہ کے بعد لکھے جانے کا خود اس تصنیف کو اعتراف ہے ۔ شاہنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر بالکل ضعیف اور بوڑھا ہو چکا تھا ۔ نہ صرف بال سفید ہو چکے تھے ، جو منازل پیری میں اولین منزل ہے بلکہ سماعت جاتی رہی ہے اور بصارت بالکل ضعیف ہوچکی ہے ۔ کمر جھک گئی ، دانت جھڑ گئے ، دست و پا میں رعشہ نمودار ہے اور عصا کی مساعدت کے بغیر نقل و حرکت دشوار ہے اور یہ عام بیان ہے جو فردوسی اپنے بڑھاپے کے متعلق شاہنامے میں دے رہا ہے جو ایک اٹھہتر استّی سال کے بوڑھے پر بالکل صادق آتا ہے

لیکن یہی بوڑھا جب مثنوی یوسف زلیخا میں اپنے بڑھاپے کی شکایت کرتا ہے تو صرف اسی قدر کہتا ہے کہ میرے بال سفید ہو گئے۔ شاعر کے طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر میں یہ انقلاب یعنی پیری کی آمد اور بالوں کا سفید ہونا ایک تازہ واقعہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

نکارم کنون تخم رنج و گناه
که آمد سپیدی بجای سیاه
پر از خاک شمشاد بود از نخست
کنون بر کران سوسن تازه رست

دیگر

زمن دست گیتی بدزدید مشک
بجایش پراگنده کافور خشک
بر آمد ز ناگاه باز سفید
گسستند زاغانم از جان امید
زمانی همی گشت ز افراغ باغ
سر انجام بنشست بر جای زاغ

پیری کی اس قسم کی شکایت پینتالیس پچاس سال کے بوڑھے کی زبان سے بھلی معلوم ہوتی ہے نہ اسّی بیاسی سال کے پیر فرتوت کے منہ سے۔ تعجب ہے کہ پیر ضعیف 'یوسف زلیخا' میں پیرّی کی موجودگی سے اپنے میں یہی انقلاب دیکھتا ہے کہ اس کے بال سفید ہو گئے۔ مشک کافور بن گیا اور زاغ سیاہ کی جگہ باز سفید نمودار ہو گیا۔ مقابلے کے لیے میں شاہنامے سے بھی بعض اشعار نقل کرتا ہوں:

رخ لاله گون گشت برسان کاه
چو کافور شد رنگ ریش سیاه
ز پیری خم آورد بالای راست
هم از نرگسان روشنائی بکاست

دیگر

دو گوش و دو پای من آهو گرفت
تہیدستی و سال نیرو گرفت

دیگر

دوتای شد آن سرو تازہ بباغ
ہمان تیرہ گشت آن فروزان چراغ
پر از برف شد کوھسار سیاہ
ھمی لشکر از شاہ بیند گناہ

دیگر

مرا در خوش آب سستی گرفت
ہمان سرو آزاد پستی گرفت
خروشان شد این نرگسان دژم
ھمی گردد از سستی و رنج و غم

اب ظاہر ہے کہ 'یوسف زلیخا' کا بیان فردوسی کا بیان نہیں ہوسکتا بلکہ کسی اور شخص کا جو ہمارے شاعر سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ فردوسی کی طرح اس نے بھی داستان عجم پر قلم اٹھایا ہو ۔

میں اس کتاب کے سبب تالیف سے بعض امور یہاں حوالۂ قلم کرتا ہوں ۔ مصنف کہتا ہے کہ اتفاقاً ایک روز میں بختیاری کی 'یوسف و زلیخا' کا ذکر تاج زمانہ اجل موفق سے کر رہا تھا ۔ اس ذکر سے میری کوئی خاص غرض نہیں تھی ۔ امام نے فرمایا میں چاہتا ہوں تم بھی کسی شغل میں لگو اور بہتر تو یہ ہوگا کہ سرمایہ جمع کرکے اس قصے کو نظم کر ڈالو مگر نظم کو دانش سے ترتیب دینا اسقام و خطا سے بری رکھنا تاکہ دوسرے شعراء کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے ۔ بندش اور ترکیب چست ہونی چاہیے ۔ نکات اور معانی دل پسند ، اشعار دل چسپ اور بولتے قافیے ہوں ۔ کلام نقص

اور گنجلک سے پاک ہو ، دل کش ، پاکیزہ اور رواں ہو تاکہ میں وزیر امیر عراق کے پاس لے جاؤں اور کچھ حصہ اس کے سامنے پڑھا جائے ، اس سے تمھاری شاعری کا پایہ محقق ہوجائے گا اور تمھیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی مہربانی تمھارے حال پر ہوگی ۔

میں نے اس عالم اجل کی گفتگو سن کر جواب دیا کہ میں آپ کا تابع دار ہوں ، جلد اس داستان کو نظم کر دوں گا ۔ اگر یہ قصہ عمدہ طریق پر نظم ہوگیا اور بادشاہ نے پسند فرما لیا ، زمانے نے میری مساعدت کی اور شاہ میری خدمت گزاری سے خوشنود ہوگیا تو شاید اس بہانے سے میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے ، جس سے میری تشویش و افکار دور ہو جائیں گے اگرچہ مجھ کو اپنی نادانی کا اقرار ہے لیکن اگر خدا کا فضل شامل حال ہے اور بادشاہ کا پرتو مجھ پر رہا ، میں اپنی لیاقت کے بہ موجب اس کام میں کوشش کروں گا اور اپنی سمجھ کے موافق نظم کر دوں گا ۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ہم فردوسی سے دوچار نہیں ہیں بلکہ کسی اور گم‌نام شاعر سے جو فردوسی سے بالکل مختلف ہے اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نامعلوم ہے ۔ وزیر عراق سے اس کی تقریب کرانے کے لیے امام موفق اس کو 'زلیخا' لکھنے کی ترغیب دیتا ہے ، شاعر اس قدر گمنام ہے کہ وزیر کے دربار تک خود نہیں جا سکتا ، اس کی مثنوی امام موفق کے توسط سے جائے گی ۔ جب امتحاناً تھوڑا سا مثنوی سے وزیر سن لے گا اور پسند کر لے گا تب کہیں غریب شاعر کی قسمت جاگے گی ۔ اگر واقعی یہ شخص فردوسی ہے تو عراقیوں کی اس حماقت کا جواب شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے کہ شاہنامے کے ساٹھ ہزار اشعار پڑھنے کے بعد بھی ان کو فن شعر میں فردوسی طوسی ، خدائے سخن کا پایہ معلوم نہیں ہو سکا ۔ اس کا امتحان لیا جاتا ہے اور بختیاری جیسے گم‌نام شاعر کے مقابلے

میں کھڑا کیا جاتا ہے کہ اس کی مثنوی کا جواب لکھو لیکن خدا را اس طرح لکھنا کہ دوسرے شاعر انگشت نمائی نہ کریں ۔

امام اجل[1] موفق کی ہدایت پر ، جو ایک مبتدی شاعر کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے ، فردوسی برا ماننے کی بجائے الٹا فخر کرتا

۱ ۔ ایتھے کا خیال ہے کہ 'زلیخا' فردوسی نے مجدالدولہ ابوطالب رستم ۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ کے لیے نظم کی ۔ پروفیسر نلدیکی کا اعتقاد ہے کہ بہاء الدولہ ۳۸۰ھ و ۴۰۳ھ یا اس کے فرزند سلطان الدولہ ۴۰۳ھ و ۴۲۶ھ کے واسطے لکھی ۔ ایتھے کے خیال کی موید کوئی دلیل موجود نہیں ۔ اس سے اعراض کرکے میں نلدیکی کے نظریے کو لیتا ہوں جس کی تائید میں یہ امور ملتے ہیں :

(۱) موفق بہاءالدولہ کا وزیر ہے ۔ اس کا پورا نام ابو علی (الحسن محمد) بن اسماعیل ہے ۔

(۲) اہواز کو بہاءالدولہ کی تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے ۔

(۳) بختیاری شاعر نے جس کا ذکر آیا ہے عزیزالدولہ بختیار ۳۶۷ھ کے نام پر اپنا تخلص رکھا ہوگا جو بویہ خاندان کا ایک شہزادہ تھا ۔

اس نظریے کے خلاف میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ الاجل تاج الزماں موفق ، جس کا دیباچے میں مذکور ہے ، اور موفق وزیر بہاء الدولہ ایک شخص نہیں ہو سکتے ۔ تاج الزماں اور کمال‌الزماں کی طرز کے القاب پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ملتے ہیں ۔ موفق بن اسماعیل وزیر بہاءالدولہ ۳۹۰ھ میں پہلی مرتبہ اور ۳۹۲ھ میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے اور عنقریب بعد وفات پاتا ہے ۔ یوسف زلیخا کو شاہنامے کے اختتام یعنی ۴۰۰ھ کے بعد لکھے جانے کا اعتراف ہے ۔ اس سال سے بہت قبل موفق کا انتقال ہو جاتا ہے ۔ زلیخا میں جس موفق کا ذکر ہے وہ کوئی عالم معلوم ہوتا ہے جو صاف الفاظ میں شاعر سے کہتا ہے کہ میں تمھاری مثنوی کو دستور امیر عراق کے پاس لے جاؤں گا :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہے اور خوشامد کے لہجے میں جواب دیتا ہے۔ اس سبب تالیف نے مجھے اپنے عقیدے میں اور راسخ کر دیا ہے کہ اس تصنیف کو فردوسی سے کوئی نسبت نہیں : ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

کہاں فردوسی اور کہاں یہ غریب شاعر۔ لیکن ہم نے بدقسمتی سے شبہ کو گوہر اور ذرے کو آفتاب مان لیا ہے۔

شاہنامے اور 'یوسف زلیخا' کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں اسلوب بیان و زبان میں مختلف ہیں۔ شاہنامے میں جہاں اجمال ہے، یوسف زلیخا میں تفصیل اور طوالت دیکھی جاتی ہے۔ شاہنامے سے ہم فردوسی کی خوبو، مزاج، پسند و نا پسند، اخلاقی نصب العین اور سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں لیکن 'یوسف زلیخا' میں شاعر نے اپنی شخصیت کو اس قدر چھپانے کی کوشش کی ہے کہ باوجود تمام کتاب پڑھ چکنے کے ہم اس کی ذات کے متعلق کوئی اطلاع حاصل نہیں کر سکتے۔ شاہنامے میں عربی الفاظ کا استعمال اس تناسب سے نہیں ہے جس تناسب سے فردوسی کے پیشروؤں، رودکی اور دقیقی کے ہاں ملتا ہے لیکن 'یوسف زلیخا' میں عربی الفاظ نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر واقعی فردوسی اس تصنیف کا مالک ہے تو دشوار معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اسی طرز

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

برم نزد دستور میر عراق
کہ گردانش خیلند و ایران و شاق

فردوسی ۳۸۸ھ سے لے کر ۳۹۲ھ تک غزنی میں موجود ہے اور اس زمانے میں سلطان محمود سے اس کے خوش گوار تعلقات قائم ہیں، اس لیے اس زمانے میں اس کا اہواز جا کر مثنوی یوسف زلیخا بہاءالدولہ کے لیے تصنیف کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

(حاشیہ مصنف)

رائج الوقت کو ، جو ساٹھ ہزار ابیات لکھنے کے بعد اس کے لیے بمنزلہ طبیعت ثانیہ تھی ، ترک کر کے ایسی روش اختیار کرے جو اس کے پس رووں میں رائج ہو -

اسلوب بیان و زبان کے سلسلے میں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی کے ہاں اظہار مطالب میں تنوع اور بوقلمونی ایک نہایت محدود پیمانے پر ملتی ہے - جب کوئی خاص خیال اس کو ادا کرنا ہوتا ہے تو چند بار پیرایۂ بیان بدل کر وہ پھر انھی الفاظ کی تکرار اور اعادے پر مجبور ہو جاتا ہے - اس لیے تکرار شاہنامہ کے دلکش چہرے کا نہایت بدنما خال ہے - یہ نقص زیادہ تر فردوسی کے عہد کی زبان کی بے مایگی اور ناداری کی بنا پر ہے - لیکن مثنوی یوسف زلیخا میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ نقص ایک بڑی حد تک غائب ہے -

دونوں مصنف ادائے مضمون ، انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں اشتباہ و التباس تقریباً دشوار ہے مثلاً 'یوسف زلیخا' میں حسب قاعدۂ تفریس یہ الفاظ ملتے ہیں :

عفو (بحرکت دوم) لطف (بحرکت دوم) عمدا (بہ تسکین میم)
عماری (بہ تشدید میم) مشاطہ (بہ تخفیف تشدید) میشوم
(بجائے مشؤم) اور ملکت (بجائے مملکت) -

فردوسی ان الفاظ کے متعلق قاعدۂ تفریس سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا ہے - یہ قاعدہ فردوسی کے عہد میں نامعلوم تھا - اگرچہ سلجوقی دور کے شعرا مثلاً منوچہری ، ناصرخسرو ، اسدی ، امیر معزی ، مسعود سعد سلمان ، حکیم سنائی ، عثمان مختاری ، عمعق بخاری ، ادیب صابر وغیرہم اس سے واقف ہیں -

مرکبات توصیفی میں 'زلیخا' میں اکثر ایسے مرکب ملتے ہیں جو اضافت تشبیہی یا بیانی کے ذریعے سے بنتے ہیں مثلاً گلشن حسن ، کیمیائے جلال ، چراغ بصر ، چراغ جہاں ، چراغ دل ، سپہر وفا ، آفتاب ہنر وغیرہ -

فردوسی کے ہاں ایسے مرکبات ہیں جو اسم فاعل اور اسم کی آمیز سے بنتے ہیں ۔ مثلاً چرانندۂ کرگس ، گرایندۂ تاج ، فرازندۂ اختر فزایندۂ نام ، نشانندۂ شاہ ، ستانندۂ گاہ ، فشانندۂ گنج وغیرہ ۔

بعض الفاظ شاہنامے میں رائج ہیں لیکن 'یوسف زلیخا' میں متروک ہیں اور ان کی جگہ جدید الفاظ نے لے لی ہے مثلاً شاہنامے میں بویژہ کا قائم مقام 'زلیخا' میں بخاصہ ہے ۔ شاہنامے کے بندبستن کی جگہ عقد بستن اور باد سرد کی جگہ آہ اور گزاریدن خواب کی جگہ تعبیر ہے ۔ شاہنامے کا ارج ، 'زلیخا' میں ورج اور آذین بستن ، آئین بستن ہے ۔ غریویدن شاہنامے میں بمعنی شور و فریاد ہے اور زلیخا میں گریہ و زاری ۔

فردوسی ارژنگ کو جادو ، نیرنگ اور تصویر کے معنوں میں لاتا ہے اور یہ معنی ایسے ہیں جن سے نہ صاحب 'یوسف زلیخا' اور نہ دیگر اساتذہ واقف ہیں ۔ شاہنامے میں ارژنگ پانچ موقعوں پر بمعنی تصویر آیا ہے ۔ اس تکرار سے ظاہر ہے کہ فردوسی کے نزدیک یہی معنی تھے ۔ ترکیبی شکل میں ارژنگِ چیں بمعنی تصویرِ چیں ملتا ہے ۔ اگر فردوسی 'یوسف زلیخا' لکھتا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے معلومہ معنی 'یوسف زلیخا' میں ارژنگ کو نہ دیتا ۔

ارژنگِ مانی کی ترکیب 'زلیخا' میں چار موقعوں پر ملتی ہے اور ہر موقع پر کتاب مانی یا نگار خانۂ مانی کے معنوں میں مستعمل ہے اور شاہنامے والے معنی بھول کر بھی نہیں آتے ۔ کیا فردوسی کو اسّی برس کی عمر میں 'زلیخا' لکھتے وقت یہ امر محقق ہوا کہ ارژنگ مانی کی کتاب کا نام ہے نہ تصویر ، جو معنی شاہنامہ میں وہ لاتا رہا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ فردوسی مانی کی تاریخ سے واقف ہونے کی بنا پر مانی کی کتاب ارژنگ کے وجود کا قائل نہیں تھا ۔ اسی لیے شاہنامے میں وہ اس کا ذکر نہیں کرتا اور اگر 'زلیخا' لکھتا تو اس میں بھی اس قسم کی غلطی کے ارتکاب سے احتراز کرتا ۔

شاهنامے سے فردوسی کے حالات

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت ماہ فروری ۱۹۳۰ء)

سرزمین ایران کے مشہور شاعر فردوسی طوسی کے متعلق اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ دنیا نے اس کے حالات کی جستجو میں ہر ممکن ذریعۂ معلومات کی چھان بین کی ہے ۔ اور ہر قسم کی اطلاع کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے تاہم ایک ماخذ ایسا ہے جس کی طرف ابھی ہماری توجہ کماحقہ منعطف نہیں ہوئی ہے، حالاں کہ جو مواد اس ماخذ سے ملتا ہے بہ لحاظ قدامت و اہمیت ہماری توجہ کا مستحق ہے ۔ اس سے ہماری مراد خود فردوسی کا شاہنامہ ہے ۔

ان سطور میں شاہنامے سے ایسی شہادت پیش کی جاتی ہے جو فردوسی کے بعض حالات اور زیادہ تر شاہنامے کی تصنیف کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے ۔ یہ شہادت اگرچہ غیر معین ، متفرق اور مجمل ہے مگر اس کے صحیح ہونے میں کسی احتمال کی گنجائش کا امکان نہیں ۔ فردوسی کے لیے فردوسی کے اپنے بیانات سے زیادہ اور کیا معتبر شہادت دستیاب ہو سکتی ہے ۔ اس سلسلے میں بعض موقعوں پر دیباچۂ قدیم کے بیانات سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا گیا ہے ۔ فارسی ادبیات میں شاہنامے کے بعد فردوسی کے حالات کا سب سے قدیم ماخذ یہی دیباچۂ ہے ۔ اس دیباچے میں ہم دیکھتے ہیں کہ

---

۱ - اپریل ۱۹۲۷ء کے رسالۂ اردو ، اورنگ آباد ، میں محترمی حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے دیباچۂ قدیم کو شائع کر دیا ہے ۔
(حاشیۂ مصنف)

فردوسی سے بعد میں آنے والی صدی میں اس شاعر کے متعلق نہایت مختصر اطلاع تھی اور فردوسی کے افسانے کے نہال کو شجر بننے اور برگ و بار لانے کے لیے ابھی ایک عرصہ درکار تھا ۔ اگرچہ بہ روئے تنقید اس دیباچے کے بعض بیانات بھی چنداں معتبر نہیں مانے جا سکتے تاہم وہ ہماری توجہ کے مستحق ہیں ۔

دیباچۂ قدیم[1] میں فردوسی کا نام 'حکیم ابو القاسم المنصور الفردوسی' دیا گیا ہے ۔ فردوسی کا باپ دہقان جماعت سے تعلق رکھتا تھا ۔ فردوسی کے دہقان پیشہ ہونے کی تائید شاہنامے کے مختلف ابیات سے ملتی ہے ۔ چناں چہ :

بر آمد یکی ابرو بر شد بماہ
همی شیر بارید ز ابر سیاه
ندریا پدید است و نی دشت و راغ
نہ بینم همی بر هوا پر زاغ
حواصل فشاند همی هر زمان
چہ سازد همی این بلند آسمان
نماندم نمکسود و هیزم نجو
نہ چیزی پدید است تاجو درو
بدین تیرگی روز هول خراج
زمین گشت از برف چون گوی عاج
من اندر چنین روز و چندین نیاز
باندیشہ در گشتہ فکرم دراز

---

۱ ۔ دیباچے کی اصل عبارت یہ ہے :
''آوردہ اند کہ پدر فردوسی مردی دهقان بود ، دو فرزند داشت یکی حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی و یکی مسعود''۔
(دیباچۂ قدیم قلمی) (حاشیۂ مصنف)

همه کارها شد سر اندر نشیب
مگر دست گیرد [حسین قتیب[1]]
(شاہنامہ طبع میکن ، جلد ثالث ، صفحہ ۱۳۸۷)

مرا دخل و خورد ار برابر بدی
زمانہ مرا چون برادر بدی
تگرگ آمد امسال برسان مرگ
مرا مرگ بہتر بدی زان تگرگ
در هیزم و گندم و گوسفند
بہ بست این برآورده چرخ بلند
(کشتہ شدن یزد جرد بدست آسیابان ، صفحہ ۲۰۸۹ ، جلد رابع)
حسین قتیب است ز آزادگان
کہ از من نخواهد سخن رایگان
ازویم خور و پوشش و سیم و زر
ازو یافتم جنبش و پا و پر
نیم آگہ از اصل و فرع خراج
همی غلطم اندر میان دواج
(تاریخ انجام شاہنامہ ، صفحہ ۲۰۹۵ ، جلد چہارم)

۱ - میکن کے تتبع میں مطبوعہ شاہناموں میں یہاں ''بچیزے جنیب'' ملتا ہے لیکن ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۷۵۲ھ میں اس جگہ 'حسین قتیب' مرقوم ہے ۔ چوں کہ شاہنامے کے خاتمہ میں بھی 'حسین قتیب' موجود ہے : حسین قتیب است ز آزادگان
(صفحہ ۲۰۹۵)
اس لیے میں نے حسین قتیب اختیار کر لیا ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ - یہ اور آیندہ حوالے شاہنامہ ، طبع کلکتہ ۱۹۲۹ع سے ہیں جس کو میکن نے شائع کیا تھا ۔ (حاشیۂ مصنف)

ان اشعار سے ، جن میں جو کی فصل ، برفباری و ژالہ باری ، گندم و ہیزم اور خراج زمین کا ذکر ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی بذریعۂ دہقانی اپنی معاش حاصل کرتا تھا ۔ دہقان ان ایام میں مالک اراضی کو کہا جاتا تھا ، جو مزارعین کو زمین بغرض کاشت دیا کرتا تھا ۔ سرکار میں ہر دہقان اپنی اپنی زمین کے مالیے کی ادائیگی کا ذمہ دار تھا ۔ سلطنت اور کاشت کار کے درمیان یہ طبقہ ساسانی زمانے سے موجود تھا ۔ بقول مسعودی 'دہاقین' وہکرت بن فردال بن میالک بن نرمی بن کیومرث کے اسباط ہیں ۔ وہکرت کے فرزند کے دس لڑکے تھے ۔ ان کی اولاد دہقان مشہور ہوئی ۔ وہکرت پہلا شخص ہے جو دہقان کہلایا ۔ دہقانوں کی جماعت پانچ طبقوں میں منقسم تھی اور ہر طبقہ اپنا مخصوص لباس رکھتا[1] تھا ۔

شاہنامے میں دہقان کا ذکر ایک تو شاہنامے کے راوی کی حیثیت سے آتا ہے ۔ مثلاً :

سخن گوی دهقان چه گوید نخست
که نام بزرگی بگیتی که جست

(صفحہ ۱۱ ، جلد اول)

یہ دہقان[2] جس کا نام فردوسی کہیں بیان نہیں کرتا ، شاہنامے کی اکثر داستانوں کا راوی ہے اور ان کی ابتدا میں شاعر معمولاً

۱ ۔ مروج الذہب ، صفحہ ۲۴۰ - ۲۴۱ ، جلد دوم ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا طبقۂ دہاقین کے متعلق لکھتے ہیں :

''از مطالعہ در احوال این گروه چنین بر میاید که روایات و یادگارهای تاریخی ایران رابا دقت و مراقبت فراوان حفظ میکرده اند و بهمین سبب در مقدمه ابومنصوری چنین می یابیم که :

''این نامه را هر چه گذارش کنیم از گفتار دهقانان باید آورد که این پادشاهی بدست ایشان بوذ و از کار و رفتار و از نیک و بذ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس کی طرف تلمیح کرتا ہے ۔ دوسرے بمعنی کسان و کاشتکار یعنی وہی مفہوم جو فی زمانتا اس سے لیا جاتا ہے ۔ چناں چہ :

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

و ازکم و بیش ایشان دانند پس ما را بگفتار ایشان باید رفت۔'' دلیل عمدۂ این اطلاع آن بود که دهگانان بی کم و کاست با خصائص نژادی ایران باقی ماندند و با هیچ یک از اقوام خارجی آمیزش نکردند و بدین طریق خود را ایرانی واقعی میانگاشتند و در این گمان مصیب بودند و حتی همین وضع نژادی دهاقین باعث شده بود که ایرانیان پس از مغول بجای ایرانی واقع گه کلمۂ دهقان را استعمال کنند مثلاً در این دو بیت از فردوسی کلمۂ دهقان درست بمعنی ایرانی در برابر ترک و تازی استعمال شده است :

ز ایران و از ترک و از تازیان
نژادی پدید آید اندر میان
نه دهقان نه ترک و نه تازی بود
سخنها بکردار بازی بود

و در بیت ذیل از منظومۂ ''لیلی و مجنون'' نظامی دهقان در برابر عرب قرار گرفته :

دهقان فصیح پارسی زاد
از حال عرب چنین خبر داد

و ترکیب 'تازی و دهقان' در ادبیات فارسی همان شهرتی را دارد که ترکیب 'ترک و تازیک=تاجیک ، و این بیت بو حنیفۂ اسکافی دلیل روشنی است بر این معنی :

مامون آن کز ملوک دولت اسلام
هرگز چون او ندید تازی و دهقان

.........و اگر در این بیت از فردوسی :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

گر ایدونکہ دھقان بدی تنگ دست
سوی نیستی گشتہ کارش ز ہست
بدادی ز گنج آلت و چارپای
نماندی کہ پایش برفتی ز جای
(ذکر خردمندی اردشیر ، صفحہ ۱۴۰۷ ، جلد ثالث)

فردوسی شاہنامے کے ضمن میں بار بار ایسے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے جو قدرتاً ایک دہقان کو مرغوب ہوں مثلاً محمود کی تعریف میں :

ز فرش جہان شد چو باغ بہار
ہوا پر ز ابر و زمین پر نگار
ز ابر اندر آمد بہنگام نم
جہان شد بہ کردار باغ ارم
(صفحہ ۱۰ ، جلد اول)

ایک اور موقع پر محمود سے خطاب کرتا ہے :

اگر داد گر باشی ای شہر یار
بگیتی بمانی یکی یاد گار
کہ جاوید ہر کس کند آفرین
بدان شاہ کاباد دارد زمین
(صفحہ ۱۶۲۴ ، جلد سوم)

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

یکی پہلوان بود دھقان نژاد
دلیر و بزرگ و خرد مند و راد

دھقان را بمعنی طبقۂ دھقانان تصور نکنیم باید لاشک آنرا 'ایرانی' بدانیم و در این صورت معنی 'دہقان نژاد' ایرانی نژاد است''۔
(حماسہ سرایی در ایران ، گفتار نخست ، صفحہ ۶۰-۵۹)

(مرتب)

داستان بیژن

فردوسی کی سب سے پہلی تصنیف داستان بیژن ہے جس کو وہ اپنی اہلیہ کی فرمائش پر نظم کرتا ہے ۔ واقعۂ ذیل اس داستان کی تصنیف کا موجب ہے ۔

۳۶۵ھ کے گرد و پیش میں کسی ایک رات فردوسی اپنے خانہ باغ میں سو رہا تھا ۔ کسی نامعلوم وجہ سے اس کو نیند نہیں آئی ۔ ہرچند چاہا کہ سو رہے لیکن کامیاب نہیں ہوا ۔ جب گھبراہٹ زیادہ ہوئی ، اس نے اپنی بیوی کو آواز دی ۔ وہ چراغ لے کر آئی ۔ پھر کچھ میوے اور نبیذ لائی اور شاعر کا دل موسیقی ساز اور سرود سے بہلاتی رہی ۔ زاں بعد گویا ہوئی کہ میں تمھارے دل بہلاؤ کے لیے 'دفتر پاستاں' کی ایک کہانی سناتی ہوں جو رزم و بزم ، فریب و محبت کے واقعات پر منبی ہے ، جس کو سن کر تم آسمان کی نیرنگ بازی پر تعجب کرو گے ۔ فردوسی نے خواہش کے ساتھ کہا کہ ضرور مجھے یہ داستان سناؤ ۔ بولی اس شرط پر سناتی ہوں کہ کہانی سننے کے بعد اس کو نظم کر دو ۔ شاعر نے کہا ہاں ہاں ، میں جس طرح سنوں گا اسی طرح اس کو نظم کر دوں گا ۔ اس سے میری طبیعت کی وحشت دور ہو جائے گی ۔ دوسرے فکر شعر میں مجھ کو مزے سے نیند بھی آ جائے گی ۔ مختصر یہ کہ فردوسی کی اہلیہ نے وہ کہانی دفتر پاستان سے پڑھ کر سنائی اور شاعر نے بعد میں اس کو نظم کر دیا ۔

داستان بیژن کا واقعاتی خا کہ کچھ ایسا دل چسپ ہے کہ عورت و مرد ، پیر و جوان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ نوجوان بیژن کیخسرو کے دربار سے جنگلی سوروں کے نابود کرنے کی مہم پر ملک ارمن روانہ ہوتا ہے ۔ راہبری کے لیے گرگیں جیسا گرگ باراں دیدہ ہمراہ کر دیا جاتا ہے ۔ مہم ختم ہو جانے کے بعد بیژن مراجعت

کے لیے تیار ہوتا ہے ۔ گرگیں کو اس کی آیندہ شہرت و اعزاز پر حسد آتا ہے ۔ اس کی عزت کو خاک میں ملانے کے لیے وہ یہ سبز باغ دکھاتا ہے کہ یہاں سے ایک دو روز کے فاصلے پر ایک خوشنما مرغزار تورانی حدود میں واقع ہے جہاں تورانی لڑکیاں موسم بہار میں جشن منانے کی غرض سے آتی رہتی ہیں ۔ افراسیاب پادشاہ توران کی خوبصورت بیٹی منیژہ بھی ہر سال آیا کرتی ہے ۔ آج کل اتفاق سے بہار کا موسم ہے اور تورانی لڑکیوں کی آمد کا زمانہ ہے ۔ اگر منظور کرو تو ہم تم چلیں ، کچھ لڑکیاں پکڑ لائیں اور ایران لے چلیں ، واللہ ہماری بڑی ناموری ہوگی ۔ سادہ لوح بیژن فریب میں آ جاتا ہے اور ترکستانی علاقے میں گھس جاتا ہے ۔ یہاں منیژہ بغرض تفریح آئی ہوئی تھی ۔ وہ بیژن کو دیکھ کر عاشق ہو جاتی ہے اور دایہ کی معرفت اس کو اپنے خیمے میں بلوا لیتی ہے ۔ کچھ دن کے بعد شہزادی اس کی جدائی کی تاب نہ لا کر بے ہوشی کی دوا بیژن کو سنگھا دیتی ہے اور خفیہ طور پر شاہی محل میں لے جاتی ہے ۔ حاجب محل سرا کی معرفت یہ خبر افراسیاب کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے ۔ شاہی حکم سے فوج روانہ ہوتی ہے اور بیژن گرفتار کر لیا جاتا ہے ۔ ایک تاریک چاہ اس کا زندان قرار پاتا ہے ۔ منیژہ کا محل لوٹ لیا جاتا ہے اور شہزادی فقیرانہ لباس میں شاہی قصر سے نکال دی جاتی ہے ۔ وہ اب در در بھیک مانگتی ہے اور اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہے ۔ جام جہاں نما کے ذریعے سے کیخسرو کو بیژن کی قید کا علم ہوتا ہے ۔ رستم سات پہلوانوں کی معیت میں بغرض رہائیِ بیژن ، توران روانہ ہوتا ہے اور موقع پا کر بیژن کو کنوئیں سے نکال لیتا ہے ۔ اب ایرانی پہلوان افراسیاب کے محل پر حملہ کر دیتے ہیں ۔ افراسیاب بھاگ جاتا ہے اور محل لوٹ لیا جاتا ہے ۔ دوسرے دن افراسیاب رستم سے جنگ کرتا ہے اور شکست کھا کر لوٹ جاتا ہے اور رستم مع منیژہ و بیژن واپس ایران

آ جاتا ہے۔

یہ کہانی ، جس کے مختصر خط و خال میں نے اوپر بیان کیے ہیں ، اس رات فردوسی نے اپنی اہلیہ سے سنی تھی ، میکن کے شاہنامے میں صفحہ ۷۵۴ سے شروع ہوکر صفحہ ۸۰۶ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا شمار شاہنامے کی بہترین داستانوں میں ہونا چاہیے۔ فردوسی اس رات کی تاریکی ، سکوت کے عالم ، باغ کے بھیانک منظر ، اپنی تنہائی اور وحشت کے جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے :

شبی چون شبہ روی شستہ بقیر
نہ بہرام پیدا نہ کیوان نہ تیر
دگر گونہ آرایشی کرد ماہ
بسیچ گذر کرد بر پیشگاہ
شدہ تیرہ اندر سرای درنگ
میان کردہ باریک‌ودل کردہ‌تنگ
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد
سپردہ ہوا را بزنگار گرد
سپاہ شب تیرہ بر دشت و راغ
یکی فرش افگندہ چون پر زاغ
چو پولاد زنگار خوردہ سپہر
تو گفتی بقیر اندر اندودہ چہر
نمودم ز ہر سو سیہ اہرمن
چو مار سیہ باز کردہ دہن
ہرانگہ کہ برزد یکی باد سرد
چو زنگی‌برانگیخت ز انگشت‌گرد
چنان گشت باغ و لب جوئبار
کجا موج خیزد ز دریای قار

فرو مانده گردون گردان بجای
شده سست خورشیدرا دست و پای
زمین زیر آن چادر قیر گون
تو گوئی شد ستی بخواب اندرون
جهانرا دل از خویشتن پر هراس
جرس برگرفته نگهبان پاس
نه آوای مرغ و نه هرای دد
زمانه زبان بسته از نیک و بد
نبد هیچ پیدا نشیب و فراز
دلم تنگ شد زان درنگ دراز
(صفحه ۷۵۴)

یہ اشعار فردوسی کی شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ فردوسی کے ہم وطن اور مقلد اسدی طوسی نے 'گرشاسپ نامہ' (۴۵۸ھ) میں ان کا جواب دیا ہے جس کا ابتدائی شعر یہاں درج ہوتا ہے:

شبی بد چو زنگی سیه تر ز زاغ
مه نو چو در دست زنگی چراغ

بعد کے واقعات کو ہمارا شاعر اس طرح بیان کرتا ہے:

بدان تنگی اندر بجستم ز جای
یکی مهربان بودم اندر سرای
خروشیدم و خواستم زو چراغ
در آمد بت مهربانم بباغ
مرا گفت شمعت چه باید همی
شب تیره خوابت نیاید همی
بدو گفتم ای بت نیم مرد خواب
بیاور یکی شمع چون آفتاب

بنه پیشم و بزم را ساز کن
بچنگ آر چنگ و می آغاز کن
برفت آن بت مهربانم ز باغ
بیاورد رخشنده شمع و چراغ
می آورد و نار و ترنج و بهی
زدوده یکی جام شاهنشهی
گهی می گسارید و گه چنگ ساخت
توگفتی که هاروت نیرنگ ساخت
دلم بر همه کار پیروز کرد
شب تیره همچون گه روز کرد
مرا مهربان یار بشنو چه گفت
ازان پس که گشتیم با جام جفت
مرا گفت آن ماه خورشید چهر
که از جان تو شاد بادا سپهر
به پیمای می تا یکی داستان
ز دفتر برت خوانم از باستان
که چون گوشت از گفت من یافت برخ
شگفت اندرو مانی از کار چرخ
پر از چاره و مهر و نیرنگ و جنگ
همه از در مرد فرهنگ و سنگ
بدان سرو بن گفتم ای ماهروی
مرا امشب این داستان باز گوی
مرا گفت کز من سخن بشنوی[1]
بشعر آری از دفتر پهلوی

---

۱ - شاہنامہ طبع طہران میں اس شعر سے قبل یہ دو شعر بھی ملتے ہیں :
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بگفتم بیار ای مه خوب چهر
بخوان داستان و بیفزای مهر
مگر طبع شوریده بکشایدم
شب تیره ز اندیشه خواب آیدم
ز تو طبع من گردد آراسته
ایا مهربان یار پیراسته
چنان چون ز تو بشنوم در بدر
بشعر آورم داستان سر بسر[1]
بگویم پذیرم ز یزدان سپاس
ایا مهربان جفت نیکی شناس[2]
بخواند آن بت مهربان داستان
ز دفتر نوشته گه پاستان
بگفتار شعرم کنون گوش دار
خرد یاد دار و بدل هوش دار
(صفحہ ۵۵ - ۵۴، جلد ثانی)

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
ز نیک و بد چرخ نا سازگار
که آرد بمردم ز هر گونه کار
نداند کسی راه و سامان اوی
نه پیدا بود درد و درمان اوی (مرتب)

۱ - طبع طہران میں اس شعر سے قبل یہ شعر موجود ہے :
چو گویی بمن باز پوشیده راز
مرا طبع ناساز گردد بساز (مرتب)

۲ - مطبوعہ طہران میں یہ شعر یوں درج ہے :
بگویم بشعر و پذیرم سپاس
ایا مهربان یار نیکی شناس (مرتب)

جو لوگ فردوسی کی طرز اختصار پسندی سے واقف ہیں وہ تسلیم کریں گے کہ تمام شاہنامے میں داستان بیژن ہی ایک ایسا موقع ہے جہاں شاعر نے خلاف معمول ایسی طول طویل تمہید زیب عنوان کی ہے ۔ ورنہ باقی داستانوں میں یا تو تمہید لکھی ہی نہیں یا اگر لکھی ہے تو اتنی مختصر کہ چند بیت سے زیادہ اس پر صرف نہیں کیے ۔ اس لیے یہ امر روشنی میں آ جاتا ہے کہ داستان بیژن لکھتے وقت صورت حالات بالکل مختلف تھی ۔ نہ اس وقت تک اس کو شاہنامے کی نظم کا خیال آیا تھا اور نہ اس نظم کو بسلسلۂ شاہنامہ اس نے لکھا تھا ، بلکہ ایک علیحدہ اور مستقل تصنیف کی حیثیت سے ۔ اسی لیے شاعر نے ان اسباب کو جو اس تصنیف کے محرک ہوئے بطور دیباچہ آغاز داستان میں درج کر دیا ۔

اختصار پسندی فردوسی کا نمایاں وصف ہے ۔ دوسرے شعرا کی طرح وہ اپنے مضمون کو پھیلا کر بیان کرنا نہیں چاہتا ۔ یہ خصوصیت شاہنامے میں من اولہ الیٰ آخرہ مشاہدہ کی جاتی ہے ۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ داستان بیژن میں ہمارا شاعر خلاف معمول بعض موقعوں پر بلا ضرورت اپنے بیانات میں طوالت سے کام لیتا ہے ۔ مثلاً کیخسرو کے دربار کا بیان (صفحہ ۷۵۵) ، کیخسرو کا خط رستم کے نام جس میں غیر ضروری طور پر رستم کی مداحی کی گئی ہے (صفحہ ۷۷۸) اور رستم کی دعا کیخسرو کے حق میں (صفحہ ۷۸۴) ؛ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام داستان کے اندر طوالت کا انداز برتا گیا ہے جو اس کی روش مستمرہ سے بالکل مختلف ہے ۔

الف اشباع کا استعمال بہ تقلید عربی فردوسی سے ماسبق اساتذہ رودکی و دقیقی کے ہاں کثرت سے ملتا ہے ۔ دقیقی کے ہزار اشعار میں جو شاہنامے میں محفوظ ہیں کئی موقعوں پر نظر آتا ہے ۔ یہ الف بغرض تحسین کلام اسم اور فعل دونوں کے آخر میں لایا جاتا تھا ۔ مثلاً دقیقی کے یہ شعر :

پس از دختر نامور قیصرا
کہ ناهید بدنام آن دخترا
(صفحہ ۱۰۶۶ ، جلد سوم)

یکی چاره باید سگالیدنا
وگرنہ رہ ترک مالیدنا
(صفحہ ۱۰۸۶ ، جلد سوم)

داستان بیژن میں الف اشباع کی مثالیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک مقام کے یہ مسلسل ابیات :

بایوان افراسیاب اندرا
ابا ماهروی ببالین سرا
بہ پیچید بر خویشتن بیژنا
بیزدان پناهید ز اهرمنا
چنین گفت کای کردگارا مرا
رهایی نخواهد بدن زایدرا
(صفحہ ۷۶۳ ، جلد دوم)

اسی صفحے پر تین شعر چھوڑ کر یہ دو شعر بھی ملاحظہ ہوں :

بمردان ز هرگونہ کار آیدا
گہی بزم و گہ کارزار آیدا
نهادند هر دو بخوردن سرا
کہ هم دار بد پیش وهم منبرا

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے 'الف' کا استعمال داستان بیژن میں ۳۷ موقعوں پر ہوا ہے جو بجائے خود ایک قابل حیرت معاملہ ہے کیوں کہ باقی شاہنامے سے ایسے 'الف' کی مثالیں پندرہ سے زیادہ نہیں ملیں گی ، جن میں سے دس کے قریب داستان کیومرث اور دقیقی کے اشعار میں ہیں۔ اس سے یہی پایا

جاتا ہے کہ داستان بیژن شاہنامے سے بہت پہلے لکھی گئی ہے[1]
جب کہ فردوسی اپنا انداز خاص قائم نہیں کر چکا تھا۔

رزمیات میں فردوسی کا سکہ شاہنامے کی وجہ سے ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس صنف سخن میں شاہنامے کے علاوہ کوئی اور تصنیف اس کی طرف منسوب بھی نہیں۔ لیکن شاہنامے کے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی شاہنامے کی تصنیف کا مستقل ارادہ کرنے سے بیشتر رزمیہ شاعری کے لیے اپنے احباب میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کا ایک دوست شاہنامے کی نظم پر آمادہ کرنے کی غرض سے اسے یوں ترغیب دیتا ہے:

کشادہ زبان و جوانیت هست
سخن گفتن پہلوانیت هست

(صفحہ ۸، جلد اول)

(تم جوان اور طلیق‌اللسان ہو اور رزمیہ شعر خوب لکھتے ہو)

ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ شہرت فردوسی نے داستان بیژن کی بدولت حاصل کر لی تھی، جو اس زمانے سے قبل شائع ہو چکی تھی۔

میکن کا اعتقاد ہے کہ فردوسی کے بیانات بہ سلسلۂ مدت نظم شاہنامہ زیادہ تر سرسری اور بے سروپا ہیں مثلاً ایک مقام پر یہ زمانہ

۱۔ داستان بیژن کے زمانۂ تصنیف کی بابت ڈاکٹر صفا تحریر فرماتے ہیں:

”فردوسی ظاهراً و بنا بر آنچه از تحقیق در سبک کلام وی در داستان بیژن و گرازان بر میآید این داستان را در ایام جوانی ساخته بود۔ یکی از دلایل این مدعای ما استعمال الفهای اطلاق فراوانیست که علی التوالی و زیاده از حد لزوم درین داستان مشاهده میگردد و دلیل آنست که فردوسی چنان که در دیگر موارد شاهنامه دیده میشود هنوز بنهایت پختگی و مهارت خود نرسیده بود۔“
(تاریخ ادبیات در ایران، جلد اول، صفحه ۴۶۳-۴) ۔ مرتب

تیس سال بیان ہوا ہے ۔ دوسری جگہ پینتیس[1] سال کہا گیا ہے ۔ اس کے ذہن میں ذیل کے اشعار ہیں :

سی و پنج سال از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج
چو برباد دادند رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا
(صفحہ ۲۰۹۵ ، جلد چہارم)

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی
چو سی سال بردم بشہنامہ رنج
کہ شاہم ببخشد بپاداش گنج
(صفحہ ٦٥ ، جلد اول)

یہ اعتراض بہ ظاہر معقول ہے مگر صحیح نہیں کیوں کہ فردوسی اس تیس سال میں صرف مدت تصنیف شاہنامہ بیان کر رہا ہے لیکن جب پینتیس سال کہتا ہے تو اس میں داستان بیژن کا زمانہ بھی شامل کر لیتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ شاہنامے کی نظم کے مستقل ارادے سے پانچ سال پیشتر وہ داستان بیژن لکھ چکا ہے ۔ یہ مان کر کہ شاہنامہ اس نے ۳۷۰ھ[2] میں شروع کیا داستان بیژن کو ۳٦٥ھ کے گرد و پیش میں لکھا جانا چاہیے ۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ فردوسی دونوں مدتوں کے بیان کرنے میں حق بجانب ہے ۔

ان بعض وجوہ سے جو اوپر مذکور ہیں ہم ناظرین کو اس امر کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ داستان بیژن شاعر نے

---

۱ ۔ دیباچہ انگریزی ، صفحہ لط جلد اول (حاشیہ مصنف)
۲ ۔ شاہنامہ ۴۰۰ھ میں ختم ہوتا ہے ۔

محض اپنی اہلیہ کی فرمائش سے نظم کر دی تھی -

شاہنامے کی تصنیف

جب داستان بیژن نظم ہو کر شائع ہوئی ہے تو ایک دھوم مچ گئی ہوگی - دوست و احباب کی تحسین اور سخن شناسوں کی واہ واہ نے فردوسی کو آخرکار تمام شاہنامے کی نظم پر آمادہ کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص جسے شاعر 'مہربان دوست' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور فردوسی کا گہرا دوست بھی ہے کہتا ہے کہ تم ابھی جوان ہو اور خوش گفتار و شیریں کلام - اس کے علاوہ رزمیہ شاعری کا تم کو سلیقہ ہے - اس کتاب کو ضرور نظم کرو اور رؤسا کے ہاں اس کے ذریعے سے آبرو حاصل کرو ، کتاب میرے پاس موجود ہے ابھی لائے دیتا ہوں - یہ کہہ کر گیا اور کتاب لا کر فردوسی کے حوالے کر دی :

بشہرم یکی مہربان دوست بود
توگوئی کہ با من بیک پوست بود
مرا گفت خوب آمد این رای تو
بہ نیکی خرامد مگر پای تو
نوشتہ من این نامۂ پہلوی
بہ پیش تو آرم مگر نغنوی
کشادہ زبان و جوانیت ہست
سخن گفتن پہلوانیت ہست

۱ - جولائی ۱۹۲۱ع کے رسالہ 'اردو' اورنگ آباد میں میں نے داستان بیژن کی اولیت کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے - (حاشیۂ مصنف)

ملاحظہ ہو مضمون ''شاھنامے کی نظم کے اسباب اور زمانہ'' (مرتب)

شو این نامۂ خسروان باز گوی
بدین جوی نزد مہان آبروی
چو آورد این نامہ نزدیک من
بر افروخت این جان تاریک من
(صفحہ ۸ ، جلد اول)

فردوسی سے پہلے شاہنامے کی منازل کا دشت نورد دقیقی[۱] شاعر ہے جس کے متعلق فردوسی لکھتا ہے کہ دفتر پاستان کے یہ افسانے قصہ خوان عوام میں سناتے پھرتے تھے ۔ ان کی شہرت اس قدر عام تھی کہ دانا اور راست باز اصحاب بھی ان میں دلچسپی لیتے تھے ۔ یہ مقبولیت دیکھ کر ایک خوش طبع شاعر نے کہا کہ میں ان کو نظم کیے دیتا ہوں ۔ سامعین یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے ۔ یہ شاعر جوان تھا مگر بدچلن ۔ اس بدچلنی کے طفیل اس کی جان گئی اور ایک غلام کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ داستان گشتاسپ و ارجاسپ سے ابھی ایک ہزار شعر کہنے پایا تھا کہ اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا :

چو از دفتر این داستانہا بسی
ہمی خواند خواننده بر ہر کسی
جہان دل نہاده بدین داستان
ہمان بخردان و ہمان راستان
جوانی بیامد کشاده زبان
سخن گوی و خوش طبع و روشن روان

---

۱ ۔ دقیقی سے پیشتر کئی شاہنامے مروج تھے (۱) شاہنامۂ مسعودی ، جو منظوم تھا (۲) شاہنامۂ ابوالموید بلخی (۳) شاہنامۂ ابوعلی بلخی (۴) شاہنامۂ ابو منصوری ۔ تفصیل کے لیے دیکھو رسالہ 'کاوہ' سال دوم ، دورۂ جدید شمار ۱ و ۳ ۔ (حاشیۂ مصنف)

بنظم آرم این نامہ را گفت من
ازو شادمان شد دل انجمن
جوانیش را خوی بد یار بود
ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
برو تاختن کرد ناگاہ مرگ
نہادش بسر بر یکی تیرہ ترگ
بدان خوی بد جان شیرین بداد
نبود از جہان دلش یک روز شاد
یکایک ازو بخت برگشتہ شد
بدست یکی بندہ بر کشتہ شد
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتی ہزار
بگفت و سر آمد ورا روزگار
(صفحہ ۲ ، جلد اول)

دقیقی کے قتل کے اسباب پر اگرچہ فردوسی نے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن صاحب دیباچۂ قدیم نے اس پردہ کو اٹھا دیا ہے اور کہا ہے کہ:

”دقیقی مردی بود کہ غلامان را دوست میداشت چون از شاہنامہ یک چندی بنظم آورد ۔ اتفاق چنان اُوفتاد کہ غلامی ترک کہ در آن دو سہ روز خریدہ بود با وی لابہ می کرد و آن غلام کاردی بر شکم دقیقی زد و بدان زخم او را ہلاک کرد و این شاہنامہ ناتمام بماند“۔

فردوسی دقیقی کے کارنامے کی بابت اچھی رائے نہیں رکھتا ، نہ اس کے کمال کا معتقد ہے ۔ لیکن وہ بالکل حق بجانب ہے ، جب کہتا ہے:

سخن‌چون بدین گونہ بایدت‌گفت
مگوی و مکن رنج با طبع جفت

چو طبعی نداری چو آب روان
مبر دست زی نامۂ خسروان
دهان کہ بماند ز خوردن تہی
ازان بہ کہ ناساز خوانی نہی
(صفحہ ۱۱۰۴ ، جلد ثالث)

تاہم شاہنامے کے بارے میں وہ اس کو اپنا پھر تسلیم کرتا ہے اور اس کی مساعی کی داد دیتا ہے :

گرفتم بگوینده بر آفرین
کہ پیوند را راه داد اندرین
اگرچہ نہ پیوست جز اندکی
ز بزم و ز رزم از هزاران یکی
هم او بود گوینده را راهبر
کہ شاهی نشانید بر گاه بر
(صفحہ ۱۱۰۴ ، جلد ثالث)

شاہنامے کے لیے ذخیرہ فراہم کرنے کی نیت سے سب سے پہلے فردوسی نے بخارا کا سفر کیا جہاں اس کو 'دفتر پہلوی' یا شاہنامے کے کامل نسخے کی دستیابی کی امید تھی - چنان چہ دیباچہ :

دل روشن من چو بر گشت ازوی
سو تخت شاه جهان کرد روی
کہ این نامہ را دست پیش آورم
ز دفتر بگفتار خویش آورم
(صفحہ ۷ ، جلد اول)

اسی تلاش میں وہ مرو ، بلخ اور ہرات میں بھی جاتا ہے - ہرات میں وہ پیر خراسان ، ماخ سے ملتا ہے - یہ شخص سیاح اور جہاں دیدہ تھا - فردوسی نے اس سے داستان ہرمز حاصل کی ہے :

یکی پیر بد مرزبان هری
پسندیده و دیده از هر دری
جهان دیده و نام او بود ماخ
سخندان و با برگ و با برز و شاخ
بپرسیدمش تا چه دارد بیاد
ز هرمز که بنشست بر تخت داد
چنین گفت پیر خراسان که شاه
چو بنشست بر نامور پیشگاه
(صفحہ ۱۷۹۱ ، جلد ۴)

مرو میں احمد بن سہل کے ہاں آزاد سرو سے مل کر داستان شغاد کے واقعات معلوم کیے :

یکی پیر بد نامش آزاد سرو
که با احمد سہل بودی بمرو
کجا نامۂ خسروان داشتی
تن و پیکر پہلوان داشتی
دلی پر ز دانش سری پر سخن
زبان پر ز گفتار ہای کہن
بسام نریمان کشیدش نژاد
بسی داشتی رزم رستم بیاد
بگویم سخن آنچہ زو یافتم
سخن را یک اندر دگر بافتم
(صفحہ ۱۲۲۹ ، جلد ثالث)

بلخ میں کسی موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات دریافت کیے :

چنین یاد دارم ز موبد بہ بلخ
بخسرو چو شد این جہان تار و تلخ
(شاہنامہ نوشتہ ۷۵۲ ھ)

الغرض جہاں جہاں گیا اپنی تلاش و جستجو میں مصروف رہا اور جس جس سے ملا کچھ نہ کچھ معلوم کیا :

بپرسیدم از ہر کسی بیشمار
بترسیدم از گردش روزگار

(صفحہ ۷ ، جلد اول)

فردوسی کے عزم کے خلاف دو زبردست موانع تھے۔ اول عمر کی ناپائیداری ، دوسرے افلاس اور ناداری :

مگر خود درنگم نباشد بسی
بباید سپردن بدیگر کسی
و دیگر کہ گنجم وفادار نیست
ہمان رنج را کس خریدار نیست (صفحہ ۷)

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ فردوسی جو دیہ باژ کا رہنے والا تھا اس گاؤں میں سب سے متمول شخص تھا ۔ نظامی کے الفاظ ہیں :

"فردوسی در آن دیہ شوکتی تمام داشت چنانکہ بدخل آن ضیاع از امثال خود بی نیاز بود"۔

(چہار مقالہ ، صفحہ ۷۴)

لیکن شاہنامہ اس بیان کی تائید نہیں کرتا ۔ مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہی دست اور تنگ دست تھا اور اس کے مایحتاج کے برابر اس کی آمدنی نہیں تھی - چناں چہ شاہنامہ :

چنین سال بگذاشتم شصت و پنج
بدرویشی و زندگانی و رنج

(صفحہ ۹۰۳ ، جلد دوم)

دیگر

دوگوش و دو پای من آھو گرفت
تہی دستی و سال نیرو گرفت

(صفحہ ۱۲۲۹ ، جلد سوم)

دیگر

بجای عنانم عصا داد سال
پراگنده شد مال و برگشت حال

(صفحہ ۳۸۶ ، جلد اول)

دیگر

همی خورد باید کسی را کہ هست
منم تنگ دل تا شدم تنگ‌دست

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ہمارا شاعر غریب تھا اور اس کی گزر اوقات عسرت سے ہوتی تھی[1] حتی کہ مالیہ زمین کی ادائیگی کے لیے دوسروں سے درخواست کرتا ہے -

اس کے علاوہ وہ ایک پرآشوب زمانہ تھا - چاروں طرف

---

۱ - ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا ، نظامی عروضی اور خود فردوسی کے بیانات کو تطبیق دیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فردوسی جوانی میں خوشحال تھا لیکن شاہنامے پر مصروف ہونے کے بعد رفتہ رفتہ مفلسی کا شکار ہوگیا - چناں چہ :

''فردوسی خود هم برفاه حال و سعهٔ عیش خود در جوانی اشاره کرده و گفتہ است :

الا ای بر آورده چرخ بلند
چہ داری بپیری مرا مستمند
چو بودم جوان برترم داشتی
بہ پیری مرا خوار بگذاشتی
بجای عنانم عصا داد سال
پراگنده شد مال و برگشت حال

اما چنان‌کہ از همین ابیات و ابیات متعدد دیگر شاهنامه بخوبی بر می آید شاعر استاد بر اثر توجه بشاهنامه ثروت خود را از دست داد و در پیری تہی‌دست شد''۔

(حماسہ سرایی در ایران ،گفتار سوم ، حاشیہ صفحہ ۶۶-۱۶۵) مرتب -

جنگ و فساد کی آتش برپا تھی جس کی وجہ سے مسافروں کو آمدورفت میں بہت تکلیف ہوتی تھی انسان آزادی کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا تھا :

زمانہ سرای پُر از جنگ بود
بجویندگان بر جہان تنگ بود

نوح بن منصور (۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ) کا زمانہ طاقت ور آمراء کی بغاوت و سرکشی کے لیے مشہور ہے جس میں سیمجوریوں کی مخالفت سرزمین خراسان میں عرصے تک قائم رہی ہے اور ۳۸۴ھ تک ختم نہیں ہوئی - لیکن جب کوئی کام ہونے والا ہوتا ہے تو خدا غیب سے اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے - فردوسی کو ایک ایسے قدردان سرپرست کی ضرورت تھی جو اسے دغدغۂ معاش کی طرف سے فارغ البال کر دے چناں چہ یہ مربی بھی مل گیا - ہمارا شاعر اس کا نام بیان نہیں کرتا اور صرف 'مہتر گردن فراز' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اس کے متعلق لکھتا ہے :

بدین نامہ چون دست کردم دراز
یکی مہتری بود گردن فراز
جوان بود و از گوہر پہلوان
خردمند و بیدار و روشن روان
خداوند رای و خداوند شرم
سخن گفتن خوب و آوای نرم
مرا گفت کز من چہ آید ھمی
کہ جانت سخن بر گراید ھمی
بچیزی کہ باشد مرا دسترس
بکوشم نیازت نیارم بکس
ھمی داشتم چون یکی تازہ سیب
کہ از باد ناید بمن بر نہیب

بکیوان رسیدم ز خاک نژند
ازان نیک‌دل نامور ارجمند
بچشمش همان خاک وهم سیم و زر
کریمی بدو یافته زیب و فر
(صفحہ ۸)

بدقسمتی دیکھیے کہ یہ رئیس جب کہ شاہنامہ اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اس جہان فانی سے رحلت کر گیا۔ اس کی وفات نے ہمارے شاعر کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ دردناک الفاظ میں اس کا مرثیہ قلم بند کرتا ہے:

چنان نامور گم شد از انجمن
چو از باد سرو سهی در چمن[1]
دریغ آن کمر بند و آن گردگاه
دریغ آن کئی برز و بالای شاه
نه زو زنده بینم نه مرده نشان
بدشتِ نهنگان مردم کشان

---

۱ - ذبیح اللہ صفا اس مصرع کو "چو در باغ سرو سهی از چمن" لکھتے ہیں جو تشبیہہ کی مناسبت سے تشنہ نظر آتا ہے۔ البتہ ان کا یہ کہنا کہ:
"این مرد که بفحوای بیت اخیر: (چنان نامور گم‌شد......الخ) و ابیات بعد بوضع نامعلومی نا پدید شد......"
بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے اور مصرع:
نهِ زو زنده بینم نه مرده نشان
اس دعوے کا صریحی ثبوت فراہم کرتا ہے۔
(دیکھیے 'تاریخ ادبیات در ایران، باب دوم، فصل چہارم، صفحہ ۳۶۸) - مرتب

گرفتار دل زو شده نا امید
روان لرز لرزان بکردار بید
ستم باد بر جان آن ماه و سال
کجا بر تن شاه شد بد سگال
(صفحہ ۸ ، جلد اول)

اسی امیر نے فردوسی کو مشورہ دیا تھا کہ جب یہ کتاب ختم ہو جائے تو اسے کسی بادشاہ کی طرف منسوب کرنا :

یکی پند آن شاه یاد آورم
ز کژی روان سوی داد آورم
مرا گفت کاین نامۂ شہریار
اگر گفتہ آید بشاهی سپار
(صفحہ ۸ ، جلد اول)

یہ رئیس خواہ منصور[1] بن محمد ہو یا کوئی اور ، اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق سیہجوریوں سے تھا کیوں کہ طوس ان ایام میں انھی کے قبضے میں تھا اور یہی وجہ ہے کہ فردوسی نے اس کا نام ، جب شاہنامہ سلطان محمود کی طرف منسوب کیا ، شاہنامے سے دانستہ خارج کر دیا ۔

الغرض کچھ ایسے اسباب اور واقعات تھے جنھوں نے فردوسی کو اس عظیم‌الشان کام پر بالآخر آمادہ کر دیا ۔ اس کے لیے یہ زمانہ نہایت مبارک تھا اور مستقبل خوش آیند امیدوں سے معمور تھا ۔

۱ ۔ ڈاکٹر صفا 'تاریخ ادبیات در ایران' میں تحریر فرماتے ہیں :
"در عناوین نسخ معمول شاهنامہ این امیر را منصور یا ابومنصور یا ابومنصور عبدالرزاق نگاشتہ اند ولی پیداست کہ این قول باطلست زیرا میان آغاز شاهنامہ و وفات ابو منصور محمد بن‌عبدالرزاق نزدیک بیست سال فاصلہ بود"۔
(باب دوم ، فصل چہارم ، صفحہ ۳٦۷) ۔ مرتب

جب وہ اپنی عمر کے شصت سالہ مرحلے پر پہنچا ہے ، اطمینان اور فارغ البالی اس سے کنارہ کش تھے ۔ شاعر اپنے ماضی پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اس زمانے کو خوش فال اور مبارک مانتا ہے ۔ گویا شاہنامے کے آغاز کا زمانہ اس کی زندگی کا گل و گلزار تھا اور وہ ایک حسرت کے ساتھ گویا ہے :

چل و ہشت بد عہد نوشیروان
تو بر شصت رفتی نمانی جوان
(صفحہ ۱۶۱۸ ، جلد سوم)

جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے جب شاہنامے کی تصنیف کا تہیہ کیا ہے اس وقت اس کی عمر اڑتالیس سال کی تھی[1]۔ چونکہ شاہنامہ ۴۰۰ ھ میں ختم ہوتا ہے اور مدت تصنیف شاہنامہ تیس سال ہے اس لیے سال آغاز شاہنامہ ۳۷۰ھ قرار پاتا ہے ۔

شاہنامہ کے راویوں میں دو شخص بالعموم پائے جاتے ہیں ۔ ایک کوئی دہقان ہے اور دوسرا کوئی موبد ۔ حالاں کہ بیسیوں مقامات پر اس دہقان کی طرف اور متعدد موقعوں پر موبد کی طرف داستانوں کے آغاز میں تلمیح کی جاتی ہے لیکن کسی موقع پر بھی ان کا نام نہیں لیا جاتا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'نامۂ خسروان' کا راوی کوئی دہقان ہے اور دہقان کی سند موبد ہے مثلاً داستان سہراب کی ابتدا میں فردوسی کہتا ہے :

ز گفتار دھقان یکی داستان
بپیوندم از گفتۂ پاستان
ز موبد بدان گونہ برداشت یاد
کہ رستم بر آراست از بامداد
(صفحہ ۳۱۶ ، جلد اول)

---

۱ ۔ اس شعر سے متعلق مصنف کا حاشیہ مضمون ''شاہنامے کی نظم کے اسباب اور زمانہ'' کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں ۔ (مرتب)

داستان سیاوش کی تمہید میں بھی یہی بیان شاعر دہرا رہا ہے :

بگفتار دهقان کنون باز گرد
نگر تا چه گوید سراینده مرد

چنین گفت موبد که یک روز طوس
بدانگه که خیزد خروش خروس

(صفحہ ۳۷۸ ، جلد اول)

داستان شغاد تک تمام داستانیں دہقان سے مروی ہیں ۔ صرف داستان شغاد کا راوی آزاد سرو ہے ۔ اس کے بعد پھر وہی دہقانی سلسلہ شروع ہوتا ہے ۔ داستان سکندر پر اس سلسلے میں انقطاع آتا ہے ۔ سکندر کے حالات شاہنامہ میں زیادہ تر مسلمانی روایات کے مطابق ہیں جو کسی پہلوی نسخے سے منقول نہیں ہو سکتے ۔ مجوسیوں کے ملعون و مردود اسکندر اور فردوسی کے اسکندر میں بہت فرق ہے : لیکن فردوسی اس داستان کے راوی کا ذکر نہیں کرتا ۔

اشکانیوں کے حالات کے لیے ایک دہقان چاچی کا ذکر کیا ہے :

چنین گفت گوینده دهقان چاچ
کزین پس کسی را نبد تخت و تاج

(صفحہ ۱۳۶۴ ، جلد ثالث)

داستان اردشیر سے پھر وہی قدیمی سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور داستان شطرنج تک جو نوشیروان کے حالات میں آتی ہے یہ سلسلہ قائم رہتا ہے ۔ اس داستان کے راوی کا نام شاہوی پیر ہے :

چنین گفت فرزانه شاهوی پیر
ز شاهوی پیر این سخن یادگیر

(صفحہ ۱۷۲۶ ، جلد چہارم)

داستان مابعد ”فرستادن نوشیروان برزوی پزشک را بهندوستان برای آوردن داروی شگفت“ (صفحہ ۱۷۴۶) شادان بن برزین سے منقول ہے ۔ آئندہ داستان : ”پرسش موبدان از نوشیروان و پاسخ آن“۔

کا کوئی نیا راوی ہے - شاعر کہتا ہے :

یکی پیر بد پہلوانی سخن
بگفتار و کردار گشتہ کہن
چنان گوید از دفتر پہلوان
کہ پرسید موبد ز نوشیروان

(صفحہ ۱۷۶۶ ، جلد چہارم)

داستان ہرمز پیر خراسان یعنی ماخ سے مروی ہے -

اس مشاہدے سے ہمیں اس قدر معلوم ہوا کہ شاہنامے کی اکثر داستانیں دہقان سے مروی ہیں جو اپنی باری میں موبد کی سند سے نقل کرتا ہے - یہ دہقان کون ہے ، فردوسی اس کے نام سے ہم کو اطلاع نہیں دیتا - البتہ شاعر دیباچےمیں ایک دہقان نژاد پہلوان کا ذکر کرتا ہے جس نے موبدوں کو جمع کرکے نامۂ خسروان کو فراہم کیا تھا :

یکی پہلوان بود دھقان نژاد
دلیر و بزرگ و خرد مند و راد
پژوھندۂ روزگار نخست
گذشتہ سخنہا ھمہ باز جست
ز ھرکشوری موبدی سال خورد
بیاورد و این نامہ را گرد کرد

(صفحہ ٦ ، جلد اول)

دیباچۂ قدیم اس سلسلے میں مزید روشنی ڈالتا ہے - دیباچے کی رو سے یہ دہقان ابومنصور بن عبدالرزاق بن عبداللہ بن فرخ ہے ، جس کے حکم سے اس کے وزیر ابومنصور المعمری نے خراسان کے مختلف شہروں سے تاریخ دان اصحاب کو بلا کر ان کے بیانات و روایات پر ٣٤٦ھ میں شاہنامے کی بنیاد رکھی - دیباچے کے الفاظ ہیں :

"ابو منصور عبدالرزاق مردی بود با فرو خوش کام و
بزرگ اندر کام روائی و با دستگاهی تمام از بادشاهی و
اندیشهٔ بلند داشت و بگوهر از تخم گردان ایران بود . .
. . . از روزگار آرزو کرد تا او را نیز یادگاری بماند درین
جهان - پس دستور خویش ابو منصور المعمری را بفرمود
تا خداوندان کتب را نامه کرد و کس فرستاد از دهقان و
فرزانگان و جهان دیدگان از شهرها بیاوردند و چاکر او
ابو منصور المعمری را بفرمود تا نامه کرد و کس
فرستاد بشهرهای خراسان و هشیاران را آنجا بیاورد
از هر جای چون شاخ (ماخ) پسر خانی ؟ از هرات
و چون یزدان داد پسر شاپور از سیستان و ماهوی
خورشید پسر بهرام از شاپور و شاذان پسر برزین از طوس
و بنشاند بفرا آوردن [این نامه های شاهان و کارنامهای
شان (و) زندگانی هر یکی و داد و بیداد و آشوب و جنگ
و آئین از نخستین کیومرث[1]] که اندر جهان آمد او بود
که آئین مردی آورد و مردمان از جانوران پدید کرد تا
یزدگرد که آخر ملوک کیان بود اندر ماه محرم که سال بر
سی صد و چهل و شش از هجرت خواجه دنیلی و عقبلی
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ، و این را شاهنامه
نام نهاد -"

ابومنصور کے شاہنامے کے بعض مدونین سے خود فردوسی نے ملاقات کی ہے مثلاً ماخ سے ہرات میں ملا ہے اور داستان ہرمز اس کی روایت پر لکھی ہے :

۱ - از رسالهٔ اردو ، بابت اپریل ۱۹۲۷ء ، صفحه ۳۱۰ -

بپرسیدمش تا چه دارد بیاد
ز هرمز که بنشست بر تخت داد
(صفحه ۱۷۹۱ ، جلد چہارم)

فردوسی شادان پسر برزین سے بھی واقف ہے :
نگہ کن کہ شادان برزین چہ گفت
بدانگہ کہ بکشاد راز از نہفت
(صفحہ ۱۷۳۶ ، جلد چہارم)

دیباچے کا 'ماہوی' اور فردوسی کا 'شاہوی' اگر ایک ہی شخص ہیں تو فردوسی شاہنامۂ ابومنصوری کے تیسرے مرتب سے بھی واقف ہے ۔ تاہم وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کا دہقان اور دیباچۂ قدیم کا ابومنصور بن عبدالرزاق ایک ہی شخص ہیں ۔ فردوسی کے سامنے جو شاہنامہ یا نامۂ خسرواں ہے ، ایک ایسی تصنیف ہے جو موبد کے حوالے سے کسی دہقان نے تالیف کی ہے ۔ وہ اسے فسانۂ کہن اور دو ہزار سال قدیم بتاتا ہے ۔ چناں چہ :

یکی نامہ دیدم پر از داستان
سخنہای آن پر منش راستان
فسانہ کہن بود و منثور بود
طبایع ز پیوند او دور بود
گذشتہ برو سالیان دو ہزار
گر ایدونکہ برتر نیاید شمار
(صفحہ ۱۱۰۴ ، جلد سوم)

فردوسی نے جب اس صحرائے لق و دق یعنی شاہنامے کی تصنیف پر قلم اٹھایا ہے تو اس کی حیثیت بعینہٖ اس مسافر کی سی ہو گئی ہے جس کو ایک لمبا سفر درپیش ہے ۔ وہ ہر منزل پر شام کے وقت پہنچ کر قیام کرتا ہے اور رات بھر آرام کرکے صبح ہوتے ہی اپنی راہ لیتا ہے ۔ جب دن کو ہم آ کر دیکھتے ہیں تو اس

مسافر کے شب باشی کے مقام پر ایسے آثار اور سراغ ملتے ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ کوئی مسافر یہاں رات بھر ٹھہرا تھا - یہی کیفیت فردوسی کی ہے - اس کی داستانیں اس کی منزلیں ہیں اور ان کی ابتدا اور اختتام اس کا مقام شب باشی ہے - ان موقعوں پر ہمارا شاعر ایسے آثار بہت چھوڑ گیا ہے جن سے ہم اس کے حالات و خیالات ، طبیعت و مذاق کا خاطر خواہ اندازہ کر سکتے ہیں - ابتدائی منازل چنداں کٹھن نہیں ہیں - انھیں وہ آرام اور آسانی کے ساتھ طے کرتا چلا جاتا ہے لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے اس کا اضطراب یہ لمبا سفر ختم کرنے کے لیے زیادہ بڑھتا جاتا ہے - وہ عجلت میں ہے - اپنی خستگی اور تکان کی مطلق پروا نہیں کرتا اور بار بار یہی اندیشہ کر رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاہنامے کا سفر ختم نہ ہو اور سفر آخرت کا پیام آ جائے - وہ دعا میں مصروف ہے کہ موت اتنی مہلت دے دے کہ میں اس کتاب کو ختم کر دوں :

همی خواهم از دادگر یک خدای
که چندان بمانم بگیتی بجای
که این نامه شهریاران پیش
به پیوندم از خوب گفتار خویش
ازان پس تن بی هنر خاک راست
سخن گوی جان معدن پاک راست

(صفحہ ۱۰۶۴ ، جلد دوم)

پیشتر اس کے کہ ہم آگے بڑھیں یہاں یہ گزارش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامے کی داستانیں موجودہ ترتیب میں نظم نہیں کی ہیں بلکہ مختلف موقعوں پر مختلف داستانیں نظم کرکے بعد میں انھیں موجودہ یا تاریخی ترتیب میں منسلک کردیا ہے - یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شاہنامے کی نظمیں تین دوروں میں منقسم کی جا سکتی ہیں - پہلا طوسی دور - اس سے مراد

وہ بیس یا اٹھارہ سال کا زمانہ ہے جو فردوسی نے غزنیں پہنچنے سے بیشتر طوس میں شاہنامے پر صرف کیا ۔ اس مدت میں وہ موجودہ چار جلدوں سے تخمیناً ڈھائی یا پونے تین جلد کا مواد نظم کر چکا تھا ۔ دوسرا غزنوی دور ہے جس میں وہ ایک جلد یا اس سے کچھ زیادہ نظم کر چکتا ہے ۔ غزنیں میں کم از کم اس کا قیام چھ سال تک رہتا ہے ۔ اس کے بعد سلطان سے مایوس ہو کر وہ غزنیں سے رخصت ہو جاتا ہے ۔ اب ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ، جس میں فردوسی شاہنامے کا بقیہ حصہ نظم کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہے ۔ اس دور میں اس کا سر پرست و کفیل ، حسین بن قتیب یا 'حیی قتیب' باختلاف روایت ہے ۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ زمانہ اس نے کہاں بسر کیا ، طوس میں یا کہیں اور لیکن گمان غالب یہی ہے کہ طوس میں ۔

طوس میں فردوسی نے جو بیس یا اٹھارہ سال کا زمانہ گزارا ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہایت فراغت اور اطمینان سے بسر کیا ہے اور جو داستانیں اس دور میں لکھی گئی ہیں زور اور جوش میں بے مثال ہیں مثلاً داستان زال ، داستان سہراب ۔ غزنیں کے قیام کا زمانہ اگرچہ دربار شاہی میں گزرا ہے اور سلطان سے شاعر کے تعلقات بھی اچھے ہیں ، فردوسی کے لیے فارغ البالی کا زمانہ نہیں ہے ۔ اس عہد کی نظمیں طوسی دور کی نظموں کو نہیں پہنچتیں ۔ تاہم اس دور میں اس کو بے حد محنت کرنی پڑی ہے اور چھ سال کے عرصے میں ایک چوتھائی سے زیادہ شاہنامہ نظم کر ڈالا ہے ۔ داستان رستم و اسفند یار اس عہد کی شاعری کی بہترین مثال ہے ۔ طوسی اور غزنوی دور کے کلام کی شناخت کے لیے ہمارے پاس یہ معیار ہے کہ ایک میں سلطان محمود کی مدح موجود ہے اور ایک میں نہیں ہے ۔ اگرچہ بعض ایسی داستانیں بھی ہیں جن میں شاعر نے نظر ثانی کرتے وقت محمود کی مدح میں ایک دو بیت اضافہ کر دیے ہیں ۔

طوسی دور کی نظمیں

کیومرث کی داستان سے ابتدا کرکے ضحاک کی فریدون کے ہاتھ سے گرفتاری کے موقع پر ایک داستان ختم ہو جاتی ہے - خاتمے میں شاعر غالباً اپنے سرپرست ابومنصور محمد بن عبدالرزاق کو خطاب کرکے کہتا ہے :

بیا تا جهان را ببد نسپریم
بکوشش همه دست نیکی بریم
نباشد همی نیک و بد پایدار
همان به که نیکی بود یادگار
همان گنج و دینار و کاخ بلند
نخواهد بدن مر ترا سود مند
سخن ماند از تو همی یادگار
سخن را چنین خوار مایه مدار
فریدون فرخ فرشته نبود
زمشک و ز عنبر سرشته نبود
بداد و دهش یافت آن نیکوئی
تو داد و دهش کن فریدون توئی
فریدون ز کاری که کرد ایزدی
نخست این جهانرا بشست از بدی
نگه کن کجا آفریدون گرد
که از پیر ضحاک شاهی ببرد
ببد در جهان پنج صد سال شاه
بآخر شد و ماند ازو جایگاه
برفت و جهان دیگری را سپرد
بجز حسرت از دهر چیزی نبرد

چنینیم یکسر کہ و مہ ہمہ
تو خواہی‌شبان‌باش و خواہی‌رمہ
(صفحہ ۳۷-۳۶ ، جلد اول)

اس کے بعد ہمارا مسافر فریدوں کی وفات کے موقع پر ٹھنڈی سانس بھر کر دنیا کو خطاب کرکے گویا ہے :

جہانا سراسر فسوسی و باد
بتو نیست مرد خردمند شاد
بکردارهای تو چون بنگرم
فسوس است و بازی نماید برم
یکایک همی پروری شان بناز
چه کوتاه عمر و چه عمر دراز
چو مرداده را باز خواهی ستد
چه غم گر بود خاک آن گر بسد
اگر شهر یاری و گر زیردست
چو ازتو جهان‌این نفس راگسست
همه درد و خوشی‌او شد چو آب[1]
بجاوید ماندن دلت را متاب
خنک آن کزو نیکوئی یادگار
بماند اگر بنده گر شهریار
(صفحہ ۴۹ ، جلد اول)

اس وقفے کے بعد منوچہر کے حالات شروع ہوتے ہیں ۔ اس کی وفات یوں بیان ہوئی ہے :

---

۱ - شاہ نامہ طبع طہران میں :
همه درد و خوشی تو شد چو خواب
(شاہنامہ ، مطبوعہ طہران ، ۱۳۱۲ شمسی ، جلد اول ، صفحہ ۱۰۳)
مرتب

ابی آنکہ بد هیچ بیماری
نہ از دردها هیچ آزاری
دو چشم کیانی بہم برنهاد
بپژمرد و بر زد یکی سرد باد
شد آن نامور پر هنر شهریار
بہ گیتی سخن ماند ازو یادگار[1]
(صفحہ ۱۷٦ ، جلد اول)

اس کے بعد شاعر یوں پند آموزی کر رہا ہے :

یکی پند گویم ترا از نخست
دل از مهر گیتی ببایدت شست
جهان کشت زاریست با رنگ و بوی
درو مرگ و عمر آب و ما کشت اوی
چنان چون درو راست همواره گشت
همہ مرگ را ایم ما خوب و زشت
بجائیم همواره تا زان براه
بدین دو نوند سپید و سیاه
چنان کاروانی کزین شهر بر
بود شان گذر سوی شهر دگر
یکی پیش و دیگر ز پس مانده باز
بنوبت رسیده بمنزل فراز
بیا تا نداریم دل را برنج
کہ با کس نسازد سرای سپنج
(صفحہ ٦ - ۱۷۷ ، جلد اول)

درمیان کے پانچ شعر فردوسی کے رنگ میں نہیں ہیں ، اسدی

---

۱ - طهران کے مطبوعہ شاہ نامے میں یہ شعر دستیاب نہیں ہوا ۔
(مرتب)

طوسی کے معلوم ہوتے ہیں اور 'گرشاسپ نامہ' سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں میکن نے ان کو یہاں کیوں داخل کر دیا۔

نوذر کے حالات سے جو داستان چلتی ہے، کیقباد کی وفات پر ختم ہوتی ہے۔ کیکاؤس ایرانی تاریخ میں ایک خود سر اور خفیف الحرکات پادشاہ مشہور ہے، چناں چہ فردوسی نے اس کی داستان کی تمہید میں ایسے خیالات ظاہر کیے ہیں جو ایک لائق باپ کے ناخلف جانشین کے حق میں موزوں ہوں:

اگر شاخ بد خیزد از بیخ نیک
تو با بیخ تندی میاغاز ریک
پدر چون بفرزند ماند جہان
کند آشکارا برو، گر نہان[1]
گر او بفگند فر و نام پدر
تو بیگانہ خوانش مخوانش پسر
اگر گم کند راہ آموزگار
سزد گر سزا بیند از روزگار[2]
(صفحہ ۲۳۰)

یہ داستان عقابوں کے ذریعے سے کیکاؤس کی ایک ناکام ہوابازانہ آزمائش پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے آخر میں شاعر اپنی شصت سالہ عمر کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

مرا عمر بر شصت شد سالیان
برنج و بسختی بہ بستم میان

---

۱ ۔ کند آشکارا برو بر نہان (طبع طہران) جلد اول، صفحہ ۲۵۱ ۔ (مرتب)

۲ ۔ سزد گر جفا بیند از روزگار (طبع طہران) ۔ جلد اول، صفحہ ۲۵۱ ۔ (مرتب)

که رفتن آمد بدیگر سرای
مگر لزد یزدان به آیدم جای
(صفحه ۳۲۰)

تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اشعار بالا سے چند شعر پہلے فردوسی ایک شعر میں سلطان محمود کا نام لیتا ہے ، حالانکہ داستان کیکاؤس صریحاً طوسی دور سے تعلق رکھتی ہے ، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزنیں میں شاہنامے پر نظر ثانی کرتے وقت اتفاقیہ یہ شعر اضافہ کر دیا ۔ و ہو ہذا :

گر اکنون بدی بندگی را کمر
به بستی بر شاه محمود بر
(صفحہ ۳۰۲ ، جلد اول)

آینده داستان 'نخچیر کردن رستم باهفت پہلوان درشکارگاہ افراسیاب' ہے ۔ اس سے اگلی داستان سہراب ہے جو فردوسی کی مشہور داستانوں میں سے ہے ۔ سہراب کے الم انگیز انجام کے مطابق شاعر نے اپنی تمہید رقم کی ہے اور پیر و برنا کے لیے موت کی واجبیت کے مسئلے کو مثالیہ طریقے پر یوں شروع کیا ہے :

"اگر آندھی ترنج خام کسی درخت سے گرا دے تو اس فعل کو داد کہا جائے یا بیداد ، اچھا کہا جائے یا برا۔ اگر اس کو انصاف کہا جاتا ہے تو پھر ظلم کیا ہے اور جب داد مان لیا ہے تو فریاد و زاری کیسی ۔ پھر کہتا ہے چوں کہ انسان بالطبع طامع اور حریص واقع ہوا ہے اس لیے یہ خدائی راز اس پر نہیں کھولا گیا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سفر موت میں ہماری بہبود مضمر ہو ، جب ہم دوسری دنیا میں پہنچ جائیں ۔ ساتھ ہی فلسفیانہ رنگ میں کہتا ہے کہ اگر موت ہم کو اپنے گھاٹ نہ اتارتی تو زمین پر جوانوں اور بوڑھوں کی کثرت ہو جاتی ۔ اب موت کو آگ سے تمثیل دے کر گویا ہے کہ آگ کا کام جلانا ہے ۔ اس کو خشک و تر کی پروا نہیں ۔

اسی طرح موت کو بوڑھے اور جوان کا کوئی پاس نہیں ۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہے ، جو اس کی زد میں آ جائے ۔ اس لیے جوانوں کو اپنی جوانی پر شادماں ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ بڑھاپا موت کا اصلی محرک نہیں ہے جیسا کہ عسجدی کہتا ہے :

گر بہ جوانی و بہ پیریستی
پیر بمردی و جوان زیستی

اس جہان گزران میں جب کسی کو موت آئے خواہ جوان ہو یا بوڑھا ، ہم کو ماننا چاہیے کہ وہ انصاف ہے اور جب ہم نے اس کو انصاف تسلیم کر لیا ہے تو یہ تمام گریہ و بکا اور نوحہ و شیون عبث ہے ۔ کہتا ہے کہ اگر دین میں خلل آنا نہیں چاہتے تو پیری اور جوانی کو موت کے سامنے برابر جانو ۔ ایسے موقعوں پر فردوسی کے نزدیک صاحب ایمان کے لیے خاموشی ہی بہتر ہے ۔ اصل یہ ہے کہ یہ معاملات خدائی راز ہیں ۔ ہماری کوشش بس یہ ہونی چاہیے کہ عجز و نیاز کے ساتھ خداے پاک کی پرستش کریں اور اپنے آخری وقت اور دم باز پسیں کے لیے ہر وقت مستعد رہیں اور خدا سے توفیق چاہیں کہ دین اسلام پر ہمارا خاتمہ ہو :

اگر تند بادی بر آید ز کنج
بخاک افگند نا رسیده ترنج
ستمگاره خوانیمش ار دادگر
هنرمند گوییمش ار بی هنر
اگر مرگ دادست بیداد چیست
ز داد این همه بانگ و فریاد چیست
ازین راز جان تو آگاه نیست
بدین پرده اندر ترا راه نیست
همه تا در آز رفته فراز
بکس وا نشد این در آز باز

برفتن مگر بهتر آیدت جای
چو آرام گیری بدیگر سرای
اگر مرگ کس را نیوباردی
ز پیر و جوان خاک بسپاردی[1]
اگر آتشی گاه افروختن
بسوزد عجب نیست زو سوختن
بسوزد چو در سوزش آید درست
چو شاخ نو از بیخ کهنه برست
دم مرگ چون آتش هولناک
ندارد ز برنا و فرتوت باک
جوان را چه باید بگیتی طرب
که نی مرگ را هست پیری سبب
درین جای رفتن نه جای درنگ
بر اسپ قضا گرکشد مرگ تنگ
چنان دان که داداست وبیداد نیست
چو داد آمدش بانگ وفریاد چیست
جوانی و پیری بنزد اجل
یکی دان چو در دین نخواهی خلل
دل از نور ایمان گر آگنده ای
ترا خامشی به که تو بنده ای
پرستش همان پیشه کن با نیاز
همه کار روز پسین را بساز

۱ - طہران کے مطبوعہ شاہ نامے میں اس شعر کے بعد ایک اور شعر ہے - و ہو ہذا :

نخستین بدل مرگ بستایدی
دلیر و جوان خاک بسپاودی
(مرتب)

برین کار یزدان ترا راز نیست
اگر دیو با جانت انباز نیست
بگیتی در آن کوش چون بگذری
سر انجام اسلام با خود بری
(صفحہ ۱۷ - ۳۱۶)

اس کے بعد ہم داستان سیاؤش سے دوچار ہوتے ہیں ۔ اس کے آغاز میں فردوسی لکھتا ہے :

ز گفتار دهقان کنون داستان
بہ پیوندم از گفتۂ باستان[1]
کہن گشتہ این داستانها زمن
همی نو شود بر سر انجمن
اگر زندگانی بود دیر باز
بدین دیر خرم بمانم دراز
یکی میوه داری بماند زمن
کہ ماند همی بار او بر چمن
(صفحہ ۳۷۸)

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ فردوسی نے شاہنامے کی تصنیف محض بقائے نام کے لیے اپنے ہاتھ میں لی ہے ۔ دوسرے موقعوں پر بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے ۔ داستان سیاؤش کی ترقیم کے وقت شاعر اپنی عمر کا اٹھاونواں سال طے کر رہا تھا ۔ اسی سال اس کی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے ، جس کے متعلق صریح ایما کسی دوسرے موقع پر کرتا ہے :

۱ - طبع طہران میں :
تو بر خوان و بر گوی بر راستان
(جلد اول ، صفحہ ۲۱۱) -
(مرتب)

ازان پس که بنمود پنجاه و هشت
بسر بر فراوان شگفتی گذشت
همی آز کمتر نه گردد بسال
همی روز جویم بتقویم و فال
چه گفت اندرین موبد پیش رو
که هرگز نه گردد کہن گشته نو
تو چندانکه باشی سخن گوی باش
خردمند باش و جہانجوی باش
چو رفتی سروکار با ایزد است
اگر نیک با شدت کار ار بداست
(صفحہ ۳۷۸ ، جلد اول)

داستان سیاؤش کا دوسرا حصہ 'ساختن سیاؤش کنگ دژ' سے شروع ہوتا ہے ، جس میں حمد و نعت موجود ہے :

بدو آفرین کو جہان آفرید
ابا آشکار و نہان آفرید
خداوند دارندۂ ہست و نیست
همه چیز جفتست و ایزد یکی‌است
به پیغمبرش بر کنم آفرین
بیارانش بر هر یکی هم چنین
(صفحہ ۴۴۳ ، جلد اول)

حمد و نعت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس داستان سے نئی جلد شروع کی ہے :

چو گیتی تہی ماند از راستان
تو ایدر ببودن مزن داستان
کجا آن سر و تاج شاهنشہان
کجا آن دلاور گرامی مہان

کجا آن حکیمان دانندگان
همان رنج بردار خوانندگان
همه خاک دارند بالین و خشت
خنک آنکه جز تخم نیکی نکشت
جهان سر بسر حکمت و عبرت است
چرا بهرهٔ ما همه غفلت است
چو شد سال بر شصت و شش چاره جوی
ز بیشی و از رنج برتاب روی
تو رفتی و گیتی بماند دراز
کجا آشکارا بدانیش راز
چو زان نامداران جهان شد تهی
تو تاج فزونی چرا بر نهی
بدانگه که اندر جهان داد بود
از ایشان جهان یکسر آباد بود
چه برداشتند از جهان فراخ
از آن گنج و آن تاج و ایوان و کاخ
(صفحہ ۴۴۴)

فردوسی چھیاسٹھویں سال میں غزنیں پہنچ جاتا ہے اور یہ داستان صریحاً طوسی دور سے علاقہ رکھتی ہے ۔ اس سے خیال ہوا کہ مصرع :

"چو شد سال بر شصت و شش چاره جوی"

میں کوئی غلطی ہو ۔

شاہ نامے کی نظم کے اسباب اور زمانہ

(زیر نظر مضمون رسالہ ''اردو'' اورنگ آباد کے جولائی ۱۹۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ بعد ازاں مصنف کی تجدید نظر کے بعد ''فردوسی پر چار مقالے'' میں شامل کیا گیا جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ۔ مرتب)

''بڑے کاموں کی ابتدا چھوٹی باتوں سے ہوا کرتی ہے ۔'' یہ انگریزی مثل ہمیں شاہ نامے کی نظم کے اسباب قلمی کرتے وقت بے اختیار یاد آ جاتی ہے ۔ ایک اندھیری رات فردوسی کے نیند نہ آنے کے واقعے کو دیکھو اور ادھر شاہ نامے کی چار ضخیم جلدوں کا مع ساٹھ ہزار اشعار کے خیال کرو ، جن پر اس نے اپنی عمر کے تیس پینتیس سال صرف کیے۔ شاہ نامے کی نظم فارسی زبان اور شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت عظیم الشان واقعہ ہے ۔ اتنے بڑے واقعے کا ایک رات کی کچھ دیر کی بے خوابی سے بادی النظر میں کوئی تعلق تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن دعوے سے کہا جاتا ہے کہ یہی خفیف واقعہ عظیم الشان شاہ نامے کی تصنیف کا ذمے دار ہے ۔

ان واقعات کے بیان کرنے کے لیے ہم کو طوس کے ایک باغ کا تصور کرنا چاہیے جس میں فردوسی لیٹا ہوا ہے ۔ باغ سے ملحق فردوسی کا مکان ہے جہاں اس کے اہل و عیال ہیں ۔ رات نے اپنی چھاؤنی چھا دی ہے ، اس کا منظر بھیانک اور وحشت ناک ہے ۔ اس منظر کو میں فردوسی کے اپنے الفاظ میں دکھانا چاہتا ہوں :

''رات نے قیر میں اپنا منہ دھو لیا تھا ، فلک پر نہ

مریخ و عطارد تھے، نہ زحل ، ماہ نو نے انوکھی وضع کی
آرائش بش کی ، ابتداے شب ہی سے رخصت کی تیاریاں
کرلیں ۔ اس کی کمر باریک تھی اور تاج سنہری، لاجوردی
ہوا میں گرد کے زنگار پھیل چکے تھے ، تاریک شب نے
دشت و راغ پر سیاہ فرش بچھا دیا ، واہمہ نے شیاطین جو
کالے ناگ کی طرح منہ کھولے تھے ، آنکھوں کے روبرو
کھڑے کر دیے ، ہوا کی سنسناہٹ سے معلوم ہوتا تھا
کہ زنگی کوئلوں کی گرد اچھال رہا ہے ، چمن زار اور
جوئبار سے سیاہی کی موجیں اٹھ رہی تھیں ، آسمان ساکت ،
آفتاب بے دست و پا اور زمین سیاہ رنگ چادر میں منہ
چھپائے سرگرم خواب تھی ، دنیا کے دل پر ہراس غالب ،
گھڑیالی وقت سے بے خبر ، سنسانی اور ہو کا عالم ، نہ
پرندوں کی چیخ اور نہ درندوں کی للکار ، اچھی بری
بات سے زمانے کی زبان پر مُہر سکوت ، نشیب و فراز
اور ان کی ہستیاں مفقود ۔"

ایسی اندھیری رات فردوسی تنہا باغ میں سو رہا تھا لیکن کسی نا معلوم وجہ سے اس کو نیند نہ آئی ۔ ہر چند چاہا کہ سو رہے مگر سونا میسر نہ ہوا ۔ جب وحشت زیادہ غالب ہوئی تو گھبرا کر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی جو باغ سے ملحق مکان میں سو رہی تھی ۔ وہ بیدار ہو کر باغ میں آئی ، فردوسی نے چراغ لانے کی فرمائش کی، اس نے حیرت کے لہجے میں پوچھا "تم کو آج رات کیا ہو گیا ہے، سو کیوں نہیں جاتے ، اتنی رات گئے چراغ کا کیا ہوگا ؟" یہاں اس استفسار کا یہی جواب تھا کہ سو کیسے جاؤں ، نیند آتی نہیں ، اگر چراغ لے آؤ تو مہربانی ہو گی ۔ الغرض چراغ اور چراغ کے ساتھ کسی قدر میوے اور ایک جام شراب بھی لایا گیا ۔ کچھ دیر شراب اور موسیقی ساز سے دل بہلایا گیا ، اس کے بعد یہ عورت (جو فردوسی کی

بیوی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ شاعر اگرچہ اس کو محبت کے الفاظ سے عموماً یاد کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ایسے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے جو اُس زمانے میں ایک بیوی کے لیے مخصوص تھے ؛ مثلاً مہربان یار، مہربان جفت) ہمارے شاعر سے کہتی ہے کہ اگر تمھاری خوشی ہو تو دفتر پاستان سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم ، بزم ، فریب اور محبت کے واقعات پر مشتمل اور سنجیدہ اور خردمند لوگوں کے ذکر سے مملو ہے اور جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہوگی۔ فردوسی نے اصرار سے کہا کہ اے ماہرو ! آج رات یہ داستان تم ضرور سناؤ۔ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہوگا۔ بیوی نے کہا "میں یہ داستان سنانے کے لیے تیار ہوں مگر تم اقرار کر لو کہ سننے کے بعد اس کو نظم کر دوں گا۔" فردوسی نے جواب میں کہا "مجھ کو منظور ہے۔ یہ قصہ جس طرح میں تم سے سنوں گا اسی طرح اس کو نظم کر دوں گا۔ اے نیکی شناس مہربان جفت ! میں تمھارے اس خیال دلانے کا خدا کی جناب میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فکر شعر میں مجھ کو مزے سے نیند بھی آ جائے گی۔"

ان مبادیات کے بعد یہ داستان سنائی گئی۔ یہ خوش قسمت داستان جو اس رات فردوسی نے اپنی بیوی کی زبان سے سنی ، داستانِ بیژن تھی۔ اس کے واقعات کا تاروپود کچھ اس قسم کا ہے جو ایک عورت کی پسند لازماً اپنی طرف مائل کرتا ہے ، کیوں کہ جنسِ لطیف کی تحسین تسخیر کرنے کے تمام عناصر اس میں موجود ہیں۔

نوجوان بیژن جس کے چہرے پر ابھی اچھی طرح خط بھی نکلنے نہیں پایا ہے ، کیخسرو کے دربار سے بیڑا اٹھا کر دشت ارمان (ارمن) میں جنگلی سوروں کے نیست کرنے کے لیے رخصت ہوتا ہے ، اس کے ساتھ گرگین جیسا دغا باز اور کینہ پرور رفیقِ سفر کر دیا جاتا ہے۔ بیژن اس مہم میں کامیاب ہو کر سوروں کی درانتیاں جمع کر لیتا

ہے تو گرگین کو اس پر حسد آتا ہے کہ یہ طفل دربار میں سرخرو ہوگا اور میں کورا رہ جاؤں گا - چناں چہ وہ بیژن کی شہرت خاک میں ملانے کے لیے فریب کا جال گانٹھتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ یہاں سے ایک دو روز کے فاصلے پر ایک خوشنما مرغزار ہے جہاں تورانی لڑکیاں اکثر موسم بہار میں بغرض تفریح آتی اور دنوں تک رہتی ہیں - افراسیاب کی بیٹی، خوبصورت منیژہ بھی ہر سال آیا جایا کرتی ہے - آج کل بہار کا موسم ہے اور تورانی عورتوں کی آمد کا زمانہ - تمھیں منظور ہو تو ہم تم چل کر کچھ عورتیں پکڑ لائیں اور ایران لے چلیں، اس میں ہماری ناموری ہوگی - سادہ لوح بیژن اس داؤ میں پھنس جاتا ہے - کائیاں گرگین ایرانی سرحد پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور بیژن تن تنہا تورانی علاقے میں گھس جاتا ہے - وہ بہت جلد ایک چشمہ سار پر پہنچ جاتا ہے اور تمام جنگل کو پریزادوں کا اکھاڑا پاتا ہے - منیژہ ہمارے پہلوان کو اتفاقیہ دیکھ کر فریفتہ ہوجاتی ہے اور دایہ کی معرفت بیژن کو خیمے میں بلوا لیا جاتا ہے - چوں کہ شہزادی بالکل مفتون ہو چکی تھی اس لیے مفارقت کی تاب نہ لا کر جاتے وقت بیژن کو بے ہوش کر کے اپنے ساتھ عماری میں لٹا کر توران لے جاتی ہے اور اپنے باپ افراسیاب کے محل میں کئی روز تک خفیہ رکھتی ہے - شدہ شدہ یہ خبر افراسیاب تک پہنچ جاتی ہے اور وہ کرسیوز کی معرفت بیژن کو گرفتار کرا کر پیران ویسہ کی سفارش پر قتل سے باز آ کر ایک کنویں میں قید کر دیتا ہے - منیژہ کی جائیداد ضبط اور محل لٹا دبا جاتا ہے اور فقیرانہ لباس میں شاہی قصر سے نکال دی جاتی ہے - اب شہزادی اپنی اوقات گداگری کر کے بسر کرتی ہے - وہ اسی کنویں پر رہتی ہے جس میں بد نصیب بیژن قید ہے اور وہی روٹی جو در در بھیک مانگ کر لاتی ہے، اس سے اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہے - گرگین ایران میں واپسی کے بعد بیژن کی غیرموجودگی کا کوئی معقول عذر

بیان نہیں کرتا اس لیے قید کر لیا جاتا ہے اور کیخسرو جام جہاں نما کے ذریعے بیژن کی قید کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ گیو، بیژن کا باپ، رستم کی طلبی کو نیمروز جاتا ہے۔ رستم تاجرانہ بھیس میں توران مع گرگین بغرض رہائی بیژن پہنچتا ہے۔ منیژہ اپنی رسائی رستم تک کر لیتی ہے۔ رستم اس کی معرفت بیژن کے لیے کھانا، جس میں اپنی انگشتری چھپا دیتا ہے، بھیجتا ہے۔ بیژن اس انگوٹھی کو پہچان کر سمجھ لیتا ہے کہ رستم اس کے چھڑانے کے لیے آ گیا اور منیژہ سے راز فاش نہ کرنے کی قسم لے کر رستم کی آمد سے اس کو آگاہ کر دیتا ہے۔ رستم منیژہ کی نشان دہی کے بعد ایک شب اس کنویں پر پہنچ کر بیژن کو کنویں سے نکال لیتا ہے۔ اب رستم اپنا تاجرانہ لباس اتار کر اصلی شکل میں پہلوانوں سمیت افراسیاب کے محل میں گھس جاتا ہے۔ شاہ افراسیاب رستم کی آواز پہچان کر بھاگ جاتا ہے۔ شاہی محل ایرانی پہلوان لوٹ لیتے ہیں اور ایران کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز ان کے تعاقب میں افراسیاب لشکر لے کر آ پہنچتا ہے۔ سخت معرکے کے بعد، جس میں رستم ظفریاب ہوتا ہے، افراسیاب لوٹ جاتا ہے اور رستم مع بیژن و منیژہ ایران پہنچ جاتا ہے۔

فردوسی نے اس داستان کو جو بسبیل اختصار اوپر درج ہوئی ہے، اپنی بیوی کی فرمائش پر نظم کا لباس پہنا دیا۔ یہاں میں اس تمہید کے درج کرنے کا بھی موقع فروگذاشت نہیں کرنا چاہتا جو اس داستان کے زیب عنوان ہے۔

وهو هذا:

ستایش کنم ایزد پاک را
که گویا و بینا کند خاک را
به موری دهد مالش نره شیر
کند پشه بر پیل جنگی دلیر

شبی چون شبه روی شسته چو قیر
نه بهرام پیدا نه کیوان نه تیر
دگر گونه آرایشی کرده ماه
بسیچ گذر کرده بر پیشگاه
شده تیره اندر سرای درنگ
میان کرده باریک و دل کرده تنگ
ز تاجش سه بهره شده لاجورد
سپرده هوا را بزنگار گرد
سیاه شب تیره بردشت و راغ
یکی فرش افگنده چون پرّ زاغ
چو پولاد زنگار خورده سپهر
تو گفتی بقیر اندر اندوده چهر
نمودم ز هر سو سیه اهرمن
چو مار سیه باز کرده دهن
هر آنگه که برزد یکی باد سرد
چو زنگی بر انگیخت زانگشت گرد
چنان گشت باغ و لب جویبار
کجا موج خیزد ز دریای قار
فرو مانده گردون گردان زجای
شده سست خورشید را دست و پای
زمین زیر آن چادر قیرگون
تو گفتی شدستی بخواب اندرون
جهان را دل از خویشتن پر هراس
جرس بر گرفته نگهبان پاس
نه آوای مرغ و نه هرّای دد
زمانه ، زبان بسته از نیک و بد

نه بد هیچ پیدا نشیب و فراز
دلم تنگ شد زان درنگ دراز
بدان تنگی اندر بجستم زجای
یکی مهربان بودم اندر سرای
خروشیدم و خواستم زو چراغ
در آمد بت مهربانم بباغ
مرا گفت شمعت چه باید همی
شب تیره خوابت نیاید همی
بدو گفتم ای بت نیم مرد خواب
بیاور یکی شمع چون آفتاب
بنه پیشم و بزم را ساز کن
بچنگ آر چنگ و می آغاز کن
برفت آن بت مهربانم ز باغ
بیاورد رخشنده شمع و چراغ
می آورد و نار و ترنج و بهی
ز دوده یکی جام شاهنشهی
گهی می گسارید و گه چنگ ساخت
تو گفتی که هاروت نیرنگ ساخت
دلم برهمه کار پیروز کرد
شب تیره هم چون گهه روز کرد
مرا مهربان یار بشنو چه گفت
ازان پس که گشتیم با جام جفت
مرا گفت آن ماه خورشید چهر
که از جان تو شاد بادا سپهر
به پیمای تا من یکی داستان
ز دفتر برت خوانم از باستان

پر از چاره و مہر و نیرنگ و جنگ
همه از در مرد فرهنگ و سنگ
بدان سرو بن گفتم ای ماهروی
مرا امشب این داستان بازگوی
مرا گفت کز من سخن بشنوی
به شعر آری از دفتر پهلوی
به گفتم بیار ای مه خوب چهر
بخوان داستان و بیفزای مہر
مگر طبع شوریده بکشایدم
شب تیره زاندیشه خواب آیدم
ز تو طبع من گردد آراسته
ایا مہربان یار پیراسته
چنان چون ز تو بشنوم در بدر
بشعر آورم داستان سربسر
بگویم پذیرم ز یزدان سپاس
ایا مہربان جفت نیکی شناس
بخواند آن بت مہربان داستان
ز دفتر نوشته گه پاستان
بگفتار شعرم کنون گوش دار
خرد یاد دار و بدل هوش دار

اس تمہید کو غور سے پڑھنے کے بعد ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ فردوسی نے سب سے بیشتر داستان بیژن نظم کی تھی ۔ نیز یہ کہ وہ شاہ نامے کی نظم کا پختہ فیصلہ کرنے سے چند سال قبل اس داستان کو نظم اور شائع کر چکا تھا بلکہ داستان بیژن کی عام قبولیت اور شہرت تمام شاہ نامے کی تصنیف کی اصلی اور قدیمی محرک ہے ۔ بیشتر اس کے کہ ہم اپنے دعوے کی تائید کے لیے

شہادت اور براہین پیش کریں ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ دفتر پاستان اور داستان بیژن کے تعلقات کی بابت لکھے جائیں ۔

دفتر پاستان یا نامۂ خسروان یا دفتر پہلوی بروئے شاہ نامہ ایک کتاب کا نام ہے جو فردوسی کے زمانے سے دو ہزار سال قبل تصنیف ہو چکی تھی ۔ وہ شاہان ایران کی تاریخ تھی ۔ بعد میں اصل نسخہ غائب ہو گیا لیکن اس کے اجزا جن میں علیحدہ علیحدہ داستانیں پائی جاتی تھیں ، موبدوں کے پاس ملتے رہے ۔ یہ اجزائے پریشان ابو منصور عبدالرزاق کے حکم سے ۳۴۶ھ میں بادارت ابو منصور المعمری دوبارہ تدوین کیے گئے ۔ یہ تیار شدہ نسخہ شاہ نامے کا غالباً اصلی ماخذ ہے[1] ، اگرچہ بعض واقعات فردوسی نے دیگر ذرائع سے بھی نقل

[1] ۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق فرماتے ہیں :

''ولی مہمترین منبع شاهنامہ فردوسی همانا شاهنامہ ابو منصوری است کہ بحکم ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی کہ در اواسط قرن چهارم فرمانروای طوس بود و از بزرگزادگان آلسامان بشمار میرفت و تعصب ایرانی داشت تالیف یافت ۔''

(تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۸۶)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی تحقیق بھی اسی نتیجے پر پہنچتی ہے ۔ چنانچہ :

''بنا بر دلایلی کہ در دست است ماخذ اصلی و اساسی فردوسی در نظم شاهنامہ همین شاهنامۂ ابو منصوری بود . . . .''

('داستان حماسہ سرایی در ایران' صفہ ۹۹)

لیکن وہ شاهنامۂ ابو منصوری کو داستان بیژن کے ماخذ کے طور پر تسلیم کرنے میں مذبذب ہیں :

''چنین بنظر میرسد کہ این داستان از شاهنامۂ بو منصوری گرفتہ نشدہ (خاصہ کہ در غرر اخبار ملوک الفرس هم اثری از آن نیست) و دست یافتن شاعر بر نسخۂ شاهنامۂ ابو منصوری و نظم آن چند سال بعد و پس از مرگ دقیقی صورت گرفت...''

('تاریخ ادبیات در ایران' جلد اول ، صفحہ ۳۶۳) ۔ مرتب

کیے ہیں - داستان بیژن بھی اسی نامۂ خسروان یا دفتر پہلوی کی ایک کڑی ہے جس کا ماخذ یہی کتاب ہے - یہاں مجھ کو اس مغالطے کا بھی ذکر کر دینا چاہیے جو علامہ شبلی کو ہوگیا ہے - وہ فرماتے ہیں کہ داستان بیژن کے واقعات فردوسی کو اس کی ایک منظور نظر نے مہیا کیے تھے حالانکہ فردوسی اس موقع پر صاف کہتا ہے :

بخواند آن بت مہربان داستان
ز دفتر نوشتہ گہ پاستان

وہ کہانی اس نے اس قدیم کتاب سے پڑھ کر سنائی -

ان مراتب کے بعد داستان بیژن کو شاہ نامے کی اولین نظم مانے جانے کے بارے میں ذیل کے امور ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی اس خاص رات تک داستان بیژن اور دفتر پاستان سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ جس اشتیاق سے وہ اس قصے کے سننے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے اس سے یہی عقیدہ مترتب ہوتا ہے ، نیز قصے کے ذکر کے وقت فردوسی کی بیوی اس کے بعض خط و خال بیان کرتی ہے - چنانچہ :

بہ پیمای تا من یکی داستان
ز دفتر برت خوانم از پاستان
پر ازچارہ و مہر و نیرنگ‌ورنگ
ہمہ از در مرد فرہنگ و سنگ
کہ چون گوشت از گفت من یافت برخ
شگفت اندرو مانی از کار چرخ

(۲) فردوسی اگر اس وقت شاہ نامے کی نظم پر مصروف تھا تو ضرور تھا کہ اس داستان سے واقف ہوتا - اگر واقف تھا تو دوبارہ سننے کی ضرورت نہیں تھی اور جب اس کی بیوی کو علم تھا

کہ وہ شاہ نامے ہی پر کام کر رہا ہے تو اس داستان کے نظم کرنے کی فرمائش نہ کرتی کیوں کہ اپنے وقت پر اس داستان کی بھی باری آ جاتی ۔

(۳) داستانوں کی نظم کے اسباب فردوسی عام طور پر بیان نہیں کیا کرتا ، اگرچہ ان کا ماخذ یا راوی وہ اکثر بتا جاتا ہے ۔ چوں کہ اس نظم کے وقت واقعات غیر معمولی تھے اس لیے تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے تمہید میں انھیں بالتفصیل ذکر کر دیا ۔

(۴) فردوسی کا سکہ بہ‌حیثیت رزم نگار ہمارے قلوب پر شاہ‌نامے کی وجہ سے جما ہوا ہے ۔ اس صنف سخن میں شاہ‌نامے کے سوا کوئی اور تصنیف اس کی طرف منسوب بھی نہیں کی جاتی ۔ پھر وہ کیا مخفی وجوہ تھے جن کی بنا پر شاہ نامے کی نظم کا مستقل ارادہ کرنے سے ایک عرصہ پیشتر اس کے معاصرین میں فردوسی کی رزمیہ شاعری کی شہرت قائم ہو چکی تھی ، جس کی صدائے بازگشت ہم دیباچے میں دیکھتے ہیں جہاں فردوسی کا ایک دوست اس کے ارادے کو مستقل اور عزم کو مستحکم کرنے کی غرض سے کہتا ہے :

کشادہ زبان و جوانیت ہست
سخن گفتن پہلوانیت ہست

'تو جوان ہے اور زبان میں روانی ہے ۔ رزمیہ نظم کہنے کا ڈھب تجھ کو آتا ہے' ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ شہرت فردوسی نے داستان بیژن کی بدولت پیدا کی تھی جو اس زمانے سے بہت پیشتر شائع ہو چکی تھی ۔

(۵) تمہید کی ابتدا میں حمد کے اشعار کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ داستان بیژن علیحدہ لکھی گئی تھی ۔

(۶) اگر داستان بیژن اور داستانوں کے بعد اپنی ترتیب اور وقت پر لکھی جاتی تو گزشتہ ربط کی یاد دہانی کی غرض سے فردوسی یہ تمہیدی ابیات ہرگز نہ لکھتا :

چو کیخسرو آمد بکین خواستن
جہان ساز نو خواست آراستن
ز توران زمین گم شد آن تخت و گاہ
بر آمد بخورشید بر تخت شاہ
بہ پیوست با شاہ ایران سپہر
بر آزادگان بر بگسترد مہر

گزشتہ داستانوں میں ہم کیخسرو اور افراسیاب کے تعلقات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں ۔ اشعار بالا میں ان تعلقات کی یاد دہانی محض تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہے[1] ۔

(۷) فردوسی کا عام قاعدہ ہے کہ خطوں کی ابتدا میں حمدیہ ابیات ضرور لایا کرتا ہے ۔ داستان ہاے ما قبل بیژن نامہ سے چند خط بیان کیے جاتے ہیں :

۱ ۔ نامۂ منوچہر نزد فریدون ۔ ۲۔ نامۂ منوچہر با سرسلم ۳ ۔ نامۂ زال بہ سام ۔ ۴ ۔ نامۂ سام نزد منو چہر ۔ ۵ ۔ نامۂ رستم بزال در پیروزی کوہ سپند ۔ ٦ ۔ پاسخ نامۂ رستم از زال ۔ ۷ ۔ نامۂ پشنگ بکیقباد ۔ ۸ ۔ نامۂ کاؤس بہ شاہ مازندران بدست رستم ۔ ۹ ۔ نامۂ کاؤس بہ شاہ مازندران ۔ ۱۰ ۔ نامۂ رستم بہ شاہ ہاماوران ۱۱ ۔ نامۂ سیاؤش بکاؤس بدست رستم ۔ ۱۲ ۔ پاسخ نامۂ سیاؤش ۔ ۱۳ ۔ نامۂ افراسیاب بہ سیاؤش ۔ ۱۴ ۔ نامۂ سیاؤش بہ افراسیاب ۔ ۱۵ ۔ نامۂ رستم نزد کیخسرو ۔ ۱٦۔ پاسخ نامۂ رستم از کیخسرو ۔

---

۱ ۔ ''مقدمہ داستان منیژہ و بیژن و شرحی کہ فردوسی در ذکر مقدمات نظم آن بیان میکند بصراحت تمام منفرد بودن داستان و ابتدای کار شاعر در سرودن منظومہ یی کہ تاکنون بنظیر آن دست نزدہ بود میرساند ۔''
('تاریخ ادبیات در ایران ، جلد اول ، صفحہ ۴٦۴ ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا)
(مرتب)

یہ تمام خط جو داستان بیژن سے بیشتر شاہ نامے میں ملتے ہیں حمد الٰہی کے اشعار سے مزین ہیں ۔ داستان بیژن میں بھی کیخسرو ایک لمبا چوڑا خط بیژن کے بارے میں رستم کو لکھتا ہے لیکن حمد کا ایک شعر بھی اس کے شروع میں نہیں ملتا ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت تک فردوسی اپنا انداز خاص قائم نہیں کر چکا تھا ۔

۸ ۔ فردوسی اختصار پسندی کے لیے مشہور ہے اور یہ اس کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ وہ شعرائے متاخرین کی طرح اپنے مضمون کو طوالت دینا پسند نہیں کرتا جس کے وجوہ یہ ہیں کہ اس نے پچاس اڑتالیس برس کی عمر میں شاہ نامے پر ہاتھ اٹھایا جب کہ اس کی عمر کا بہترین زمانہ گزر چکا تھا ۔ موت اور بڑھاپا سر پر کھڑے تھے ۔ ادھر شاہ نامہ کوئی چھوٹی سی چیز نہیں تھی ، وہ بجائے خود ایک عمر کا کام تھا ۔ نیز فردوسی اپنی وفات سے بیشتر اس کے ختم کرنے کا متمنی تھا ۔ اندریں حالات بس یہی ممکن تھا کہ غیر ضروری شاعری ، لفاظی اور زبان آرائی کو بالائے طاق رکھ کر نفس مطلب سے تعلق رکھے اور جہاں تک ہو سکے مختصر لکھے ۔ اس طرح یہ اختصار پسندی اس کے عام مذاق کا ایک نمایاں جوہر ہوگئی جو شاہ نامے میں من اولہٖ الیٰ آخرہ مشاہدہ کی جاتی ہے ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ داستان بیژن میں ہمارا شاعر خلاف معمول بعض موقعوں پر بلا ضرورت چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہا ہے ۔ دور کیوں جائیے ، تمہید کے ان اشعار کو دیکھیے جن میں شاعر نے رات کا منظر دکھایا ہے ۔ یہ طرز ادا جامی یا نظامی کی معلوم ہوتی ہے نہ فردوسی کی ، جس کے لیے پندرہ اشعار رات کا سماں بیان کرنے میں صرف کیے جائیں۔ یہ ابیات اس شعر سے شروع ہوتے ہیں :

شبی چون شبہ روی شستہ بقیر
نہ بہرام پیدا نہ کیوان نہ تیر

فردوسی کے زمانے میں یہ اشعار اس کی شاعری کا بہترین نمونہ

مانے گئے ہیں ۔ فردوسی کا اولین مقلد ، اسدی دل کھول کر ان کا جواب لکھتا ہے ۔ ابتدا کا شعر یہاں لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں :

شبی بد چو زنگی سیہ تر ز زاغ
مہ نو چو در دست زنگی چراغ

فردوسی اسی طرح کیخسرو کے دربار کی کیفیت بیان کرنے میں خلاف توقع زبان آرائی سے کام لے رہا ہے وھو ھذا :

بہ بگماز یک روز بنشست شاد
ز گردان لشکر همی کرد یاد
بدیبا بیاراستہ گاہ شاہ
نہادہ بسر بر ز گوھر کلاہ
یکی جام یاقوت پر می بچنگ
دل و گوش دادہ بہ آوای چنگ
بزرگان نشستہ برامش بہم
فریبرز کاؤس با گستہم
چو گودرز کشواد و فرهاد وگیو
چو گرگین میلاد و شاپورنیو
شہ نوذران طوس لشکر شکن
چو خراد و چون بیژن رزم زن
همہ بادۂ خسروانی بدست
همہ پہلوانان خسرو پرست
می اندر قدح چو عقیق یمن
بہ پیش اندرون دستۂ نارون[۱]
پری چہرگان پیش خسرو بپای
سر زلف شان بر سمن مشک سای

۱ - طبع طہران میں 'نسترن' ہے (مرتب)

همه بزم گه پر ز رنگ و نگار
کمر بسته در پیش سالار بار
ز پرده در آمد یکی پرده دار
به نزدیک سالار شه۱ هوشیار
که بر در بیایند ارمانیان
سر مرز ایران و تورانیان
همی راه جویند نزدیک شاه
ز راه دراز آمده داد خواه
چو سالار هشیار بشنید تفت
بدرگاه خسرو خرامید و رفت
به گفت آنچه بشنید و فرمان گزید
به پیش اندر آورد شان چوسزید

یہی طوالت کا ڈھنگ ہم کیخسرو کے اس خط میں دیکھتے ہیں جو رستم کے نام گیو کی معرفت بھیجا گیا ہے ۔ اس خط میں چودہ شعر رستم کی تعریف میں لکھے گئے ہیں ۔ اس قدر خوشامد اور تکلف کا کیخسرو کی طرف سے اظہار بیژن کی رہائی کے باب میں جو رستم کا نواسہ بھی ہوتا ہے ، ہمارے خیال میں شاہانہ متانت اور وقار کا خیال کرتے ہوئے بے موقع معلوم ہوتا ہے ۔ میں اب وہ اشعار نقل کرتا ہوں :

که ای پهلوان زادهٔ پر هنر
ز گردان گیهان بر آورده سر
توای از نیاگان مرا یادگار
همیشه کمر بستهٔ کار زار
ترا داد کردن بمردی پلنگ
بدریا خروشان ز بیمت نهنگ

۱ ۔ طبع طہران میں 'شد' (مرتب)

دل شهر یاران و پشت کیان
بفریاد هر کس کمر بر میان
جهان را ز دیوان مازندران
برستی[1] و کندی بدان را سران
چه مایه سر تاجداران ز گاه
ربودی و بر کندی از پیش گاه
بسا دشمنان کز تو بیجان شده
بسان بوم و برکز تو ویران شده
سر پهلوانان و لشکر پناه
به نزدیک شاهان ترا دست گاه
همه جادوان را شکستی بگرز
بیفروختی تاج شاهان ببرز
چه افراسیاب و چه خاقان چین
نبشته همه نام تو برنگین
هر آن بند کز دست تو بسته شد
کشایندگان را جگر خسته شد
کشایندهٔ بند بسته توئی
کیان را سپهر خجسته توئی
ترا ایزد این زور پیلان که داد
بر و بازو و چنگ فرخ نژاد
بدان داد تا دست فریاد خواه
بگیری بر آری ز تاریک چاه
کنون این یکی کار شایسته پیش
فراز آمد ست این بشایسته خویش

---

۱ - طبع طہران میں 'بشستی' (مرتب)

اسی طول کلامی کی ایک مثال ہم رستم کی دعا میں پاتے ہیں جو دربار میں پہنچ کر رستم کیخسرو کے حق میں مانگتا ہے ۔ اس قسم کی دعا شاہ نامے بھر میں اپنی آپ نظیر ہے ۔ چناں چہ :

ستایش کنان پیشِ خسرو رسید
که مهر و ستایش مر او را سزید
بر آورد سر آفرین کرد و گفت
که بادی همه ساله با تخت جفت
که هرمزد بادت[1] بدین پایگاه
چو بهمن نگه دار تخت و کلاه
همه ساله ازدی بهشتت هژیر
نگهبان تو باد بهرام و تیر
ز شهریر بادی تو پیروزگر
بنام بزرگی و فر و هنر
ترا باد فرخ نیا و نژاد
ز خورداد بادا بر و بوم شاد
از آذرت رخشنده شب همچو روز
تو شادان و تاج تو گیتی فروز
سفندارمز پاسبان تو باد
خرد جان روشن روان تو باد
دی و اورمزدت[2] خجسته بواد
در هر بدی بر تو بسته بواد
وز آبانت هم کار فرخنده باد
سپهر روان پیش تو بنده باد

۱ ۔ طبع طهران میں 'یارت' (مرتب)
۲ ۔ طبع طهران میں 'فروردینت' (مرتب)

تن چارپایانت مرداد باد
همیشه تن و بخت تو شاد باد
چو این آفرین کرد رستم بپای
شہنشاه بدادش بر خویش جای

داستان اکوان دیو میں بھی جو داستان بیژن سے مقدم داستان ہے کیخسرو رستم کو نامہ بھیج کر بلاتا نظر آتا ہے - یہاں قاصد گرگین میلاد ہے اور رستم حسب الطلب شاہی دربار میں حاضر ہوتا ہے - یہاں یہ تمام واقعات چند اشعار میں ختم ہو جاتے ہیں - اگرچہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میرا مضمون اس قسم کی مثالوں سے دراز ہو جائے گا لیکن میں اپنی حجت کی صحت اور صفائی ناظرین سے اس وقت تک تسلیم نہیں کرا سکتا جب تک کہ میں ان کو فردوسی کے دونوں انداز علیحدہ علیحدہ مثالوں کے ذریعے سے نہ سمجھا دوں :

برون رفت گرگین چو باد دمان
ویا همچو گوری که ترسد ز جان
چو آمد بزابل بر نامدار
بدو داد آن نامهٔ شهریار
تہمتن چو بشنید فرمان شاه
گرازان بیامد بدان بارگاه
ببوسید خاک از بر تخت اوی
همه آفرین خواند بر بخت اوی
چنین گفت شاها مرا خواستی
کنون آمدم تا چه آراستی

اسی طرح ایک اور موقع پر جب کہ ایرانی افواج تورانیوں سے ہزیمت پا کر کوہ ہاون پر محصور ہو جاتی ہیں ، ان کی اعانت کی غرض سے کیخسرو رستم کو زابلستان سے بلواتا ہے - یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر رستم کی طلبی اور دربار میں حاضری وغیرہ کے

واقعات کو نہایت مختصر پیرایے میں بیان کر دیتا ہے - چند آدمی رستم کو پیغام دیتے ہیں کہ :

فرستادہ ایم از بر شہریار
کند شاہ ایران ترا خواستار
کنون خیز و پیش شہنشاہ خرام
دلیرا یلا پور دستان سام
چنین گفت رستم گو نیک بخت
کہ جانم فدای شہ و تاج و تخت
بگفت این و بر رخش رخشان نشست
بر خسرو آمد یل چیرہ دست
زمین بوس کرد و ثنا گسترید
بدان سان کہ او را سزاوار دید

امثلۂ بالا سے جو بیژن نامے کی پیشرو داستانوں سے نقل کی گئی ہیں ، واضح ہوگیا ہوگا کہ یہ تکلفات اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو پھیلا کر بیان کرنا جو داستان بیژن کے ضمن میں دیکھا جاتا ہے فردوسی کا مستمرہ انداز نہیں ہے لیکن یہ داستان چوں کہ اس کی کوشش کا پہلا نتیجہ تھی اس لیے جہاں تک ہو سکا شاعر نے اپنے پہلے نمونے کو نہایت رنگینی اور رونق کے ساتھ پیش کیا -

(۹) سب سے بہتر اور معتبر دلیل داستان بیژن کی اولیت کے حق میں شہادت کلام ہو سکتی ہے - اس سے ہمارا مقصد ہے کہ اگر یہ داستان حقیقت میں قدیم ہے تو اس کی زبان اور شاہ نامے کی زبان میں یقینی فرق ہونا چاہیے اور اگر اس فرق کے دریافت کرنے میں ہم کامیاب ہو گئے تو گویا دوسرے الفاظ میں ہم نے اپنے دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا - ایک ہی شخص کے دو مختلف زمانوں کے کلام سے مادۂ فارق دریافت کرنا اصولاً اگرچہ مستند آزمائش اور صحیح طریقہ ہے لیکن وہ کثیر مطالعے کا متقاضی ہے -

بد قسمتی سے ہم اس آخری شرط کی ایفا سے کامیابی کے ساتھ عہدہ‌برآ نہیں ہو سکتے ۔ البتہ سطحی مشاہدے کے اعتبار پر کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر زمانہ گزرنے کے باوجود داستان بیژن میں ایسے آثار موجود ہیں جو فردوسی سے ماسبق اساتذہ دقیقی و رودکی میں پائے جاتے ہیں ۔ نمونے کے طور پر الف زائدہ کا استعمال ملاحظہ ہو : ع

نوبہار آمد و بشگفت گل و یاسمنا

یاسمنا کے آخر میں الف زائدہ ہے اور تحسین کلام کی خاطر استعمال ہوا ہے ۔ وہ اسم اور فعل دونوں کے آخر میں اضافہ کر دیا جاتا تھا مثلاً دقیقی کا یہ شعر :

بہ پیش اندر آمد بہ دست اندرا
بزهر آبداده یکی خنجرا

یا یہ شعر :

بدوزخ درون دیدم اهریمنا
نیارستمش گشت پیرامنا

یا یہ بیت :

یکی چاره باید سگالیدنا
وگرنہ ره ترک مالیدنا

داستان بیژن اس الف کی بہت مثالیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے ۔ مثلاً ایک مقام کے یہ تین مسلسل بیت :

بایوان افراسیاب اندرا
ابا ماهروی ببالین سرا
بہ پیچید بر خویشتن بیژنا
بہ یزدان پناهید ز اهریمنا
چنین گفت کای کردگارا مرا
رهائی نخواهد بدن زایدرا

ایک موقع پر یہ دو بیت آتے ہیں :

به پرسش که چون آمدی ایدرا
که آوردت ایدون بدینجا درا
پریزادهٔ یا سیاوخشیا
که دل را بمهرت همی بخشیا

یا یہ شعر :

بہر نیکوئی بہرہ‌ور بودیا
چنان کز دلم زنگ بز دودیا

اس قسم کی اور مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں کیا جا سکتا کہ تنہا داستان بیژن میں الف تحسین کا استعمال ۳۷ موقعوں پر ہوا ہے جو بجائے خود ایک حیرت میں ڈالنے والا امر ہے ۔ شاہ نامے کی ابتدائی داستانوں مثلاً داستان کیومرث وغیرہ میں بعض موقعوں پر ہم پھر الف تحسین سے دو چار ہوتے ہیں لیکن نہ اس کثرت کے ساتھ ۔ وہ بھی بعد تلاش دو چار مقام پر ملتا ہے ۔ داستان ہائے مابعد میں اس کی حاضری کم سے کم‌تر ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کی موجودگی غزنوی دور کی داستانوں میں من قبیل شاذ ہے ۔

فردوسی کی ابتدائی اور بعد کی داستانوں میں یہ نمایاں تفاوت ناقابل تشریح رہتا ہے ۔ اس کی معما کشائی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی انقلاب کے تھپیڑوں کا تختۂ مشق بن رہی تھی ۔ اور زبان میں جدید تغیرات واقع ہو رہے تھے ۔ فردوسی ایک باخبر ماہر ہونے کی حیثیت سے ان تغیرات سے ہمیشہ بر وقت وقوف حاصل کرتا رہا ۔ باغ سخن کا یہ سب سے بہتر اور ماہر باغبان اپنی جھولی میں وہی پھول چنتا رہا جو سکۂ رواں کی فہرست میں شامل تھے ۔ عدالت سخن سے جو لفظ خاطی اور مجرم قرار دیا گیا اس کو زبردست فردوسی بھی اپنی اقلیم میں پناہ نہیں دے سکتا تھا چنانچہ الف تحسین جس کا داستان

بیژن میں فردوسی اس قدر شائق معلوم ہوتا ہے آخر کار اسی فردوسی کا شاہ نامہ اس کا گورستان بنا ۔

گزشتہ بیانات اور دلائل سے ہم ناظرین کو اس امر کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ داستان بیژن محض تفریحاً فردوسی نے اپنی بیوی کی خاطر سے نظم کر دی تھی اور جب اس نظم نے شائع ہو کر قبولیت عام کا خلعت حاصل کر لیا تو دوستوں کی تحسین اور سخن فہموں کے اصرار نے فردوسی کو شاہ نامے کی نظم پر آمادہ کر دیا ۔ دقیقی کی یاد ان دنوں میں تازہ تھی اور اس کے اشعار کا بھی چرچا باقی تھا ۔ اس کی وفات کو کل انتیس سال گزرے تھے اور فردوسی جیسا کہ ہم کو علم ہے دقیقی کے کلام سے خوب واقف تھا اگرچہ وہ اس کا چنداں قائل نہیں معلوم ہوتا تاہم اس میں شک نہیں کہ شاہ نامے کے معاملے میں فردوسی دقیقی کا ممنون ضرور ہے ۔ اس کو اقرار ہے کہ اس معاملے میں وہ میرا رہبر تھا : ع

هم او بود گوینده را راهبر

وہ دقیقی کی شہرت سے واقف تھا اور اس کے نقش قدم پر چل کر وہی ہردلعزیزی اپنے لیے حاصل کرنے کا خواہش مند تھا ۔

شاہ نامے کی نظم کے خیال سے وہ اپنے وطن سے روانہ ہو کر بخارا پہنچا ۔ اس سفر سے اس کا یہی مقصد تھا کہ وہ دفتر پہلوی کا کامل نسخہ پیدا کرے چنانچہ دیباچے میں کہتا ہے :

دل روشن من چو برگشت ازوی
سو تخت شاه جهان کرد روی
که این نامه را دست پیش آورم
ز دفتر بگفتار خویش آورم

اسی غرض سے ، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہرات اور مرو بھی پہنچا ۔ ہرات میں پیر خراسان یا ماخ سے کچھ واقعات معلوم کیے ۔ مرو میں احمد بن سہل کے ہاں آزاد سرو رہتا تھا ۔ اس سے مل کر

داستان شغاد حاصل کی ۔ اسی غایت سے اس کا گزر بلخ میں بھی ہوا ہے اور کسی موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات دریافت کیے :

چنین یاد دارم زموبد بہ بلخ
بہ‌خسروچوشداین‌جہان تاروتلخ

یہ شعر میں نے ایک ایسے قلمی شاہ نامے سے لیا ہے جو ۷۵۲ھ میں لکھا گیا تھا ۔ الغرض جہاں گیا اپنی تلاش میں سرگرم رہا اور جس سے ملا کچھ نہ کچھ تحقیق اور تفتیش کرتا رہا ۔ وہ کہتا ہے :

بہ پرسیدم از ہر کسی بی شمار
بترسیدم از گردش روزگار

اس کے عزم کے خلاف دو زبردست مانع تھے ۔ اول عمر کی ناپائیداری ، دوسرے بے دولتی اور ناداری ۔ چنانچہ :

مگر خود درنگم نباشد بسی
بباید سپردن بدیگر کسی
و دیگر کہ گنجم وفادار نیست
ہمان رنج را کس خریدار نیست

زمانے میں کچھ ایسی ناموافق ہوا چل رہی تھی کہ ملک بد امنی اور پریشانی میں مبتلا تھا ۔ آل سامان اپنے تخت پر کمزور تھے ان کے غلام اور ماتحت رؤسا ہر طرف سرکش ہو کر خود مختار حکمران بن بیٹھے تھے ۔ چاروں طرف فساد اور جنگ کی آتش برپا تھی ۔ ۳۵۲ ھ میں الپتگین خراسان کو خیرباد کہہ کر غزنین آ چکا تھا ۔ سامانی امیر منصور بن عبدالملک نے اس کی ایالت ابوالحسن محمد بن ابراہیم سیمجور کو دے دی تھی ۔ اس کے خلف ابو علی سیمجور نیز فائق نے سامانیوں کے خلاف عرصے تک علم بغاوت بلند رکھا ۔ ان کی سرکوبی کے لیے کئی مرتبہ سامانیوں نے تکلیف کی ۔

نیز سبکتگین جانشین بلکاتگین کو بھی اس میں حصہ لینا پڑا - یہی محاربات ہوں گے[1] جن کے متعلق شاعر دیباچے میں اشارہ کرتا ہے :

زمانہ سرای پر از جنگ بود
بجویندگان بر جہان تنگ بود

انھیں ایام میں اس کا دوست جس کو فردوسی مہربان دوست اور دیباچۂ بایسنغری محمد لشکری لکھتا ہے فردوسی سے ملا اور جب فردوسی کے شغل اور ارادے کی اس کو اطلاع ہوئی تو اس نے اصرار کے ساتھ اس سے درخواست کی کہ یہ کام تم کرو تمھاری طبیعت رزمیہ اشعار کے لیے رسا واقع ہوئی ہے - تمھاری زبان پاکیزہ ہے اور اپنے اس جوہر سے بادشاہوں کے ہاں اقتدار اور آبرو حاصل کرو - پوری کتاب میرے پاس پڑی ہے ، میں دے دوں گا - یہ کہہ کر وہ گیا اور کتاب بھی لے آیا - قدردان سرپرست جو فردوسی کا تفقد کرتا بقول دیباچۂ بایسنغری منصور بن محمد کی ذات میں مل گیا[2]- اس شریف سردار نے فردوسی کے ذوق کو معلوم کر کے اس کی ہر قسم

۱ - ''......آنگاه کہ فردوسی بنظم شاه نامہ دست پیش آورده بود اوضاع خراسان آشفتہ و پریشان و زمانہ سرایی پر از جنگ بود - این وقایع ظاهراً مربوطست بسال ۳۷۱ و خلافهای میان ابوالحسن و ابو علی سیمجور و فائق الخاصہ با ابوالعباس تاش (سپہ سالار خراسان بعد از ابوالحسن سیمجور) 'و قتل عتبی وزیر' و جنگ های سخت سپاهیان سامانی با امرای آل بویہ ، و هجوم احتمالی دیالمہ بہ خراسان کہ بر اثر اطلاع از مرگ ابو شجاع فنا خسرو عضدالدولہ از آن کار و تعقیب سپاهیان شکست خوردۀ سامانی فرو ایستادند''
(تاریخ ادبیات در ایران ، از ڈاکٹر صفا ، جلد اول ، صفحہ ۴۶۶)
(مرتب)

۲ - ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی رائے میں منصور بن محمد کا فردوسی کا سرپرست ہونا محل نظر ہے - (مرتب)

کی کفالت کی خدمت اپنے ذمے لی ۔ یہ فیاض رئیس جس کی نہایت جوشیلے انداز میں فردوسی ثنا خوانی کرتا ہے یکایک موت کا شکار بن گیا ۔ موثر الفاظ میں شاعر نے اس کا مرثیہ دیباچے میں لکھا ہے ۔ مرحوم نے نصیحت کی تھی کہ جب یہ کلام ختم ہو تو کسی بادشاہ کے پاس لے جانا ، وہ اس کی قدر کرے گا اور محنت کی داد دے گا ۔

الغرض کچھ ایسے اسباب تھے جنھوں نے فردوسی کو تمام شاہ نامے کی نظم پر آخر کار مستعد کر دیا ۔ شاہ نامے کی ابتدا کس زمانے سے ہوئی ، اس کے متعلق اگرچہ فردوسی نے کوئی تصریحی اشارہ نہیں کیا تاہم بعض ضمنی امور سے ہم اس زمانے کو متعین کرنے کے قابل ہیں ۔

خاتمۂ شاہ نامہ میں وہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ میں نے کامل پینتیس سال اس کی تصنیف میں صرف کیے ۔ چوں کہ ۴۰۰ھ میں شاہ نامہ ختم ہوا اس لیے ظاہر ہے کہ ۳۶۵ھ میں شاہ نامہ کی تعمیر کا پہلا سنگ بنیاد قائم کیا گیا ہوگا ۔

اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے :

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم گرم کردم بدین پارسی

تو ۳۷۰ھ شاہ نامے کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہے ۔

۳۸۸ھ میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے ایام میں ، جب وہ چھیاسٹھ سال کا ہے ، کہتا ہے :

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

اس حساب سے ۳۶۸ھ پہلا سال ہے ۔

نو شیروان کی داستان کی ابتدا میں فردوسی کہتا ہے :

کی کفالت کی خدمت اپنے ذمے لی ۔ یہ فیاض رئیس جس کی نہایت جوشیلے انداز میں فردوسی ثنا خوانی کرتا ہے یکایک موت کا شکار بن گیا ۔ موثر الفاظ میں شاعر نے اس کا مرثیہ دیباچے میں لکھا ہے ۔ مرحوم نے نصیحت کی تھی کہ جب یہ کلام ختم ہو تو کسی بادشاہ کے پاس لے جانا ، وہ اس کی قدر کرے گا اور محنت کی داد دے گا ۔

الغرض کچھ ایسے اسباب تھے جنھوں نے فردوسی کو تمام شاہ نامے کی نظم پر آخر کار مستعد کر دیا ۔ شاہ نامے کی ابتدا کس زمانے سے ہوئی ، اس کے متعلق اگرچہ فردوسی نے کوئی تصریحی اشارہ نہیں کیا تاہم بعض ضمنی امور سے ہم اس زمانے کو متعین کرنے کے قابل ہیں ۔

خاتمۂ شاہ نامہ میں وہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ میں نے کامل پینتیس سال اس کی تصنیف میں صرف کیے ۔ چوں کہ ۴۰۰ھ میں شاہ نامہ ختم ہوا اس لیے ظاہر ہے کہ ۳۶۵ھ میں شاہ نامہ کی تعمیر کا پہلا سنگ بنیاد قائم کیا گیا ہوگا ۔

اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے :

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم گرم کردم بدین پارسی

تو ۳۷۰ھ شاہ نامے کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہے ۔

۳۸۸ھ میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے ایام میں ، جب وہ چھیاسٹھ سال کا ہے ، کہتا ہے :

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

اس حساب سے ۳۶۸ھ پہلا سال ہے ۔

نو شیرواں کی داستان کی ابتدا میں فردوسی کہتا ہے :

چل و ہشت بد عہد نوشیروان[1]
تو بر شصت رفتی نمانی جوان

۳۸۸ھ میں وہ چھیاسٹھ سال کا ہے۔ جب اڑتالیس سال کا ہو گا تو سن ہجری ۳۷۰ ہو گا اور یہ سال آغاز شاہ نامہ ٹھہرتا ہے۔

۴۰۰ھ میں وہ اپنی عمر قریب ہشتاد ظاہر کر رہا ہے:

کنون عمر نزدیک ہشتاد شد
امیدم بیک بارہ برباد شد

اب اس 'نزدیک ہشتاد' سے کون سا سال مانا جائے، اناسی

۱۔ عہد نوشیروان کے دو معنی لیے جا سکتے ہیں۔ یا ایام سلطنت نوشیروان عادل، جس نے کہا جاتا ہے اڑتالیس سال سلطنت کی۔ یا بروئے کنایہ کوئی زمانۂ امن و آرام۔ ان معنوں میں فردوسی سلطان محمود کی مدح میں لکھتا ہے: ع

کنون عہد نوشیروان تازہ شد

میں پہلے معنی سے اعراض کر کے دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرے رجحان کے موید یہ قرائن ہیں۔ بیت مذکور میں مصرع آخر صریحاً فردوسی سے تعلق رکھتا ہے، جس میں شاعر اپنی عمر کی طرف اشارہ کرتا۔ اسی لیے قیاس چاہتا ہے کہ پہلا مصرع بھی فردوسی سے علاقہ رکھے۔ اور 'چل و ہشت' سے شاعر کی اپنی عمر کے ایک خاص زمانے کی طرف تلمیح قائم کی جائے۔ اس بیت کے اشعار ما قبل سلسلہ وار ہیں، جن میں شاعر اپنے متعلق ذکر کر رہا ہے۔ ایک تنہا مصرع کو لے کر نوشیروان کی طرف نسبت دینا مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان اشعار کے سلسلے کے انقطاع پر نوشیروان کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی عمر میں، جب وہ اڑتالیس سال کا تھا، کوئی خوشگوار واقعہ یا انقلاب رونما ہوا ہے۔ یہ واقعہ ظن غالب ہے (کیوں کہ اور کوئی توجیہ قائم ہو نہیں سکتی) شاہ نامے کی نظم کے ابتدا سے تعلق رکھتا ہے۔ (حاشیۂ مصنف)

با اٹھہتر ۔ اگرچہ ظاہر ہے وہ اسی سال کا اس وقت نہیں تھا ۔ یہ معلوم ہے کہ ۳۸۸ھ میں وہ چھیاسٹھویں سال میں تھا ۔ تو ظاہر ہے کہ ۴۰۰ھ میں وہ اپنی عمر کا اٹھہتروان دور طے کر رہا تھا ۔ اس حساب سے بھی شاہ نامے کی ابتدا کا سال ۳۷۰ھ نکلتا ہے ۔

اس تحقیقات نے ہم کو کئی سال دیے ہیں ۔ یعنی ۳۶۵ھ، ۳۶۸ھ اور ۳۷۰ھ ۔ چونکہ آخرالذکر سال کئی قرینوں سے برآمد ہوتا ہے ، اس لیے میں اسی کے حق میں فیصلہ دیتا ہوں اور ۳۷۰ھ کو شاہ نامے کی باقاعدہ ابتدا کا پہلا سال مانتا ہوں ، جب کہ فردوسی اپنے 'مہربان دوست' اور منصور بن محمد کی تحسین و ترغیب سے متاثر ہو کر انجام کار شاہ نامے کی نظم پر کمربستہ ہو جاتا ہے ۔ داستان بیزن ظاہر ہے کہ ۳۶۵ھ میں ، اس سن سے پانچ سال پیشتر لکھی جا کر شائع ہو چکی تھی ، جس کے جامۂ شعر پہنانے کی اصلی محرک فردوسی کی بیوی ہے ۔

میری نگاہ میں یہ نا معلوم عورت نہ صرف 'بیژن نامہ' بلکہ تمام شاہ نامے کی اولین محرک ہے ۔ شاہ نامے کی اصلی تحریک دہندہ کا احسان اب تک ہماری ادبیات میں ایک نا معلوم کمیت رہی ہے اور اس کا تشکر ایک فراموش شدہ وام کی طرف اب تک ہمارا بار دوش ہے ۔

ہجو سلطان محمود غزنوی

(یہ مضمون پہلی بار رسالہ ''اردو'' اورنگ آباد ، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۱ع میں شائع ہوا اور پھر ''فردوسی پر چار مقالے'' میں دوسری بار چھپا ۔

فردوسی پر حافظ صاحب مرحوم کی تحقیق کے اکثر نتائج جدید ایرانی محققین بھی تسلیم کر چکے ہیں چنانچہ ان مضامین میں کہیں کہیں مندرج حواشی اس بات کے شاہد ہیں تاہم بعض حقائق ایسے بھی ہیں جن تک تا حال ایرانی اہل علم رسائی حاصل نہیں کر سکے ۔ ان میں سے ایک مسئلہ فردوسی کی ہجو سلطان محمود کا بھی ہے ۔ نقادانِ ایران ابھی تک اس ہجو پر شک و شبہ کی نظر ڈالنے کو تیار نہیں ہیں اور اس کا اصل سبب ایرانیوں کا جدید قوم پرستی کا جذبہ ہے جس کی بنیادی کتاب کی حیثیت شاهنامے کو عنایت کی گئی ہے ۔ بقول آقاے سعید نفیسی مرحوم :

''کتاب او انجیل و تورات و زبور ملت ایران است بلکہ از آن هم بالاتر۔'' (مجلہ مهر ، فردوسی نامہ)

اسی رسالے میں ''وطن پرستی فردوسی'' کے ضمن میں آقاے نصراللہ فلسفی کا ارشاد درج ذیل ہے :

''فردوسی آرزومند باز گشت آزادی و عظمت و فرمانروائی ایران بود و مانند نیا کان خویش آرزو داشت کہ شاهی از نژاد پاک ایران و از نسل شهریاران ایران بر وطن او حکمران گردد تا دست تسلط عرب صحرا گرد و پای ترکان وحشی مهاجم از ایران کوتاه و بریده شود و نمی توانست بندۂ بی هنری مانند محمود غزنوی را بر

تخت شہر یاری ایران بیند...''

ظاہر ہے کہ اس قسم کی فضا ، جس میں فردوسی اور شاھنامے سے قومی تعمیر کا کام لیا جا رہا ہے ، فردوسی کی ہجو ِ محمود پر شک کرنے کے لیے نہایت ناسازگار ہوگی - یہی وجہ ہے کہ بیشتر ایرانی فضلا کے ہاں ہجو پر یقین ، ایمان کی حدتک پہنچا ہوا ہے - اس ماحول میں بھلا کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق - مرتب)

ان واقعات اور اسباب کی تلاش میں جن سے فردوسی سلطان محمود کی ہجو لکھنے پر مجبور ہوا ہم اس قدر مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں کہ باوجود کوشش بلیغ ناظرین کو کسی تنقیدی فیصلے کی طرف رہنمائی کرنے سے ہم اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں - ان مشکلات کے ذمےدار وہ مختلف بیانات ہیں جو فردوسی کے سوانح نگار ایک دوسرے کے برخلاف پیش کر رہے ہیں - دیباچہ نگار بایسنغرخانی اور اس کے متبعین کا کثیر گروہ کچھ ایسی شہادت پیش کر رہا ہے جس سے سلطان پر نقض عہد کا صریح الزام عاید ہوتا ہے لیکن یہ قصہ اس قدر رنگین اور غیر معمولی معلوم ہوتا ہے کہ عقل سلیم اس پر اعتقاد لانے سے انکار کرتی ہے - علاوہ ازیں ان کا زمانہ فردوسی کے زمانے سے اس قدر دور دراز واقع ہوا ہے کہ قدیم شہادت کی موجودگی میں ان کے بیانات کی کوئی معتد بہ وقعت نہیں رہتی جس حالت میں کہ موخرالذکر ان کی صاف تردید اور تکذیب کر رہی ہے -

اس سے ہماری مراد دیباچۂ قدیم اور نظامی عروضی ہیں - فردوسی ادبیات میں ہمارے پاس یہ دو نہایت قدیم اسناد ہیں جو بالترتیب پانچویں اور چھٹی صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ قدیم اسناد بھی باہم متناقض ہیں باستثنا چند امور -

دیباچۂ قدیم کی مختصراً یہ شہادت ہے کہ عنصری کی معرفت فردوسی دربار میں آتا ہے اور شاہ نامے کی نظم کے لیے مقرر ہوتا ہے -

امتحاناً داستانِ سیاؤش سے ایک ہزار بیت نظم کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کرتا ہے جو پسند آتے ہیں اور ایک ہزار دینار زر رکنی دیے جانے کا حکم ملتا ہے ۔ چھ سال میں فردوسی شاہ نامہ اختتام کو پہنچا دیتا ہے لیکن چونکہ شرط ادب نگاہ نہ رکھ کر کتاب میں اپنے مذہب کا ذکر کرتا ہے :

گرت زین بد آید گناہ من ست

چنین ست و این رسم و راہ من ست

سلطان برہم ہوکر سیاست کا حکم دیتا ہے ۔ عنصری اور دیگر شعرائے دربار سفارش کرکے معاف دلواتے ہیں ۔ جب انعام کا موقع آتا ہے تو چونکہ شاہ نامے میں ساٹھ ہزار ابیات تھے اس لیے حسبِ قرارداد ساٹھ ہزار دینار زر رکنی شاعر کو ملنےچاہیے تھے لیکن منصور روایت کرتا ہے (منصور کسی راوی کا نام ہے) کہ سلطان کے دبیر ابو سہل ہمدانی کے عرض کرنے پر کہ یہ کثیر رقم ایک شاعر کو مرحمت ہونا کیا ضرور ہے ۔ اگر اس کے عوض ساٹھ ہزار درم سیم دیے جائیں تو بھی بہت ہے ۔ سلطان اس تعداد کے درم ہمارے شاعر کے پاس بطور صلہ بھجواتا ہے ۔ فردوسی اس وقت حمام میں تھا ۔ بیس ہزار درم حمامی بیس ہزار فقاعی بیس ہزار انعام لانے والوں کو بخش دیتا ہے اور حمام سے نکل کر یہ دو تین بیت بحر متقارب میں لکھ کر ایاز کے سپرد کرکے روپوش ہو جاتا ہے ۔ چند روز کے بعد ایاز وہ کاغذ حسبِ ہدایت فردوسی سلطان کے رو برو پیش کرتا ہے ۔ سلطان اس کو گنج نامہ کا کاغذ خیال کرکے نہایت شوق سے کھولتا ہے اور پڑھ کر نہایت متغیر ہوتا ہے ۔ فردوسی کی گرفتاری کے لیے پچاس ہزار درم کا اشتہار لگا دیا جاتا ہے لیکن فراری کا کسی طرف پتا نہیں چلتا ۔ سلطان ادھر سے مایوس ہو کر اپنا طیش اپنے وزیروں اور دبیروں پر نکالتا ہے ۔ ان کو اپنی بدنامی کا بانی کہتا ہے اور سیاستاً ان کو موقوف اور شہر بدر کر دیتا ہے ۔

برخلاف اس کے نظامی عروضی کا بیان ہے کہ شاہ نامہ طوس میں ختم ہوکر خواجۂ بزرگ احمد بن حسن میمندی کی وساطت سے دربار سلطانی میں پہنچا لیکن خواجہ کے دشمنوں نے در اندازی کرکے فردوسی کو رافضی اور معتزلی ثابت کرکے سلطان کوصرف پچاس ہزار درم عطیہ دینے پر راضی کر لیا ۔ یہ انعام فردوسی حمامی اور فقاعی میں تقسیم کرکے اور سیاست سلطان سے خائف ہو کر راتوں رات غزنین سے فرار ہوگیا ۔ طبرستان پہنچ کر سلطان کی ہجو میں اس نے ایک سو بیت لکھے اور شہر یار والیِ طبرستان سے عرض کی چونکہ یہ کتاب تمھارے اجداد اور اسلاف کے حالات میں ہے اس لیے میں اس کو تمھارے نام سے منسوب کرتا ہوں ۔ شہریار نے کہا کہ محمود میرا آقا ہے ۔ یہ کتاب تو اسی کے نام پر رہنے دے ۔ تیری محنت کا صلہ تجھ کو اپنے وقت پر مل جائے گا ۔ البتہ سلطان کی ہجو میں خریدنا چاہتا ہوں ۔ یہ تو مجھے دے دے اور دوسرے روز ایک لاکھ درم شہریار نے فردوسی کے پاس بھجوا دیے جس نے صفحۂ کاغذ سے اس کو دھو ڈالا ۔ سلطانی ہجو اس طرح ضائع ہو گئی اور یہ چھ بیت منجملہ اس کے باقی رہ گئے :

مرا غمز کردند کان پر سخن
بمہر نبی و علی شد کہن

اگر مہر شان من حکایت کنم
چو محمود را صد حمایت کنم

پرستار زادہ نیاید بکار
وگر چند دارد پدر شہریار

ازین در سخن چند رانم همی
چو دریا کرانہ ندانم همی

بہ نیکی نبد شاہ را دستگاہ
وگرنہ مرا بر نشاندی بگاہ

جو اندر تبارش بزرگی نبود
نیارست نام بزرگان شنود

ان بیانات میں ہم دیکھتے ہیں کہ دیباچۂ قدیم و نظامی سوائے دو باتوں کے اور تمام امور میں ایک دوسرے کے برخلاف ہیں۔ دونوں کو صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ سلطان بوجہ اختلاف مذہبی فردوسی سے ناراض ہوا اور یہ کہ فردوسی نے سلطان کی ہجو ضرور لکھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بوجہ تخالف مذہبی سلطان محمود فردوسی سے ناراض ہوا اور کیا فردوسی نے انعام نہ ملنے پر سلطان کی ہجو لکھی؟ یہ سوالات ہیں جن پر ہم ذیل میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پیشتر ہم مخالفت مذہب کے مسئلے کو لیتے ہیں۔

شاہ نامے میں ایک مقام ایسا آ گیا ہے جہاں بعض اشعار ہماری تلاش کے مقصد پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ داستان شیریں و خسرو کی ابتدا میں فردوسی تذکرةً کہتا ہے:

کنون داستان کهن نو کنم
سخن های شیرین و خسرو کنم
کهن گشته این نامهٔ باستان
ز گفتار و کردار آن راستان
همی نو کنم مرد را زین نشان
که تا یاد دارند از سرکشان[1]

---

۱ - شاہ نامہ مطبوعہ طہران میں یہ شعر یوں درج ہے:
یکی نو کنم نامه ای زین نشان
کجا یادگار است از آن سرکشان
(جلد پنجم، صفحہ ۲۲۵) - مرتب

بود بیت شش بار بیور هزار
سخن های شایستهٔ غم گسار

نه بیند کسی نامهٔ پارسی
نبشته بابیات صد بار سی

وگر باز جویند ازو بیت بد
همانا که باشد کم از پنج صد

چنین شهریاری و بخشنده ای
بگیتی ز شاهان درخشنده ای

نکرد اندرین داستان ها نگاه
ز بد گوی و بخت بد آمد گناه

در افتاد بد گوی در کار من[1]
تبه شد بر شاه بازار من

یہ اشعار ظاہر ہے کہ ایسے وقت لکھے گئے ہیں جب شاہ نامہ اختتام کو پہنچ گیا ہے اور فردوسی کو اپنی تالیف کے اشعار کی تعداد معلوم ہو چکی ہے - وہ ان کی تعداد "شش بار بیور" بتاتا ہے یعنی ساٹھ ہزار - اور کہتا ہے کہ فارسی زبان میں ابھی تک تین ہزار شعروں کی کتاب بھی دستیاب نہیں ہوئی چہ جائے کہ میری کتاب کے ہم پلہ ہو - ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس میں کمزور اور خراب اشعار کی تعداد پانسو سے بھی کم ہوگی - سلطان کی نسبت گویا ہے کہ ایسا بادشاہ جو دنیا کے بادشاہوں میں ممتاز ہے ، تعجب ہے کہ اس نے میری کتاب کی طرف کچھ توجہ نہیں کی - جس کی دو وجہ وہ قائم کرتا ہے - پہلی دشمن کی سعایت دوسری اپنی بد نصیبی - دشمن کی بد گوئی کے ذکر میں وہ کہتا ہے کہ اس نے میرے معاملات

---

۱ - طبع طہران میں :

حسد برد بد گوئی در کار من (مرتب)

میں ایسی کارروائی کی جس سے بادشاہ کی نگاہ میں میرا بازار بالکل تباہ ہو گیا ۔

فردوسی ہم سے یہ نہیں کہتا کہ وہ بد گو کون تھا اور اس کی بد گوئی کی کیا نوعیت تھی ۔ اب ظاہر ہے کہ فردوسی کے تذکرہ نگاروں کے دو فریق (جن میں ایک فرقہ غالباً سنی ہے اور دوسرا شیعی) اور ان کے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے مختلف اقوال ، ایک کا خواجہ احمد بن حسن میمندی کو فردوسی کا دوست اور سرپرست بیان کرنا ، دوسرے فرقے کا خواجہ کو خارجی اور فردوسی کا دشمن کہنا ، برخلاف اس کے ایاز کو فردوسی کا دوست ظاہر کرنا ، دوسرے فرقے کا اس کی تردید میں ایاز کو فردوسی کا دشمن بیان کرنا اور اس کو نقصان پہنچانا وغیرہ وغیرہ ، ہماری رائے میں محض فرضی اور مصنوعی قصے ہیں ، جو دونوں فرقوں نے ان اشعار کی تشریح کے مقصد سے ایجاد کیے ہیں ۔ یہ واضح رہے کہ جب خود فردوسی اپنے دشمن کا نام نہیں جانتا اور اگر حقیقت میں جانتا ہے تو بیان کرنا نہیں چاہتا تو اس کے معاصرین کو بھی صحیح واقعات کی اطلاع نہیں ہو سکتی، چہ جائے کہ ایسے لوگوں کو جو فردوسی کے زمانے اور اس کے واقعات کے بہت عرصے بعد پیدا ہوئے ۔ بد گوئی کی تاویل میں کہا جاتا ہے کہ فردوسی شیعہ یا رافضی تھا ۔ میرے خیال میں یہ تاویل بے کار معلوم ہوتی ہے ، کیوں کہ فریقی تنافر کا یہ قعر عمیق جو سنی اور شیعہ کو فی زمانہ جدا کر رہا ہے اس وقت حائل نہیں تھا ۔ دونوں فرقوں میں تعلقات خوش گوار تھے اور خود سلطان محمود کی دختر امیر منوچہر والی طبرستان کو بیاہی گئی تھی جو شیعہ خاندان سے علاقہ رکھتا تھا ۔ اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ وہ بد گوئی خواہ کسی نوعیت سے کیوں نہ ہو ، اس کے تشیع پر دال نہیں ہو سکتی ۔ کسی سنی کے لیے یہ کہنا کہ وہ سنی ہے بدگوئی کی تعریف میں داخل نہیں ۔ علیٰ ھذا کسی شیعہ کو یہ

کہنا کہ وہ شیعہ ہے بد گوئی نہیں ہو سکتی، البتہ ایک سنی یا شیعہ کو ان زمانوں میں ملحد یا قرمطی کہنا بد گوئی مانا جا سکتا ہے ۔ لیکن واقعہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور ہے کہ فردوسی بطور احتجاج اس کی تکذیب یا تردید کرتا ، بالخصوص جب ہم ناظرین کو یہ اطلاع دیں گے کہ مذکورہ بالا ابیات امیر نصر بن ناصر الدین ، سلطان محمود غزنوی کے سگے اور پیارے بھائی کو خطاب کرکے شاعر نے لکھے ہیں ۔ اس استدلال سے یہی ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فردوسی خود اپنے دشمن اور اس کی دشمنی سے ناواقف محض تھا ورنہ ضرور امیر نصر کو اس کی حقیقی کیفیت سے اطلاع دیتا ۔ اور یہ کہ فردوسی کے مذہب سے اس معاملے کو کوئی تعلق نہیں تھا ۔

یہ امر فردوسی کی طبیعت میں داخل ہے کہ خارجی واقعات سے خواہ خفیف ہوں یا اہم نہایت متاثر ہوتا ہے اور ان کا ذکر بھی بطور جملہ معترضہ شاہ نامے میں ضرور کر دیتا ہے ۔ تعجب ہے کہ فردوسی اپنی عمر بھر کی امیدوں کے خون ہونے کے واقعے کو صرف دو شعروں میں بیان کر دیتا ہے ۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی نا کامی کے اسباب اور ان کے بانیوں سے قطعاً تاریکی میں تھا ۔ البتہ اس قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سلطان کی سردمہری اور بے توجہی اس نا کامی میں ایک نمایاں عنصر تھی ۔

فردوسی کی ناکامی پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مذہبی حلقوں میں فردوسی اپنی تصنیف میں عربوں کے ساتھ منصفانہ اور غیر جانب‌دارانہ سلوک مرعی نہ رکھنے کا ملزم بنایا گیا ہے ۔ الزام اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک درست ہے ۔ اسی بنا پر ملک میں جذبات اس کے خلاف برافروختہ ہو گئے تھے ۔ اس کی تصدیق کتاب 'عمرنامہ' سے ہوتی ہے جو شاہنامے کے رد میں بقول مولانا شبلی ان ہی ایام میں تالیف ہوئی تھی ۔ اس جوش مخالفت کا اثر فردوسی کے خلاف

کہاں تک ہوا اور سلطان کے ہاں اس کی ناکامی میں اس نے کوئی نیا سبب اضافہ کیا ، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ بدیہی ہے کہ فردوسی اپنی زندگی کے ایام میں غیر مقبول ضرور رہا ۔ اس کی حمایت میں رد عمل فردوسی کے زمانے کے بعد کی تحریک ہے ، جب کہ آنے والی نسلوں کو شاہ نامے کی سحربیانی تسخیر کر چکی ہے ۔ اسی طرح مثنوی یوسف زلیخاے فردوسی اس کے نام پر منڈھ دی گئی جس میں ایرانی پرست اور فلسفی طبع فردوسی ایک تائب اور دین دار و متقی مسلمان کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے ۔

فردوسی کی ناکامی کا اصلی سبب میرے خیال میں غریب فضل بن احمد کی تباہی ، قید اور ہلاکت سے تعلق رکھتا ہے[1] ، جو واقعہ شاہ نامے کے اختتام کے قریب زمانے میں رونما ہوتا ہے ۔ ایشیائی درباروں میں کسی شخص کی رسائی اور کامیابی ، ہم یقینی طور پر جانتے ہیں ، بغیر طاقت ور تائید یا سفارش کے ناممکن ہے ۔ محمود کا دربار کسی وقت بھی فریقی مناقشات اور حریفی جدال سے خالی نہیں رہا ۔ طاقت‌ور امرا دربار میں ہر وقت ایک دوسرے کی قوت کے استیصال میں سرگرم نظر آتے ہیں ۔ فضل بن احمد دس سال‌مستقل وزیر رہنے کے بعد اسی قسم کی سازش اور ریشہ دوانی کا شکار ہوا ۔ اس وزیر سے فردوسی کے تعلقات بہت اچھے تھے ۔ فضل عربی زبان اور

---

۱ ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی اس بات کو فردوسی کی محرومی کے اسباب میں سے ایک جانتے ہیں ۔ چنان‌چہ :

"اینکہ فردوسی ابوالعباس فضل بن احمد را مدح گفتہ و او را بشاہنامہ ستودہ است، و چو شاہنامہ را علی التحقیق پس از عزل ابوالعباس بمحمود تقدیم کرد ناگزیر معاندان درباری ابوالعباس فضل بن احمد مداح او را آزار کردند و بسعایت و تخلیط پرداختند ۔"

(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد اول ، صفحہ ۴۸۰) مرتب

عربی علوم سے امی محض تھا ، اسی لیے دفتر کی زبان اس نے فارسی کر دی تھی ۔ ادھر فردوسی ایران کی قدیم عظمت وجلال کے افسانے کا اپنی سادہ مگربرجستہ زبان میں تذکرہ کر رہا تھا ۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ان دو زبردست ہستیوں کے قلوب میں ایک دوسرے کا پاس اور احترام نہ ہو ۔ فردوسی جو بالطبع مدح خوانی اور قصیدہ سرائی سے نفرت رکھتا تھا ، شاہ نامے میں کئی مقام پر فضل بن احمد کی تعریف میں رطب اللسان ہے ۔ دیباچے میں بھی ایک تلمیح اس وزیر کی طرف ہے ۔ ایک اور مقام پر کہتا ہے :

کجا فرش را مسند و مرقد ست
نشستن گہ فضل بن احمد ست

اسی وزیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فردوسی کہتا ہے :

ز دستور فرزانۂ داد گر
پراگندہ رنج من آمد بسر

جس حالت میں کہ فردوسی فضل بن احمد کا آوردہ یا دوست مان لیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ وزیر کے دشمن ہمارے شاعر کو کسی حالت میں کامیاب ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے ۔

آیندہ فردوسی کا کیا طرز عمل رہا ۔ آیا ہجو لکھ کر اس نے اپنے دل کا بخار نکالا یا کوئی اور طریقہ جو اس سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے ، اختیار کیا ؟ غزنیں کے قیام کے دوران میں فضل بن احمد کے علاوہ ایک اور زبردست شخص نے فردوسی کے معاملات میں دلچسپی لی ہے ۔ وہ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین ہے ۔ فردوسی کئی موقعوں پر اس کی مدح میں رطب اللسان ہے ۔ دیباچے میں کہتا ہے :

ز گیتی پرستندۂ فر نصر
زید شاد در سایۂ شاہ عصر

کسی کش پدر ناصرالدین بود
پی تخت او تاج پروین بود
خداوند مردی و رای و هنر
بدو شادمان مہتران سر بسر
بویژہ دلاور سپہدار طوس
کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس

سکندر کی وفات کے موقع پر سلطانی مدح کے ضمن میں فردوسی امیر نصر کے متعلق پھر گویا ہے :

سپہدار[1] و سالار او میر نصر
کز و شادمان ست گردندہ عصر
سپہدار چون بوالمظفر بود
سرلشکر از ماہ کمتر[2] بود
کہ پیروز نام ست و پیروز بخت
ہمی بگزرد کلک او از درخت
ہمیدون سپہ‌دار او شاد باد
دلش روشن و گنجش آباد باد

امیر نصر کے جو مختصر حالات تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں ان سے دریافت ہوتا ہے کہ وہ نہایت قدردان علم و فن تھے ۔ فرشتہ مزاج ایسے کہ مدت‌العمر کبھی منہ سے کسی کو گالی نہیں دی ۔ حنفی علما کا ایک مدرسہ غزنیں میں اپنی یادگار چھوڑا ۔ شعرا کے بڑے قدردان تھے ۔ عنصری جو محمودی دور کا آفتاب مانا جاتا ہے، پہلے پہل انھیں کے مہد شفقت میں پلا اور خود عنصری کو اقرار ہے :

---

۱ ۔ طبع طہران میں 'جہاندار' (جلد چہارم ، صفحہ ۸۳) ۔ مرتب
۲ ۔ طبع طہران میں 'برتر' (جلد چہارم ، صفحہ ۸۳) ۔ مرتب

ز رسم تو آموختم شاعری
بمدح تو شد نام من مشتہر
کہ بودم من اندر جہان پیش‌ازین
کرا بود در گیتی از من خبر
ز جاہ تو معروف گشتم چنین
من اندر حضر نام من در سفر
ز مال و ز نام تو دارم ہمی
ہم اندر سفر زاد و ہم در حضر

القصہ فردوسی نے ان کی طرف رجوع کی اور وہ اشعار پڑھ کر جو دشمن کے حسد اور سلطان کی ناقدردانی سے تعلق رکھتے ہیں ، یوں عرض کرتا ہے :

چو سالار شہ آن سخن ہای نغز
بخواند ببیند بپاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر شوم شادمان
کزو دور بادا بد بدگمان
وزان پس کند یاد بر شہریار
مگر تخم رنج من آید ببار
کہ جاوید باد افسر و تخت اوی
ز خورشید تابندہ تر بخت اوی

ان اشعار میں فردوسی امیر موصوف سے یہی درخواست کر رہا ہے کہ آپ جب اس کتاب "سخن ہای نغز" کو پڑھیں تو امید کرتا ہوں کہ قدردانی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور میں آپ کی فیاضی سے نیل مرام نہ جاؤں گا ، نیز میری یہ درخواست ہے کہ آپ دربار میں بھی سلطان سے میری سفارش کریں ، شاید اسی طرح سے میرا درختِ امید بار آور ہو اور میں کامیاب ہو جاؤں ۔

فردوسی کے مساعی کا امیر نصر کے ہاں کیا نتیجہ برآمد ہوا ؟

ہم بالکل ناواقف ہیں ۔ شاہ نامے میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ۔ یہ کتاب اس وقت تک تقریباً ختم ہو چکی تھی ۔ بعد کے واقعات فردوسی اس میں شامل نہیں کر سکتا تھا ۔ اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ امیر نصر کے ہاں وہ کامیاب ہوا یا محروم رہا لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود کی طرف سے مایوس ہی رہا ۔ اسی مایوسی کے اثر میں شاعر نے یہ اشعار لکھے ہیں :

خنک مرد درویش با دین هوش
فراوان جهانش بمالید گوش
که چون بگذرد زین جهان نام نیک
بماند ازو هم سر انجام نیک
بدان گیتی او را بود بهره ای
بنزدیک یزدان بود شهره ای
نه چون من شده[۱] خوار و برگشته بخت
بدوزخ فرستاده ناکام رخت
نه امید عقبیٰ نه دنیا بدست
ز هر دو رسیده بجانم شکست

(سپری شدن روزگار بهرام ، صفحہ ۸۳۲ ، جلد سوم ، بمبئی ، ۱۲۶۸ھ)

آخری دو شعروں سے اس کی انتہائی یاس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ انھی ایام میں فردوسی کے مایوسانہ خیالات و جذبات کا یہ قطعہ شاہد ہے :

حکیم گفت کسی را که بخت والا نیست
بهیچ وجه مر او را زمانه جویا نیست

۱ ۔ طبع طهران میں 'بود' ۔
(جلد چہارم ، صفحہ ۳۳۳) ۔ مرتب

برو مجاور دریا نشین مگر روزی
بدستت افتد دری کجاش همتا نیست
خجسته درگہ محمود زابلی دریاست
کدام دریا کان را کنارہ پیدا نیست
شدم بہ دریا ، غوطہ زدم، ندیدم در
گناہ بخت من است این گناہ دریا نیست[1]

---

۱ - آقاے میرزا عباس اقبال مجلہ 'مہر' کے فردوسی نامے میں اس قطعے کا فردوسی سے انتساب مشکوک قرار دیتے ہیں :

''از جملہ قصص و اشعاری کہ پس از رنجش خاطر فردوسی از سلطان محمود باین شاعر نامی نسبت دادہ شدہ قصہ و قطعہ شعر ذیل است : ''فردوسی چون عازم شد کہ از غزنی بیرون رود بمسجد جامع در شد و در موضعی کہ سلطان روز جمعہ می نشست این قطعہ را بدیوار نوشت :

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست
چگونہ دریا کان را کنارہ پیدا نیست
چہ غوطہ ها زدم و اندرو ندیدم هیچ
گناہ بخت منست این گناہ دریا نیست

این حکایت باغلب احتمال ساختگی است و در کتب قدیمی اثری از آن دیدہ نمیشود ۔ بهمین وجہ قطعہ فوق نیز معلوم نیست کہ از فردوسی باشد بخصوص کہ یکی از شعرای نیمہ اول قرن هفتم هجری یعنی نظام الدین محمود اصفهانی متخلص بہ قمر از مداحان اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ - ۶۵۸) و خاندان خجندیان اصفهان در قطعہ ای کہ گفتہ بیت آخر قطعہ فوق را صریحاً بعنصری نسبت میدهد و آنرا در قطعہ خود تضمین میکند و بعضی از اشعار قطعہ قمر اصفهانی این است :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یہ اشعار اگرچہ مایوسانہ اور جگر خراش ہیں لیکن ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا قائل کوئی انتقام تجویز کر رہا ہے۔

فردوسی جیسا کہ ہم شاہ نامے کے مطالعے سے سیکھتے ہیں ، ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھا ۔ بلند ہمت اتنا کہ تکلیف اور ظلم یا اور کسی قسم کی بدنصیبی کو صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتا ۔ اگرچہ سلطان کی نا قدردانی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا تاہم کہا جا سکتا ہے کہ وہ رکیک ہجو لکھ کر انتقام لینے کے ناقابل تھا ۔ اس کی شریف طبیعت کے منافی تھا کہ وہی محمود جس کی اس نے اپنی ضخیم کتاب میں بے شمار موقعوں پر مدح خوانی کی ہے ، جس کا تن بقول فردوسی 'ژندہ پیل' اور 'روح جبرئیل' ہے ، اس کا کف 'ابربہمن' ہے ، دل 'دریائے نیل' ہے ، جو بزم میں آسمان وفا ہے اور رزم میں تیز دم اژدہے کی مثال ہے ، جو بھیڑ اور بھیڑیے کو ایک گھاٹ پانی پلاتا ہے ، زمانہ جس کے طفیل باغ سدا بہار بن گیا ہے اور جس کی برکت سے بارش وقت پر آتی ہے ، گہواروں میں شیر خوار اس کا نام لیتے ہیں اور ماہ و کیوان اس کو سجدہ کرتے ہیں ، صرف صلے سے محرومی کی حالت میں ، جس کے لیے محمود نے کسی قسم کی ذمے داری نہیں لی تھی ، اس لیے کہ شاہنامہ فردوسی نے محض اپنے شوق سے شروع کیا تھا :

من این نامہ فرخ گرفتم بفال
همی رنج بردم بہ‌بسیار سال

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

بحسب حال خود از شعر عنصری بیتی
نبشتہ ام بدہ انصاف سخت زیبا نیست
شدم بدریا غوطہ زدم ندیدم در
گناہ بخت منست این گناہ دریا نیست

(دیکھیے مضمون ''تردید یکی از حکایات و یک قطعہ' شعر منسوب بفردوسی ۔'' فردوسی نامہ مجلہ مہر ، صفحہ ۸۰) مرتب

اور محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس پر مصروف تھا :

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

محمود کی اس طرح مذمت کرتا جو پاجیوں اور بازاریوں کا طریقہ ہے[1] ؟

---

۱ - اس سلسلے میں ایرانی محققوں کا استدلال بڑا عجیب ہے - ایک جانب تو وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ شاہ نامہ لکھنا فردوسی نے محمود کے حکم سے شروع نہیں کیا تھا ، چنانچہ :

''ساید از مدایح معدودی کہ در شاهنامہ دیدہ میشود برخی گمان کنند کہ محرک فردوسی در سرودن شاهنامہ امید وی بہ صلۂ آن پادشاہ و آرزوی و استفادۂ مادی بودہ است......ولی...... این گمان بکلی خطاست -''

(وطن پرستیِ فردوسی ؛ از آقاے نصراللہ فلسفی ، مجلہ مہر، فردوسی نامہ ، صفحہ ۲۰) -

دوسری جانب انعام سے فردوسی کی محرومی پر (جس کا باعث فردوسی کے سرپرست کا ادبار ہی ہوسکتا ہے) اس کا محمود کی ہجو کہنا شاعر کا پیدائشی حق سمجھتے ہیں -

ستم بالائے ستم یہ کہ شاهنامے میں جا بجا آنے والے محمود کے مدحیہ اشعار کو فردوسی کی مجبوری کا نتیجہ بیان کرتے ہیں :

''البتہ فردوسی میدانست کہ در چشمِ شاهان زمان و مخصوصاً پادشاهی ترک نژاد و غلام زادہ چون محمود کہ هیچ وابستگی و توجہی بتاریخ گذشتۂ ایران ندارد اشعاری کہ در مدح شخص آنان سرودہ شود از آنچہ در ستایش شہریارانِ قدیم ایران گویند گرامی تر خواهی بود...''

(وطن پرستیِ فردوسی ، از آقاے نصر اللہ فلسفی ، مجلہ مہر ، فردوسی نامہ ، صفحہ ۲۱) -

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فردوسی مال و دولت کا بھی زیادہ فریفتہ نہیں نظر آتا ۔ حرص و طمع کا سب سے زبردست دشمن ہم فردوسی میں دیکھتے ہیں ۔ اس کے فلسفے میں صرف تین اشیا ضروریات زندگی میں تسلیم کی گئی ہیں ۔ غذا ، لباس اور بستر ۔ باقی خواہشات اس کے نزدیک آز کی فہرست میں داخل ہیں اور ممنوعات میں شمار کی گئی ہیں ۔ مال کے لیے اس کا قول ہے :

ز بہر درم تند و بدخو مباش
تو باید کہ باشی درم گو مباش
کسی کو بگنج و درم ننگرد
ہمہ روز اوبر خوشی بگزرد

کیا ایسے اصول کا پابند اور ان مواعظ کا تلقین کنندہ ، ہم خیال کر سکتے ہیں ، انعام کے لالچ میں سلطان سے بگاڑتا اور اس کی مذمت کرتا ؟

شاہ نامہ ایک عظیم کتاب ہے ۔ اس میں فردوسی نے دوست اور دشمن دونوں کا ذکر کیا ہے ۔ مگر کوئی موقع ایسا نظر سے نہیں گزرا جہاں فردوسی یاس و قنوط ، رنج و غصہ اور طیش میں آکر اپنی متانت اور تہذیب کو ہاتھ سے کھو کر عامیانہ زبان استعمال کرے چہ جائے کہ وہ زبان ، جو کہا گیا ہے ، فردوسی نے ہجو میں سلطان کے حق میں استعمال کی ہے ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

اور اس طرح فردوسی کو محمود کا بدنیت اور ریاکار مادح تسلیم کرنے کے بعد اس کے لیے نہایت ڈھٹائی سے صلے کا تقاضا کرتے ہیں اور اس میں کوتاہی پر محمود کو سب و شتم کا نشانہ بناتے ہیں - اگر فردوسی زندہ ہو سکتا تو یقیناً اپنے ان طرف داروں کی خدمت میں عرض کرتا کہ : ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو (مرتب)

یہاں ہمیں اس سوال پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ آیا فردوسی کو ہجو لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں ؟ اس بارے میں عرض ہے :

قدیم سے یہ خیال ہمارے ذہنوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہے کہ سلطان محمود نے فردوسی سے شاہ نامہ لکھنے کی فرمائش کی ۔ فی بیت ایک دینار (سونے کا سکہ) دینے کا وعدہ کرکے آخر میں اپنے قول سے پھر گیا اور دیناروں کے بدلے ساٹھ ہزار درہم (چاندی کا سکہ) بھجوا دیے ۔ اس وعدہ شکنی اور بد معاملگی کی بنا پر شاعر نے سلطان کی ہجو لکھی ۔ یہ بدسلوکی فردوسی کے لیے ہجو لکھنے کی محرک بن سکتی ہے لیکن اصلی واقعہ جیسا کہ فردوسی کے اپنے بیان سے معلوم ہوتا ہے، یوں ہے کہ شاعر اپنی شہرت اور مالی منفعت کی امید میں شاہ نامہ کی نظم پر مستعد ہوا اور سلطان محمود کی تخت نشینی سے پہلے بیس سال تک اس پر کام کرتا رہا ۔ اس کی تاج پوشی کے وقت غزنیں آیا ، جہاں چھ سال رہ کر اس نے شاہ نامے کو تقریباً ختم کر دیا ۔ ابتدا میں حالات ساز گار تھے ۔ آخر میں دشمنوں کی بد گوئی کی وجہ سے سلطان کے دربار سے قطعاً محروم گیا ۔ محمود کو شاہ نامے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ، نہ اس نے اس کی نظم کا حکم دیا ۔ اس صورت میں کیا فردوسی سلطان کی ہجو لکھنے میں حق بجانب مانا جا سکتا ہے ؟ وہ قدردانی کی امید میں آیا تھا ، اس امید میں اس کو نا کامی ہوئی ۔ اس کی تیس پینتیس سال کی محنت کا اکارت جانا شاعر کی زندگی کا تلخ ترین واقعہ ہے ۔ مگر سلطان کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ خود فردوسی اس نامرادی کو اپنی بدنصیبی پر محمول کرتا ہے ۔ ہم زیادہ سے زیادہ جامی کے ہم زبان ہو کر سلطان کے حق میں کہہ سکتے ہیں :

گذشت شوکت محمود و در زمانہ نماند
جز این فسانہ کہ نشناخت قدر فردوسی

مگر یہ نا قدردانی ہجو کے واسطے وجہِ جواز نہیں بنائی جا سکتی -

ہمارے تذکرہ نگاروں کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں جنھوں نے فردوسی کو ہر ذلیل و مذموم فعل کا مرتکب بنا دیا ہے - اس کے دامن پر نہ صرف ہجو کا داغ ہے جو بھک منگے اور ٹکڑ گدے شاعروں کا آلہ ہے ، بلکہ اس کے علاوہ کئی اور دروازوں پر ، جس میں والیانِ ماژندران ، قہستان ، طبرستان اور بغداد شامل ہیں ، سر پر شاہ نامے کی عظیم مجلدات کا پشتارہ اور ہاتھ میں کاسۂ گدائی لیے بھجوایا ہے - یہاں وہ قصیدہ لکھتا ہے ، وہاں وہ یوسف زلیخا تصنیف کرتا ہے - قصہ مختصر انھوں نے ہر ناممکن شے کو ممکن کر دکھایا ہے - یہ یاد رہے کہ اسّی برس کا پیر فرتوت ، بڑھاپے نے جس کی کمر دوہری کر دی ہے ، آنکھوں سے جس کو بہت کم سجھائی دیتا ہے ، کانوں سے تریسٹھویں برس میں بہرا ہو گیا تھا ، جس کے اعضا میں لرزہ اور رعشہ غلبہ پا چکا تھا اور جو عصا کی مساعدت کے بغیر ایک قدم بھی حرکت نہ کر سکتا تھا ، ان دراز سفروں میں کیوں کر اپنا جسم سنبھالنے اور سفر کرنے کے قابل ہو سکا - اور پھر سلطانی تعاقب سے بچ کر کئی سال آوارہ وطن رہ کر اپنی تصنیفات لیے لیے اجنبی رؤسا کے درباروں میں پہنچ کر رسائی بھی پیدا کر لیتا ہے - ایسے خلاف معمول واقعات الف لیلہ کی کہانیوں میں البتہ ملتے ہیں ، نہ تاریخی اوراق میں - فردوسی کا یہ سفر سند باد بحری کے سفر سے کیا کم کہا جا سکتا ہے ؟

ہجو کے باب میں خاتمۂ شاہ نامہ بھی کسی قدر روشنی ڈالتا ہے - شاعر کی عمر کے اکہترویں سال یا ۳۹۳ھ میں شاہ نامہ ختم ہو جاتا ہے - چناں چہ یہ شعر :

چو سال اندر آمد بہفتاد و یک

همی زیر شعر اندر آمد فلک

۴۰۰ھ میں آخری مرتبہ اس نے شاہ نامے کو ہمیشہ کے لیے

بند کرنے کی غرض سے خاتمے میں قلم اٹھایا ہے ۔ ان دو تاریخوں کے درمیان سات سال کا پردہ حائل ہے ۔ اچھا ! فردوسی اس عرصے میں کیا کرتا رہا اور کس شغل میں رہا ؟ غالباً وہ شاہ نامے کی درستی ، تصحیح اور ترتیب میں مشغول رہا ، یا جیسا کہ اس کے تمام تذکرہ نویس مدعی ہیں سفر اور مختلف شہروں میں بسر کرتا رہا ۔ اگر واقعی فردوسی نے ہجو لکھی ہے تو بہرحال ان سات سالوں کے اندر اندر لکھی جا چکی ہوگی اور قیاس سلیم بھی اسی نظریے کا متقضی ہے ۔ لیکن ہم یہاں پھر دیکھتے ہیں کہ فردوسی ان آخری ابیات میں بھی سلطان کے ذکر میں مشغول ہے؛ اگرچہ یہاں وہ مدح گستری نہیں کرتا تاہم ایسے الفاظ میں سلطان کا ذکر کر رہا ہے جن سے ظاہر ہے کہ اس کے جذبات سلطان کی طرف سے تلخ نہیں ہیں ۔ وہ کہتا ہے :

سی و پنج سال از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج

چو برباد دادلد رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا

کنون عمر نزدیک هشتاد شد
امیدم بیکباره برباد شد

ان ابیات میں اس کے دلی جذبات بھرے ہیں ۔ اگرچہ وہ مایوس اور محروم نظر آتا ہے ، اگرچہ اس کی تمام آرزوؤں کا خون ہو چکا ہے ، تاہم وہ غضب ناک نہیں ہے ۔ نہ اس نے اب تک ہجو لکھی ہے ، نہ اس کے لکھنے پر مائل ہے ۔ یہ شکستہ دل بوڑھا شاعر جس کو نواسی اسّی سردیوں نے بالکل ضعیف ، فرسودہ اور افسردہ کر دیا ہے ، اپنے بادشاہ کے حق میں ہاتھ اٹھا کر یہی دعا دیتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے :

تن شاه محمود آباد باد
همیشه بکام دلش شاد باد[1]
چنانش ستودم که اندر جهان
سخن ماند ازو آشکار و نهان
همش رای[2] وهم دانش وهم نسب
چراغ عجم ، آفتاب عرب

فردوسی کی محرومی کے متعلق نظامی گنجوی بھی تلمیح کرتے ہوئے ناصرالدین سے کہتے ہیں :

بیاد نظامی یکی طاس می
خوری هم به آئین کاؤس کی
ستانی به این طاس طوسی نواز
حق شاه نامه ز محمود باز
دو وارث شمار از دوکان کهن
ترا در سخا و مرا در سخن
بوامی که ناداده باشد نخست
حق وارث از وارث آید درست

اور بہرام نامہ کی تمہید میں فرماتے ہیں :

در سخا و سخن چو می پیچم
کار بر طالع است من هیچم

---

۱ ۔ طبع طہران میں :

سرش سبز بادا دلش شاد باد

(جلد پنجم ، صفحہ ۳۳۵) ۔ مرتب

۲ ۔ یہ شعر کلکتے کے شاہ نامے اور دیگر قلمی و مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا ۔ ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۷۵۲ھ سے جو ، باعتبار عمر قدیم ترین نسخہ ہے ، جو میری نظر سے گزرا ہے ، نقل ہوا ہے ۔
(حاشیۂ مصنف)

نسبت عقربی است یا قوسی
بخل محمود و بذل فردوسی
اسدی را کہ جود او بنواخت
طالع و طالعی بہم در ساخت

لیکن شیخ عطار پیلبار انعام دیے جانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعر نے اپنی عالی‌حوصلگی کی بنا پر سلطان کے صلے کو قبول نہیں کیا :

اگر محمود اخبار عجم را
بداد آن پیل و لشکروان درم را
اگر تو شعر آری فیل داری
نیابی یک درم در روزگاری
چہ آن گر فیل وارش کم نہ ارزید
بر شاعر فقاعی ہم نہ ارزید
زہی ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ
کنون بنگر کہ چون برگشت از راہ

(الٰہی نامہ ، کلیات عطار ، صفحہ ۹۳۴ ، نولکشور)

شہر یار نامہ مختاری[1] میں بھی ہجو کی نسبت اشارہ پایا جاتا

۱ - انگریزی ماہرین مختاری کو سلطان محمود غزنوی کے جانشین سلطان مسعود شہید کا معاصر مانتے ہیں اور مختاری کا یہ شعر ان کے خیال کا موید ہے :

گل باغ سلطان محمود شاہ
جہان جوی بخشندہ مسعود شاہ

میرے خیال میں یہ مختاری عثمان مختاری غزنوی ہے - شہریار نامہ کی زبان کی روانی اور صفائی دیکھتے ہوئے ہم کو اس کا زمانہ علاءالدین مسعود بن ابراہیم کے عہد میں ماننا پڑے گا اور کوئی تعجب نہیں اگر بہمن نامہ اور شہریار نامہ ایک ہی دور کے یادگار ہیں -
(حاشیۂ مصنف)

ہے ۔ میں اس شاعر کا زمانہ تعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں ۔ ہجو کا ذکر ان اشعار میں ہے :

چو مختاری آن بارور داستان
بنام تو گفت ای شہ راستان
گرم ہدیہ بخشی درین بارگاہ
بہ پیش بزرگان با عز و جاہ
شوم شاد ، افزون شود جاہ تو
ہمان مدح گویم بدرگاہ تو
وگر ہدیہ ندھی ایا شہریار
نرنجم کہ ہستی خداوند گار
زبان من از ہجو کوتاہ باد
ہمیشہ ثنا گوی این شاہ باد

ہجو کے بارے میں عالمگیر اعتقاد کے باوجود میری سوءِ ظنی تعجب کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی بالخصوص جب کہ میں اس عقیدے میں بالکل تنہا ہوں اس لیے کہ ہجو سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا ہے اور نہ کسی قسم کا اشتباہ اس پر کیا گیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے ، میں محض شاہ نامے کی سند پر اس کے وجود سے منکر ہوں ۔ اس مسئلے کا بہترین فیصلہ تنقید کے ہاتھ میں ہے جو ذیل میں آتی ہے ۔

ہجو کی ابتدا اور تعمیر

پیشتر اس کے کہ تنقید کے میدان میں خامہ فرسائی کی جائے چند کلمات ہجو کی اصلیت اور ساخت کے متعلق کہنا بادی النظر میں غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا ۔ بقول دیباچہٗ قدیم ہجو کل دو تین ابیات پر محدود تھی ۔ لیکن ہم ان اشعار سے واقف نہیں ہو سکے ۔ بقول نظامی عروضی وہ کلہم چھ اشعار ہیں ۔ ان سے ہم واقف ہیں

لیکن نظامی کے بیان کو ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے - حقیقت یہ ہے کہ ان چھ میں بھی دو شعر شاہ نامے سے سرقہ کیے گئے ہیں - پہلا : پرستار زادہ نیاید بکار . . . الخ - دوسرا :

ازین در سخن چند رانم همی
چو دریا کرانه ندانم همی

یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں نظامی کے قول کو ہم بد اعتقادی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس عقیدے پر قائم ہو جاتے ہیں کہ ابتدا میں ہجو کی کوئی اصلیت نہیں تھی اور یہ کہ اس کا آغاز فردوسی کے زمانے کے بعد ہوا ہو گا -

ہجو کی ولادت کا قصہ ہمیشہ کے لیے ایک سر بستہ راز رہے گا جس طرح کہ فردوسی کے متعلق اور واقعات - شاہ نامے کی عالم گیر شہرت اور سلطان کے ہاں سے فردوسی کی ناکامی کے قصے غالباً اس کی تولید کے ذمے دار ہیں - ہر شخص آشوب ماژندرانی کے مانند تنگ چشم اور متعصب نہیں تھا - فردوسی کی حمایت میں رد عمل غالباً پانچویں صدی ہجری میں شروع ہو چکا تھا ، جس کے ابتدائی جراثیم ہم دیباچۂ قدیم میں دیکھتے ہیں اور ہجو کی داغ بیل اسی زمانے میں پڑ چکی تھی - لیکن اس کی بالیدگی کی رفتار نہایت تدریجی تھی حتیٰ کہ وسط قرن ششم میں اس کا وجود کلہم چھ ابیات پر منحصر تھا - فردوسی پرست جماعت اب ملک میں ہر طرف نظر آتی تھی - شاہ نامے کے اشعار عوام کی زبان پر تھے - بادشاہوں کے محل ان سے گونجتے تھے ، خطیبوں کے منبر سے وہ سنائی دیتے تھے اور میدان جنگ میں تیغ و شمشیر کی جھنکار اور بوق و نائے کی آواز کے ساتھ ساتھ فردوسی کی رجز خوانی بھی مسموع ہوتی تھی - جب شاہ نامہ اس طرح ملک میں چاروں طرف اپنی ہردلعزیزی کا سکہ بٹھا چکا ہے تو ظاہر ہے کہ عوام کو فردوسی کے حالات اور سوانح زندگی کی بھی تلاش ہوئی ہوگی -

سلاطین اسلام کے دربار میں شعرا کا طبقہ ایک خاص امتیاز رکھتا تھا ۔ اپنے اقتدار کو ثبات اور ترقی دینے کی غرض سے اس جماعت نے ایک نئی قسم کے فلسفے کی بنیاد ڈالی تھی ۔ جس میں بادشاہوں کے بقائے نام اور اس کی غیر فنائیت اپنے فرقے کی بہبود ، تربیت اور قدر شناسی کے ضمن میں ثابت کی تھی ۔ مختاری کہتے ہیں :

گرچہ مردم ز عمر بر گزرست
عمر ثانی مدایح شعر است
زندہ رستم بشعر فردوسی ست
ورنہ زو در جہان نشانہ کجاست
عنصری را ز زر محمودی
آن چنان شعر ھای بیش بہاست
جان گدازی ست شاعری کردن
چون بہا دادنش بصلہ سزا ست
غرض از آفرینش شعرا
مدحت پادشاہ باشد راست

اس فرقے نے اپنی حفظ نوع کے لیے ایک ہتھیار بھی ایجاد کیا تھا جس کو اظہار خوشنودی اور انتقام کے وقت وہ استعمال کرتا تھا ۔ اس کا نام ہجو یا ہجا یا مذمت تھا ان کا قول تھا :

کہ شاعر چو رنجد بگوید ھجا
بماند ھجا تا قیامت بجا

اسلام کی طاقت ور سلطنتیں ، اگر چہ یوں تو ان کی وسیع طاقت کی قانون انسانی یا قانون الٰہی بھی حد بندی نہیں کر سکتا تھا لیکن شعراء ان کے ہاں ابتدا ہی سے اپنا زبردست اقتدار اور اثر قائم کر چکے تھے ۔ انھوں نے اپنے بارے میں ان شاہانہ اور مستبدانہ اختیارات

کو بہت کچھ معتدل کر دیا تھا ۔ اتفاق سے محمود اور فردوسی کے ناخوش‌گوار تعلقات کا راوی بھی یہی طبقہ ہے ۔ کیونکہ ہم عصر تاریخیں اس مقدمے میں بالکل خاموش ہیں ۔ اس جماعت نے اس قصے میں اپنی تعلیم کی تائید کے حق میں نہایت ضروری اجزا پائے ، اس کی شہرت میں اپنی حفاظت کا سامان دیکھا ۔ اس لیے اس افسانے کو انھوں نے بہت کچھ آب و تاب دے کر مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ ہر موقع پر بیان کرنا شروع کیا ۔ محمود اگرچہ اسلام کے طاقت‌ور اور اولوالعزم بادشاہوں میں سے ہے مگر فردوسی کے انتقام نے اس کو ہمیشہ کے لیے نگاہوں میں ذلیل کر دیا ہے ۔ وہ ہر سلطان اور امیر کے لیے سبق عبرت بنایا گیا ہے ۔ شعرا کے ساتھ سلوک مرعی رکھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے ورنہ کہیں وہی حشر نہ ہو جو محمود غزنوی کا ہوا ۔ محمود اور فردوسی کا افسانہ بار بار دہرایا گیا اور سنایا گیا اس صورت میں ہجو کی ہر طرف تلاش کی گئی ہوگی ۔ ہر شخص اس کے دیکھنے اور پڑھنے کا مشتاق ہوگا ۔ اگرچہ شروع میں لوگ یہی کہتے رہے کہ وہ غائب ہو گئی لیکن یہ امر انسانی بالخصوص شاعر کی طبیعت کے منافی تھا کہ ہجو کا فقدان ہمیشہ کے لیے مانا جائے ۔ فردوسی کے ہم مشرب ہر وقت اور زمانے میں موجود تھے ۔ آخر کار ان کی کوششوں نے اس گوہرِ گم گشتہ کو بھی پیدا کر لیا اور رفتہ رفتہ شاہ نامے کے ہر نسخے کے ساتھ شائع ہونے لگی حتیٰ کہ اس کا اصلی جزو بن گئی ۔ متأخرین نے کبھی اس کی مصنوعی ہستی کا احتمال تک نہیں کیا اور آج یہ جعلی نمونہ اسی قدر فردوسی کا اصلی کلام مانا جاتا ہے جیسے فردوسی کا اور صحیح کلام ۔ عوام الناس شاہ نامے سے واقف نہیں لیکن ہجو کے اشعار سے بچہ بچہ تک آگاہ ہے ۔ ہجو کی مقبولیت اس میں شک نہیں شاہ نامے کی مقبولیت سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور ہم جو کہ اس عام غلطی اور ایک غیر تاریخی

واقعے کی تکذیب میں قلم اٹھا رہے ہیں ، اس کے افشا کرنے سے خود متأمل اور متفکر معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ جس مقبولہ اور عام غلطی میں ہم نے پرورش پائی ہے اس کے ابطال کو ہمارا دل گوارا نہیں کرتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ فردوسی کے افسانے جو اسلاف نے ترکے میں ہم تک پہنچائے ہیں ، کچھ ایسے دل کش ، خوش آیند اور دل فریب ہیں کہ ان کی تصدیق سے انکار کرنے کو ہمارا دل نہیں مانتا ۔ ہم ایک طرف ایک جلیل القدر نوجوان سلطان کو دیکھتے ہیں جس کے اشارہ چشم پر لاکھوں تلواریں ایک دم میں برہنہ ہوسکتی ہیں اور لاکھوں سر بے دوش ہو سکتے ہیں ۔ جو انسانی طاقت کے انتہائی معراج پر ہے اور طیش میں ہے ۔ اس کے مقابلے میں ایک پیر منحنی کو دیکھتے ہیں جس کا جسم بھی اس کے قابو میں نہیں ۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک قلم ہے ۔ غصہ نے اس کے ابروؤں پر شکن ڈال دی ہے ۔ اس جنگ میں کون جان سکتا تھا کہ بوڑھے کی فتح ہو گی مگر ایسا ہی ہوا ۔ یہ بوڑھا ماہر اپنے قلم سے صفحۂ قرطاس پر کچھ لکھتا نظر آتا ہے اور کسی قریب کے آدمی کے ہاتھ میں وہ کاغذ دے کر بغیر کسی سمت نظرڈالے رخصت ہوجاتا ہے ۔ قلم شمشیر سے زیادہ طاقت‌ور ہے ۔ اس مقولے کا ثبوت اس جنگ جذبات میں ملتا ہے ۔ جب اس کاغذ پر سلطان نظر ڈالتا ہے تو غصے سے آتش و شعلہ بن جاتا ہے ۔ وہ اس بوڑھے کی گرفتاری ، قتل اور ہلاکت کا حکم دیتا ہے لیکن بوڑھا گویا غزنیں سے پر لگا کر اڑ گیا تھا ، نہ ملا پر نہ ملا ۔ فردوسی دارالاسلام بغداد پہنچ چکا تھا اور محفوظ تھا ۔ آتش مزاج سلطان اپنی طاقت کا اندازہ کر کے امیرالمومنین کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیتا ہے اور بغداد کی خاک کو ہاتھیوں پر لدوا کر غزنیں منگوانے کی دھمکی دیتا ہے ۔ لیکن فردوسی حوالے نہیں کیا جاتا ۔ اس طرف فردوسی کی ہجو اپنا کام کر رہی ہے ۔ وہ آتش صحرا کی مانند سرعت

کے ساتھ شہر بہ شہر ، قصبہ بہ قصبہ ، کوچہ بہ کوچہ ، خانہ بخانہ پھر رہی ہے ۔ اسے جوان بھی پڑھتے ہیں ، بوڑھے بھی پڑھتے ہیں اور بچے بھی جانتے ہیں ۔ نوجوان سلطان بہ ایں ہمہ جلال و شوکت اس خوفناک انتقام کے لیے مستعد نہیں تھا ۔ اس کا غصہ کافور ہو جاتا ہے ؛ وہ پشیمان ہوتا ہے ، تلافی مافات اور فردوسی سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور ظفر فردوسی کے پرچم پر لہراتی ہے ۔ فردوسی کی حسرت ناک موت اور انعام کی بے وقت آمد بھی کچھ ایسا دردخیز واقعہ ہے کہ ہم اس سے انکار کرنے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتے ۔ ہم میں قدرتاً غرائب پسندی کا مادہ موجود ہے اور یہی پسند آتا ہے کہ فردوسی ایک غیر معمولی آدمی تھا ۔ اس غیر معمولی آدمی کی موت بھی غیر معمولی طریقے سے ہونا چاہیے ۔ ہم کو اسی میں لطف ملتا ہے کہ فردوسی کے لیے ایسی مرگ پسند کریں اور پھر درد کے مزے لے لے کر اور ہاتھ مل مل کر کہیں :

نوش دارو کہ پس از مرگ بسہراب دهند

عجوبہ پسند طبائع سے اگر یہ کہا جائے کہ فردوسی کے حالات جو اسلاف نے ہمارے لیے ودیعت چھوڑے ہیں تاریخی افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تو وہ ہرگز ہرگز باور نہیں کریں گے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے بچپن کے سبق کو جوانی اور بڑھاپے میں بھولنا نہیں چاہتے ۔ عام اس سے کہ ہماری شاہراہ ہم کو ترکستان لے جائے یا کعبے ۔ وہ تاریخی اغلاط جو ہمارے ادب کی روح و رواں بن گئی ہیں اور صدیوں سے جن پر ہماری نسلوں نے تعلیم پائی ہے ، ہم کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں کہ طشت از بام ہوں ۔ لیکن تاریخ اور ہے اور افسانہ اور ہے اور مورخ کو اپنے تلخ فرائض بھی ادا کرنے چاہییں ۔

یہاں میں ہجو کی تعمیر و ترتیب کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں ۔ مختلف نسخوں میں ہجو کے اشعار دو عنوان

سے شروع ہوتے ہیں :

(الف) ایا شاہ محمود کشور کشای
زکس گر نہ ترسی بترس از خدای

(با) الا ای خرد مند صاحب خبر
بگفتار و کردار من در نگر

"ہجو الف" ایک سو دو ابیات ہیں ۔ بمبئی اور نولکشوری نسخوں میں ان کی تعداد ایک سو پانچ ہے[1] ۔ 'ہجو با' میں ایک سو چونتیس اشعار نظرآتے ہیں ۔ قاضی نوراللہ شوستری 'مجالس المومنین' میں پوری ہجو نقل کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں کل انہتر ابیات ہیں ۔ ایک قلمی نسخے میں جو نویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتا ہے اُنتیس بیت پائے جاتے ہیں اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہجو کے متعلق ہر شاہ نامے میں کچھ نہ کچھ اختلاف یا کمی بیشی ملے گی ۔ اور اگر ان تمام اختلافات کو جمع کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ کل ابیات کی تعداد دو سو سے زائد ہو جائے گی ۔

قاضی نوراللہ شوستری کے ہاں اگرچہ ہجو کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے تاہم مندرجہ ذیل وہ اشعار ہیں جو کلکتہ کے شاہ نامے میں نہیں ملتے ۔

(۱) چو سلطان دین بد نبی و علی
بفر الٰہی و شان یلی

(۲) زلال روان بخش آن نظم پاک
در آتش فکند و نیاورد باک

---

۱ ۔ شاہ نامہ مطبوعہ طہران میں بھی ہجو الف شامل کی گئی ہے جس کے ایک سو پانچ اشعار ہیں ۔ ملاحظہ ہو جلد پنجم ، صفحہ ۳-۱۸۱، طبع ۱۳۱۲ ہجری شمسی ۔ البتہ بعض اشعار اور ان کی ترتیب میں اختلاف ہے ۔ (مرتب)

(۳) اگرچہ شود کشتہ آتش ز آب
و لیکن شد آن آب زاتش خراب

یہ دو شعر دیباچہ' بایسنغرخانی کے متن میں منقول ہیں - معلوم نہیں قاضی صاحب نے انھیں ہجو میں کیوں شامل کر دیا :

(۴) چوقول شہ از جود بنوشت لخ
حدیث فقع را نوشتم بہ یخ

(۵) جہان‌را چنین است آئین و ساز
کہ سازد فرومایہ را سرفراز

(۶) ستاند ز خاک و رساند بتخت
کند یار مندش بہ نیروی بخت

(۷) نداند نکوئی شود ناسپاس
نہ باشد خداوند را حق شناس

یہ تینوں شعر کسی نسخے میں نظر سے نہیں گزرے :

(۸) اگر در کف پای پیلم کنی
تن ناتوان ھمچو نیلم کنی

یہ شعر معلوم نہیں کلکتے والے شاہ نامے اور اس کی تقلید میں بمبئی اور نولکشوری شاہ نامے سے کیوں خارج کر دیا گیا - خواجہ حسن میمندی کی ہجو میں ، قاضی نوراللہ کہتے ہیں کہ فردوسی نے یہ اشعار لکھے :

(۹) بدل هر کہ بغض علی کردجای
ز مادر بود عیب آن تیرہ رای

(۱۰) کہ ناپاک زادہ بود خصم شاہ
اگر چند باشد بایوان و گاہ

(۱۱) زمیمندی آئین مردی مجوی
ز نام و نشانش مکن جستجوی

(۱۲) قلم برسر اوبزن همچومن
که گم باد نامش بهر انجمن

ان کا پتہ کسی نسخے میں نہیں چلتا ۔ دیباچۂ بایسنغری میں البتہ درج ہیں اور اگرچہ فردوسی کی طرف منسوب ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کی تصنیف کا حق صاحب دیباچہ ہی کو حاصل ہے ۔ "ہجو الف" میں مندرجہ ذیل ابیات ایسے ہیں جو "ہجو با" میں نہیں ملتے :

(۱) که پیش ازتوشاهان فراوان بدند
همه نام داران گیهان بدند

(۲) فزون از تو بودند یکسر بجاه
بگنج و سپاه و به تخت و کلاه

(۳) نه کردند جز خوبی و راستی
نگشتند گرد کم و کاستی

(۴) همه داد کردند بر زیر دست
نبودند جز پاک یزدان پرست

(۵) نجستند از دهر جز نام نیک
و زان نام جستن سر انجام نیک

(۶) هر آن شه که دربند دینار بود
به نزدیک اهل خرد خوار بود

(۷) چه گفت آن خداوند تنزیل ووحی
خداوند امر و خداوند نهی

(۸) که من شهر علمم علیم درست
درست این سخن قول پیغمبرست

(۹) گواهی دهم کین سخن رازاوست
توگوئی دوگوشم بر آواز اوست

(۱۰) چوباشد ترا عقل وتدبیر ورای
به نزد نبی و علی گیر جای

(۱۱) گرت زین بد آید گناه من است
چنین ست و این رسم و راه من است

(۱۲) ابا دیگران مر مرا کار نیست
بدین در مرا جای گفتار نیست

(۱۳) چو بر تخت شاهی نشاند خدای
نبی و علی را بدیگر سرای

(۱۴) من این نامهٔ شهر یاران پیش
بگفتم بدین نغز گفتار خویش

(۱۵) ازان گفتم این بیت های بلند
کہ تا شاہ گیرد ازین کار پند

(۱۶) کزین پس بداند چه باشد سخن
باندیشد از پند پیر کهن

(۱۷) دگر شاعران را نیازارد او
همان حرمت خود نگہ دارد او

(۱۸) کہ شاعر چو رنجد بگوید هجا
بماند هجا تا قیامت بجا

(۱۹) بنالم بدرگاه یزادان پاک
فشاننده بر سر پرا گنده خاک

(۲۰) کہ یارب روانش بآتش بسوز
دل بندهٔ مستحق بر فروز

بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں یہ تین شعر ملتے ہیں :

(۱) کہ سفلہ خداوند هستی مباد
جوان مرد را تنگ دستی مباد

(قاضی نوراللہ کے ہاں بھی یہ بیت موجود ہے)

(۲) چو پروردگارش چنین آفرید
نیابی تو بر بند یزدان کلید

(۳) بزرگی سراسر بگفتار نیست
دو صد گفته چون نیم کردار نیست

'ہجو با' میں اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے جیسا کہ اوپر گزارش ہو چکا ہے۔ ابیات آیندہ اس میں سے ایسے ہیں جو 'ہجو الف' سے غیر حاضر ہیں :

(۱) الا ای خردمند صاحب خبر
بگفتار و کردار من در نگر

(۲) میانجی میان من و شاه باش
بحق خدا کز حق آگاه باش

(۳) مرا نظم شهنامه فرموده شاه
درآن دم که بنشست شادان بگاه

(۴) که بخشد ز هر بیت زر یک درم
هر آنچ آورم نظم از بیش و کم

(۵) بشش بیور این نامه و شش هزار
بگفتم نه کرد ایچ در من نظار

(۶) حسد برد بد گوی در کار من
تبه کرد بر شاه بازار من

(۷) سخن های شائستهٔ غم گسار
بگفتار بد گوی بگذاشت خوار

(۸) چو برباد دادند رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا

(۹) چنین شهر یاری و بخشندهٔ
بگیتی ز شاهان درخشندهٔ

(۱۰) بدین گونه بگذشت از قول خود
بر آورد بر قول خود بول خود

(۱۱) نه ممسک بد این پادشاه ونه زفت
که ازوی کم این سخن هاشنفت
(۱۲) چوقول شه از جود بنوشت نخ
حدیث فقع بر نوشتم به یخ
(۱۳) چو گفتار شه می کند زر بسیم
نباشد همی نام او جز لئیم
(۱۴) نژادش چواز بیخ شاهی نرست
بگفتار زینسان بود نادرست
(۱۵) شهی راکه از طبع درویش بود
بشهنامه او را نشاید ستود
(۱۶) نمیرم ازین پس که من زنده ام
که تخم سخن را پراگنده ام
(۱۷) نمردست و هرگز نمیرد سخن
سخندان ز من این سخن فهم کن
(۱۸) چنین گفته بداوکه بوده است گیو
همان رستم و طوس و گودرز نیو
(۱۹) مرا در جهان شهریاری نواست
بسی بندگانم چو کیخسرو است
(۲۰) نه خسرو نژادی نه والا سری
پدر زاصفهان بود آهنگری
(۲۱) اگر چند بودند آهنگران
نه از شاه بد شان نژاد گران
(۲۲) گر او را نبودی نژاد اندرش
تهمتن ندادی بدو دخترش
(۲۳) سر این نامهٔ شهریاران بخوان
سر از چرخ گردون همی بگزران

(۲۴) که آن شهریاران چو تو شهریار
بسی بود شان پیکان پیش کار
(۲۵) نگشتند هرگز بگفتار خویش
بهشتند مردم ز آزار خویش
(۲۶) چو این نامور نامه آمد به بن
پشیمان شد از گفتهای کهن
(۲۷) کرم بین به نزدیک شاه فقیر
بگوی و ز گفتار حق وامگیر
(۲۸) نه نیکو بود حق نگه داشتن
بخاشاک ایمان بر انباشتن
(۲۹) ازان گفتم این را که تا انجمن
نجویند ازین گفتها عیب من
(۳۰) خرد نیست مر شاه محمود را
که بینم دلش مانع جود را
(۳۱) حدیث پیمبر نگشت است رد
شود هر شی راجع اصل خود
(۳۲) نه محمود غزنین که محبوب حق
ز شاهنشهان برد بی شک سبق
(۳۳) شهنشاه محمود کاندر جهان
ورا شیر یزدان بود پهلوان
(۳۴) نکردی تو در نامهٔ من نگاه
که روزی نبودت نکوئی ز شاه
(۳۵) بگفتا حسن کرپز یاوه گوی
نشاید شنیدن سخن زشت اوی
(۳۶) صد افسوس دارم ز عمر عزیز
که ممدوح گشتم بر آن بی تمیز

(۳۷) بگفتار بد گوی این نام بد
پذیرفتی و بد نهادی بخود
(۳۸) مرا نام بادا ترا گنج و مال
که این جاودان ست و آن پائمال
(۳۹) ولیکن چو دارندهٔ لم یزل
قلم رانده بد این چنین در ازل
(۴۰) نیاید ز ما با قضا چارهٔ
نسودی کند هیچ پتیارهٔ
(۴۱) اگر گشت ویران بدین شاه گنج
مرا گشت آباد گنجم ز رنج
(۴۲) که نزد خداوند جان آفرین
بسی می برم زین جهان آفرین
(۴۳) شفیعم محمد رفیقم علی ست
امامم علی و ولیم نبی ست
(۴۴) اگر دوست داری تو آل رسول
سخن افتدت در محل قبول
(۴۵) ترا بس بود گفتنم یاد گیر
بدارالبقا جایم آباد گیر
(۴۶) مران از دلت مهر آل نبی
مکن خویشتن را ازان اجنبی
(۴۷) خدایا تو این بنده را دستگیر
به بخشای تقصیر این مرد پیر
(۴۸) نخواهم ز دنیای مردم گزای
تن آباد دارم به دیگر سرای
(۴۹) روان مرا در مقام صفا
فرود آر در حضرت مصطفا

(۵۰) تن آسانم از عقدها بگزران
بایمان ز جسمم بداور رسان

(۵۱) من و هر کہ از دوستدار من ست
بمہر محمد دلش روشن ست

(۵۲) الٰہی باعزاز آل عبا
کہ ما را مجدد بہ بخشد خطا

(۵۳) ز فردوس اعلیٰ بزیر لوا
بہ بخشای آن جای ما را بقا

(۵۴) ہزاران ہزاران ہزار آفرین
ز ما بر محمد و آل اجمعین

ہجو 'با'

قبل ازیں گزارش ہو چکا ہے کہ ہجو 'با' سب سے زیادہ نشو و نما یافتہ مرحلہ ہے ۔ سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم نہایت مسلسل اور مکمل ہے برخلاف ہجو الف کے جس میں ترتیب اور ربط کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے ۔ واقعات کے لحاظ سے اس کے بیانات نہایت عجیب و غریب طریقے سے دیباچہ' بایسنغر خانی کے مقالات کی تائید اور تقویت کر رہے ہیں اور یہی تائید ہے جو سب سے پہلے ہمیں شبہے میں ڈالتی ہے کہ کہیں دیباچے کے بیانات پڑھ کر کسی نے اس کو نظم نہ کر دیا ہو ۔ تمہید کے ابتدائی اشعار ہیں :

الا ای خردمند صاحب خبر
بگفتار و کردار من در نگر

میانجی میان من و شاہ باش
بحق خدا کز حق آگاہ باش

مرا نظم شہنامہ فرمودہ شاہ
در آن دم کہ بنشست شادان بگاہ
کہ بخشد بہر بیت زر یک درم
ہر آنچ آورم نظم از بیش و کم
بسی سال و پنج از سرای سپنج
چنین رنج بردم بامید گنج
بشش بیور این نامہ و شش ہزار
بگفتم نہ کرد ایچ در من نظار

مقصد یہ ہے کہ جب پادشاہ تخت نشین ہوا اس نے مجھ کو شاہنامے کی نظم پر مامور کیا کہ جو کچھ میں نظم کروں فی شعر ایک دینار کے حساب سے مجھ کو اجرت ملے ۔ اس لیے انعام کی امید میں پینتیس سال میں نے کام کیا ۔ چھیاسٹھ ہزار اشعار لکھے لیکن اس نے میری طرف توجہ نہیں کی ۔ یہاں دعویٰ کیا گیا ہے کہ شاہ نامہ سلطان کی تخت نشینی کے وقت شروع ہوا جو واقعہ ۳۸۷ھ یا ۳۸۸ ھ میں ظہور پذیر ہوا اس پر اگر پینتیس سال اضافہ کیے جائیں تو گویا ۴۲۲ھ یا ۴۲۳ھ میں شاہ نامہ ختم ہوا لیکن اس تاریخ سے ایک یا دو سال قبل سلطان محمود غزنوی یعنی ۲۳ ۔ ربیع الاول ۴۲۱ ہجری کو وفات پا چکا ہے ۔ اب فردوسی مردہ سلطان کی ہجو لکھنے سے رہا ۔ شاہ نامہ بقول فردوسی ۴۰۰ھ میں ختم ہوا ۔ اب ظاہر ہے کہ ہجو کا بیان فردوسی کے قلم سے نہیں نکلا ۔ علاوہ بریں شہادت کلام سے بھی ہم کچھ اسی قسم کا نتیجہ نکالتے ہیں ۔ نہ وہ فردوسی کی زبان ہے اور نہ اس کا انداز ۔ 'صاحب خبر' اور 'حق خدا' کی ایسی ترکیبیں ہیں جو فردوسی کے ہاں رائج نہیں ۔ آخری دو شعر قریب قریب شاہ نامے سے لیے گئے ہیں :

نہ کرد اندرین داستانم نگاہ
بگفتار بدگوی گم کردہ راہ

حسد برد بدگوی در کار من
تبہ کرد بر شاہ بازار من
سخن ہای شائستہ آبدار
بگفتار بدگوی بگزاشت خوار

آخری مصرع کے علاوہ باقی ڈھائی شعر شاہ نامے سے ماخوذ ہیں ۔

چو برباد دادند رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا

شاہ نامے سے نقل کیا گیا ہے ۔

چنین شہریاری و بخشندۂ
بگیتی ز شاہان دزخشندۂ
بدین گونہ بگزشت از قول خود
بر آورد بر قول خود بول خود
نہ ممسک بد این پادشاہ و نہ زفت
کہ از وی کم این سخن ہا شنفت
چو قول شہ از جود بنوشت لخ
حدیث فقع بر نوشتم بہ یخ

پہلا شعر شاہ نامے سے منقول ہے ۔ دوسرے شعر میں قول اور بول ایسے الفاظ ہیں جن کو فردوسی استعمال نہیں کرتا ۔ ''از قول خود بگزشت'' لالہ بھائیوں کا محاورہ معلوم ہوتا ہے ۔ 'بر قول خود بول آوردن' ایک عجیب محاورہ ہے کہ یہاں کے سوا کسی فارسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں چلے گا ۔ بہر حال فردوسی کے لیے ایسی گندی زبان استعمال کرنا ناممکن تھا ۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں ممسک ، قول، جود ، حدیث ، اس قدر عربی الفاظ ہیں کہ فردوسی کا کلام نہیں کہا جا سکتا :

چو گفتار شہ می کند زر بسیم
نباشد همین نام او جز لئیم

'زر بسیم می کند' اس کا کیا مطلب ہوا ؟ کیا یہ فارسی ہے اور کیا یہ فردوسی کی زبان ہے ؟ اس شعر میں چوں کہ سلطان کو دینار کا وعدہ کرکے درم دینے پر مستعد دکھایا جاتا ہے ، جو بالکل امر خلاف واقع ہے اس لیے ثابت ہے کہ وہ ملحقات سے ہے -

نژادش چو از بیخ شاهی نرست
بگفتار زین سان بود نا درست

یہ شعر بالکل کمزور ہے - پہلے مصرعے میں جس قسم کا تکلف ہے ، فردوسی اس کا عادی نہیں - اس کی سادگی کی مثال اس مصرع میں دیکھی جا سکتی ہے : ع

نژاد من از پشت گشتاسپ ست

اس شعر کے بیانات بھی خلاف واقع ہیں - محمود اس میں شک نہیں کہ امیر ناصرالدین سبکتگین کا فرزند تھا - امیر مذکور خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ، محمود کے لیے علاوہ ذاتی نجابت کے یہ شرافت کافی ہے کہ وہ ایک بادشاہ کا بیٹا ہے اور کون ایسا بادشاہ ہوا ہے جو ہمیشہ سے پوتڑوں کا رئیس چلا آیا ہے -

نمیرم ازین پس کہ من زندہ ام
کہ تخم سخن را پراگندہ ام
نمرد است و ہرگز نمیرد سخن
سخندان ز من این سخن فہم کن

پہلا ڈیڑھ شعر شاہ نامے سے ہے - آخری مصرع کی تصنیف ملحقات سے جاننا چاہیے -

چنین گفتہ بد او کہ بودہ است گیو
ہمان رستم و طوس و گودرز نیو
مرا در جہان شہریاری نو است
بسی بندگانم چو کیخسرو است

نہ خسرو نژادی نہ والا سری
پدرش از صفاهان بُد آهنگری
اگر چند بودند آهنگران
بہ از شاہ شان بد نژاد گران
گر او را نبودی نژاد اندرش
تہمتن ندادی بدو دخترش

یہ اشعار غالباً تلمیح کرتے ہیں محمود کے کسی اعتراض کی طرف جو اس نے ، ہم سمجھتے ہیں ، گیو کی آہنگر نژادی پر کیا ہوگا اور صاحب ہجو گیو کا سلطان سے مقابلہ کرکے دعویٰ کرتا ہے کہ گیو اگرچہ لوہار تھا تاہم پادشاہ سے اچھی نسل کا تھا ۔ اگر اس کی ہڈی میں کوئی داغ ہوتا تو رستم اپنی بیٹی اس کو کیوں دیتا ۔ اس واقعے کا چرچا کسی تاریخ میں نہیں ملتا ۔ نہیں معلوم یہ گمنام مصنف کس سند کی رو سے اس کا ذکر کرتا ہے ۔ البتہ 'نہ خسرو نژادی نہ والا سری ، الخ ، شاہ نامے میں ملتا ہے ۔

مر این نامۂ شہریاران بخوان
سر از چرخ گردون همی بگزران

اس شعر کا پہلا مصرع شاہ نامے سے لیا گیا ہے ۔ مصرع دوم برائے بیت ہے ۔ شاہ نامے میں یہ شعر یوں واقع ہوتا ہے :

یکی نامۂ شہریاران بخوان
نگر تاکہ باشد چو نوشیروان

کہ آن شہریاران چو تو شہریار
بسی بود شان بیگمان بیش کار
نہ گشتند ہرگز ز گفتار خویش
بہشتند مردم ز آزار خویش

ان اشعار کو ملحقات سے تصور کرنا چاہیے ۔ ان کی بندش کی

کمزوری بغیر نشان دہی معلوم کی جا سکتی ہے ۔

چو این نامور نامہ آمد بہ بن
پشیمان شد از گفتہای کہن

یہ شعر شاہ نامہ کے دو مختلف شعروں سے ماخوذ ہے :

(۱) چو این نامور نامہ آمد بہ بن
زمن روی کشور بشد پر سخن

(۲) چو بشنید شہ از پشوتن سخن
پشیمان شد از کرد ہای کہن

کرم بین بہ نزدیک شاہ فقیر
بگوی و ز گفتار حق وا بگیر

یہ شعر تو ہمیں لالہ بھائیوں کی فارسی کی یاد دلاتا ہے ۔ معاذ اللہ اگر یہ زبان فردوسی کی مانی جائے ۔ کرم ، فقیر اور حق ایک شعر میں تین عربی الفاظ موجود ہیں ۔

نہ نیکو بود حق نگہ داشتن
بخاشاک ایمان بر انباشتن

ازان گفتم این را کہ تا انجمن
نگویند ازین گفتہا عیب من

اس حق نگہ داشتن کے کیا معنی ؟ مطلب تو میں سمجھ گیا کہ سچی بات چھپانا اچھا نہیں ہوتا ۔ میرے خیال میں نہان داشتن موزوں معلوم ہوتا ہے ۔ بہر حال یہ ہندوستانی فارسی ہے ۔ اس سے زیادہ تنقید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ۔

خرد نیست مر شاہ محمود را
کہ بینم دلش مانع جود را

آخری مصرعے میں 'را' کا استعمال قائل کی عدم استعداد کا پردہ فاش کر رہا ہے ۔

حدیث پیمبر لگشت است رد
شود ہر شی راجع اصل خود

یہ حدیث نبوی کا ترجمہ ہے کہ کل شیٔ یرجع الٰی اصلہ۔ اس کی بندش کی کمزوری بغیر بتائے معلوم ہو رہی ہے اور ہم اس کو ملحقات سے مانتے ہیں۔

نہ محمود غزنی کہ محبوب حق
ز شاہنشہان برد بیشک سبق
شہنشاہ محمود کاندر جہان
ورا شیر یزدان بود پہلوان

یہ اشعار اس شیعی نقطۂ خیال کی غیر مترقبہ تائید کر رہے ہیں جس کے بہ ظاہر قاضی نور اللہ شوستری بانی ہیں۔ یہ خیال اگرچہ شیعہ حلقوں میں قاضی مرحوم کے زمانہ سے پیشتر کا ہے کہ فردوسی نے شاہ نامہ رسول اللہ اور حضرت علی کے نام پر لکھا ہے جیسا کہ یہ شعر مظہر ہے:

بنام نبی و علی گفتہ ام
گہر ہای معنی بسی سفتہ ام

اس عقیدے کی تردید کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی اس لیے کہ شاہ نامہ خود اس کی تردید کر رہا ہے "محبوب حق" اور "شہنشاہ محمود" سے مراد رسول اللہ ہیں۔ "شیر یزداں" "اسد اللہ الغالب" کا ترجمہ کیا گیا ہے اور حضرت علی مراد ہیں۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب محمود غزنوی کے نام پر نہیں لکھی گئی بلکہ رسول اللہ کے نام پر جن کے پہلوان حضرت علی ہیں۔

نہ کردی تو در نامۂ من نگاہ
کہ روزی نبودت نکوئی ز شاہ
بگفتا حسن کرپز یاوہ گوی
نشاید شنیدن سخن زشت اوی

صد افسوس دارم ز عمر عزیز
که ممدوح گشتم بران بی تمیز

ان اشعار کی لغویت اور زبان کی کمزوری بغیر ہماری نشان دہی کے معلوم کی جا سکتی ہے - پہلا مصرع شاہ نامے سے لیا گیا ہے ، جو یوں ہے - 'نہ کرد اندرین داستان ها نگاہ' - دوسرے مصرعے میں شاہ کا لفظ برائے بیت نہیں بلکہ برائے قافیہ لایا گیا ہے -

ان اشعار کی زبان اس قدر بھدی اور بے ربط ہے کہ معمولی فارسی خواں کو بھی اس سے شرم آئے گی - ممدوح کے معنی میں اس ماہر فن نے توسیع دے دی ہے ، جس کی سند پر ہم اسی کو بمعنی مادح استعمال کر سکتے ہیں - دروغ گو را حافظہ نباشد ، نہایت سچی مثل ہے اور اس کا مصداق یہ بیان ہے جو حسن میمندی کے نام پر کیا گیا ہے - یہاں یہ ہجو نگار اسی عام غلطی کا شکار ہے جس میں صاحب دیباچہ بایسنغرخانی ، قاضی نور اللہ شوستری اور علامہ شبلی پڑے ہوئے ہیں - وہ یقین کرتے ہیں کہ حسن میمندی سلطان کا وزیر تھا - حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے - حسن میمندی سبکتگین کے زمانے میں مارا جا چکا ہے اور اس کا فرزند احمد بن حسن میمندی سلطان کا وزیر تھا - اب یہ خیال کرنا کہ فردوسی کو بھی وہی عام مغالطہ ہوگیا جو اور تذکرہ نگاروں کو ہو گیا ہے ، ناممکن ہے -

بگفتار بد گوی این نام بد
پذیرفتی و بد نہادی بخود
مرا نام بادا ترا گنج و مال
که این جاودانست آن پایمال

'بد بر خود نہادن' کون سا محاورہ ہے ؟ ان دونوں اشعار کو ملحقات میں ماننا ہوگا -

و لیکن چو دارندۂ لم یزل
قلم رانده بد این چنین از ازل

نیاید زما با قضا چارهٔ
نه سودی کند ، هیچ پتیارهٔ
اگر گشت ویران بدین شاه گنج
مرا گشت آباد گنجم ز رنج
که نزد خداوند جان آفرین
بسی می برم زین جهان آفرین
شفیعم محمد رفیقم علی ست
امامم ولی و ولیم نبی ست
اگر دوست داری تو آل رسول
سخن افتدت در محل قبول
ترا بس بود گفتنم یادگیر
بدار البقا جایم آباد گیر
مران از دلت مهر آل نبی
مکن خویشتن را ازان اجنبی
خدایا تو این بنده را دستگیر
به بخشای تقصیر این مرد پیر
نخواهم ز دنیای مردم گزای
تن آباد دادم بدیگر سرای
روان مرا در مقام صفا
فرود آر در حضرت مصطفا
من و هر که از دوستدار من است
بمهر محمد دلش روشن است
الهی باعزاز آل عبا
که ما را مجدد به بخشا عطا
ز فردوس اعلی بزیر لوا
به بخشای آن جای ما را بقا

هزاران هزاران هزار آفرین

زما بر محمد و آل اجمعین

ان اشعار کے متعلق صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ نہ وہ فردوسی کی زبان ہے اور نہ فردوسی کے خیالات ہیں ۔ اور نہ اس کا عقیدہ ظاہر کرتے ہیں ۔ میں ان کو بلا کسی پس و پیش کے ملحقات میں شمار کرتا ہوں ۔

ہجو 'الف' کے جو اشعار ہجو 'با' میں نہیں ملتے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہجو 'با' کے مصنف نے ، اس سے جہاں تک ہو سکا ، ان تمام اشعار کو سلسلہ وار مرتب کیا لیکن جن اشعار سے سلسلہ قائم نہیں رہتا تھا یا جو دیباچے میں ملتے تھے ۔ مثلاً حضرت علی کی شان میں اشعار وغیرہ اس نے ترک کر دیے ۔

ہجو 'الف'

ایا شاہ محمود کشور کشا

زکس گر نہ ترسی بترس از خدا

کہ پیش از تو شاہان فراوان بدند

ہمہ تاجداران گیہان بدند

یہ یاد رہے کہ ان دونوں شعروں میں کافی ربط نہیں پایا جاتا ۔ اصل میں ہمارے خیال میں صاحب ہجو نے پہلے شعر کے بعد یہ شعر لکھا تھا :

کہ بد دین و بدکیش خوانی مرا

منم شیر نر میش خوانی مرا

اب دونوں شعر باہم خوب چسپاں ہوتے ہیں ۔

فزون از تو بودند یکسر بجاہ

بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

مصرع آخر شاہنامے سے لیا گیا ہے ۔ چناںچہ :

نہ فرہاد و گیوت بر آرم بجاہ
بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ
نہ کردند جز خوبی و راستی
نگشتند گرد کم و کاستی

میرے خیال میں پچھلے مصرع میں 'کمی' بجائے 'کم' آنا چاہیے تھا۔ چناں چہ فردوسی :

ہنر مردمی باشد و راستی
ز کژی بود کمی و کاستی

یہ شعر اگرچہ بہت کچھ شاہ نامے کے رنگ میں ہے لیکن ایک فرق ہے کہ 'کم و کاستی' کے بجائے فردوسی اکثر 'کژی و کاستی' لکھتا ہے اور اس کے قریب قریب اشعار شاہ نامے میں حسب ذیل ہیں :

(۱) نجوید بجز خوبی و راستی
نیارد بداد اندرون کاستی
(۲) نبد در دلش کژی و کاستی
نجستی بجز خوبی و راستی
(۳) نجستم ہمیشہ جز از راستی
ز من دور بد کژی و کاستی
(۴) نجستی جز از کژی و کاستی
نہ کردی بہ بخش اندرون راستی
(۵) نہ جوید جز از داد در راستی
نیارد بداد اندرون کاستی

اس سے ہم کو یہ اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی ایک مقبولہ خیال کن الفاظ میں ادا کرے گا۔ جب اس نے خوبی اور راستی کے خیال کو 'جز' حرف استثنا کے ساتھ ادا کیا تو پانچ مقام پر اس کے واسطے فعل 'جستن' لایا نہ 'کردن' جس کا استعمال

ہجو کے مصرع میں ہوا ۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر فردوسی اس شعر کا مالک ہوتا تو قطعی اسے یوں لکھتا ۔ "نجستند جز خوبی و راستی" ۔ 'کردن' اور 'جستن' کے فرق سے جو تغیر اس مصرع میں واقع ہو گیا ہے ایک سخن فہم سمجھ سکتا ہے اور ان ہی باتوں سے ہم ایک استاد اور اس کے مقلد کے کلام میں فرق دریافت کر سکتے ہیں ۔

نہ جستند از دھر جز نام نیک
وزان نام جستن سر انجام نیک

اس شعر کے قریب قریب شاہ نامے میں اشعار ملتے ہیں لیکن مجھ کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ شعر نہیں ملتا ۔

ھمہ داد کردند بر زیردست
نبودند جز پاک یزدان پرست

'پرست' کسی اسم کے ساتھ مل کر اسم فاعل کے معنی دیتا ہے ۔ مثلاً یزدان پرست ، بت پرست ، آتش پرست وغیرہ ۔ پاک کا اسم موصوف کیا ہے ۔ آیا یزدان یا یزدان پرست ۔ اب 'جز' کے استعمال پر غور ہو ۔ اگر اس کے بجائے 'مگر' استعمال کیا جاتا تو مصرع کے معنی بالکل صاف ہو جاتے یعنی نبودند مگر خالص یزدان پرست 'جز' اور 'مگر' میں جو فرق ہے وہ اظہرمن الشمس ہے ۔ شاہنامے میں یہی مطلب ان الفاظ میں ادا ہوا ہے :

کہ بی دشمن آرم جہان را بدست
نباشم مگر پاک یزدان پرست

دوسرے مقام پر کہا گیا ہے :

گنہگار باشد تن زیر دست
مگر مردم پاک یزدان پرست

هر آن شہ کہ در بند دینار بود
بہ نزدیک اهل خرد خوار بود

'در بند چیزی بودن' اس قسم کا محاورہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فردوسی نے شاہ نامے میں نہیں لکھا ۔ نیز 'اهل خرد' کی ترکیب ہماری طبیعت پر کھٹکتی ہے کیوں کہ فردوسی ایسی ترکیبیں مشکل سے لاتا ہے ۔

نباشد جز از بی پدر دشمنش
کہ یزدان بآتش بسوزد تنش

یہ شعر دیباچۂ شاہ نامہ میں ملتا ہے ۔

چہ گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیم دراست
درست این سخن قول پیغمبراست
گواهی دهم کین سخن راز اوست
تو گوئی دوگوشم بر آواز اوست
چو باشد ترا عقل و تدبیر و رای
بنزد نبیؐ و علی گیر جای
گرت زین بد آید گناه من ست
چنین ست و این رسم و راه من ست

یہ پانچوں شعر دیباچۂ شاہ نامہ میں موجود ہیں اور اسی وجہ سے غالباً صاحب ہجو 'با' نے انھیں اپنے یہاں سے ترک کر دیا ۔

ابا دیگران مر مرا کار نیست
بدین در مرا جای گفتار نیست

یہ شعر مقدمۂ یوسف زلیخائے فردوسی میں اور قلمی شاہ ناموں میں بھی پایا گیا ہے ۔

چو بر تخت شاهی نشاند خدای
نبی و علی را بدیگر سرای

اس شعر کی طرز پرانی نہیں معلوم ہوتی اور نہ شاہ نامے میں ملتا ہے۔

من این نامۂ شہریاران پیش
بگفتم بدین نغز گفتار خویش

یہ شعر خاتمۂ جلد دوم شاہ نامہ میں یوں آیا ہے:

کہ این نامۂ شہر یاران پیش
بہ پیوندم از خوب گفتار خویش

اگر شاہ را شاہ بودی پدر
بسر بر نہادی مرا تاج زر

یہ وہی مشہور شعر ہے جو کہا جاتا ہے کہ طوس میں فردوسی کی واپسی کے وقت ایک لڑکے نے پڑھا تھا۔ نظامی عروضی اس شعر سے واقف نہیں۔ شعر کا بیان حقیقت کے خلاف ہے۔ محمود کا باپ سبکتگین ابتدا میں الپتگین کا غلام تھا مگر محمود کی ولادت کے وقت وہ زبردست امیر تھا اور عنقریب بعد غزنی کا بادشاہ ہو گیا۔ ہجو میں کم از کم کچھ تو واقعیت ہونی چاہیے۔ بہر حال اس شعر کی سراغ رسی مجھ سے نہیں ہو سکی۔

ازان گفتم این بیت ہای بلند
کہ تا شاہ گیرد ازین کار پند
کزین پس بداند چہ باشد سخن
بااندیشد از پند پیر کہن
دگر شاعران را نیازارد او
ہمان حرمت خود نگہ دارد او
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بجا

بنالم بدرگاہ یزدان پاک
فشانندہ بر سر پراگندہ خاک
کہ یا رب روانش بآتش بسوز
دل بندۂ مستحق بر فروز

ان اشعار میں حسبِ ذیل عربی الفاظ ہیں : بیت ، شاعر، حرمت ، ہجا ، قیاست ، مستحق ۔ اس کثرت سے عربی الفاظ کا استعمال فردوسی کی عادت مستمرہ کے خلاف ہے ۔ اشعار میں وہ قدامت جو فردوسی کے ہاں پائی جاتی ہے بالکل نظر نہیں آتی ۔ شاعر نے اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کیے ہیں جو آٹھویں اور نویں صدی کی زبان کہلائی جا سکتی ہے اور فی زماننا بھی ان خیالات کو قریب قریب ان ہی الفاظ میں ادا کیا جائے گا ۔

بنالم بدرگاہ یزدان پاک
فشانندہ بر سر پراگندہ خاک

یہ شعر صاف نہیں ۔ فشانندہ اور پراگندہ نے ایک قسم کی کنجلک پیدا کر دی ہے ۔ خوش قسمتی سے شاہ نامے میں اصلی شعر مل گیا ۔ چناں چہ :

بنالم ز تو پیش یزدان پاک
خروشان بسر بر پراگندہ خاک

کہ سفلہ خداوند ہستی مباد
جوان مرد را تنگ دستی مباد

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں نیز بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں یہ شعر ملتا ہے لیکن یقین ہے کہ سعدی کی بوستان سے سرقہ کیا گیا ہے ، جہاں حکایت ''کریم تنگ دست با سائل'' میں ملتا ہے ۔

چو پروردگارش جہان آفرید
نیابی تو بر بند یزدان کلید

جلد چہارم شاہ نامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے :

چو پروردگارش چنان آفرید
تو بر بند یزدان نیابی کلید

بزرگی سراسر بگفتار نیست
دو صد گفتہ چون نیم کردار نیست

گرشاسپ نامہ نیز ان شاہ ناموں میں جن میں داستان گرشاسپ ضم کر دی گئی ہے یہ شعر "داستان آمدن رسول گرشاسپ نزد فغفور" میں ملتا ہے ۔ چناںچہ :

ہنر ہا سراسر بگفتار نیست
دو صد گفتہ چون نیم کردار نیست

ہنر اور بزرگی کے الفاظ کی تبدیلی سے ، جو خوبی اس شعر میں پیدا ہوئی ہے ، محتاج بیان نہیں ۔

بقیۂ ہجو

یہاں ہم ان اشعار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو تمام اسناد کے نزدیک ہجو میں داخل ہیں اور جن پر مجموعی حیثیت سے تمام روایات متفق ہیں ۔

گر ایدونکہ شاہی بگیتی تراست
نگوئی کہ این خیرہ گفتن چراست

ندیدی تو این خاطر تیز من
نیندیشی از تیغ خون ریز من

کہ بد دین و بد کیش خوانی مرا
منم شیر نرمیش خوانی مرا

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فردوسی پر بد دینی کا اتہام لگایا گیا تھا اور یہ پہلا کھلا بیان ہے جو ہم اس سے سنتے ہیں ۔ لیکن وہ ابیات جو اس نے امیر نصر کے ہاں پیش کیے تھے ہمارے زیر نظر ہیں اور ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں فردوسی نے یہ الزام کیوں نہ ظاہر کیا اور ہجو میں کیوں کیا ۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ فردوسی کو اس کے متعلق اگر کوئی معلومات ہوتی تو امیر نصر کے سامنے اپنی بریت کی غرض سے ضرور بیان کرتا ۔ اس لیے وہ تو اجنبی رہا لیکن ہجو کے معمار اس معاملے میں زیادہ خوش قسمت تھے ۔ انھیں نظامی عروضی یا اور کسی تذکرہ نگار سے یہ وجہ کشیدگی معلوم ہو گئی اس لیے انھوں نے شعر آخر میں اسے بد دینی اور بد کیشی کے نام سے یاد کیا ۔

مرا غمز کردند کان پر سخن
بمہر نبی و علی شد کہن

یاد رہے نظامی عروضی کے ہاں من جملہ ہجو کے چھ شعروں کے یہ پہلا شعر ہے ۔ اب ناظرین کو غور کرنا چاہیے کہ یہ شعر یہاں کس قدر غیر موزوں واقع ہوا ہے ۔ وہ خود زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھ کو بلا قصور ہجو کے بانیوں نے قید کر دیا ہے ۔ تمہید سے اب تک جس قدر اشعار گزرے سب خطابیہ ہیں لیکن یہ شعر جمع غائب کے صیغہ میں ہے اور گزشتہ ربط کو بالکل توڑتا ہے ۔ علیٰ ہذا آیندہ شعر سے بھی اس کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے ۔ یہ شعر اس بری اینٹ کے مشابہ ہے کہ جہاں کہیں دیوار میں اس کے لیے جگہ رکھی جاتی ہے نا موزوں معلوم ہوتی ہے ۔ ہجو میں یہی کیفیت اس شعر کی ہے ۔ جہاں کہیں اسے ڈالا جاتا ہے کسی جگہ میل نہیں کھاتا ۔ اس کو مصنفین ہجو قطعی ترک کر دیتے لیکن ایسا کرنے میں ان کا راز طشت از بام ہوتا تھا ۔ اس لیے کہ پرانی روایات میں اصلاح دینا ان کے لیے ناممکن تھا ۔ ہجو میں اس

کا لایا جانا ایک تاریخی مجبوری ہے۔

هر آن کس که در دلش کین علی ست
ازو خوار تر در جهان گو که کیست

ظاہر ہے کہ یہ شعر گزشتہ شعر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ پہلے بیت میں رسول اللہ اور حضرت علی کی محبت کا فردوسی پر الزام لگایا جاتا ہے۔ پچھلا جو غالباً شیعی رنگ آمیزی کا نتیجہ ہے، صرف حضرت علی کے نام پر قناعت کرتا ہے۔

منم بندهٔ هر دو تا رست خیز
اگر شه کند پیکرم ریز ریز

من از مهر این هر دو شه نگزرم
اگر تیغ شه بگزرد بر سرم

یہ دونوں شعر متحدالمعنی ہیں اور ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں اور یقیناً ''مرا غمز کردند'' والے شعر کی خاطر ایجاد ہوئے ہیں۔ ان شعروں میں محمود پر جو الزام لگایا گیا ہے، مذہبی رنگ کا ہے اور صحیح نہیں۔

منم بندهٔ اهل بیت نبی
ستایندهٔ خاک پای وصی

شاہ نامے میں یہ شعر یوں آتا ہے:

منم بندهٔ اهل بیت نبی
سر افگنده بر خاک پای وصی
(داستان سیاؤش)

مرا سهم دادی که در پای پیل
تنت را بسایم چو دریای نیل
(اگر در کف پای پیلم کنی
تن ناتوان هم چو نیلم کنی)

شعر ثانی اکثر قلمی نسخوں میں ملتا ہے اور تقریر سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہونا چاہیے لیکن کلکتے والے شاہ نامے میں معلوم نہیں میکن نے کیوں خارج کر دیا ۔ پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں "منم شیر نر میش خوانی مرا" کے بعد لایا گیا ہو ۔ یہ بھی یاد رہے کہ پھر وہی خطابیہ سلسلہ جاری ہوگیا ہے ۔ دیباچہ بایسنغری میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے فردوسی کو ہاتھیوں کے پاؤں میں کچلوانے کی دھمکی دی تھی ۔ ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود جس کے دربار میں تمام مذہب و ملت کے لوگ تھے فردوسی کو محض حب رسول و آل رسول کی پاداش میں ایسی سزائے مہیب کی دھمکی دیتا ۔ سلطان ، ہم نے مانا انتہائی متعصب تھا کیا وہ حب رسول یا دوست داریِ آل رسول سے انکار کر سکتا تھا ؟ مخترعین ہجو یہاں اس قسم کی کوشش کر رہے ہیں کہ سلطان کے فرضی وزیر حسن میمندی کے ساتھ ساتھ سلطان کو بھی خارجی ثابت کریں ۔ یہ خیال کرنا کہ یہ اشعار فردوسی کے قلم سے نکلے ہیں ، خیال باطل ہے ۔ فردوسی کی زبان میں یہ انداز اور لوچ کہاں سے آیا ؟ اسی ہاتھی کے پاؤں میں روندنے کے خیال کو وہ اس سادگی سے ادا کرتا ہے :

وگر ہیچ کژی گمانی برم
بزیر پی پیل تان بسپرم

فردوسی اپنی سادگی اور برجستگی کو ، جو اس کی خصوصیات شاعری سے ہے ، کہیں فروگزاشت نہیں کرتا ۔ جس قدر کہ وہ غیر ضروری تکلفات سے محترز ہے ۔

نہ ترسم کہ دارم ز روشندلی
بدل مہر آل نبی و علی
اگر شاہ محمود ازین بگزرد
مراو را بیک جو نہ سنجد خرد

ان کا تعلق بھی اشعار بالا سے ہے ۔

چو بر تخت شاهی نشاند خدای
نبی و علی را بدیگر سرای
گر از مہرشان من حکایت کنم
چو محمود را صد حمایت کنم

دونوں شعر غیر مربوط ہیں آخری شعر نظامی عروضی کے چھ شعروں میں سے ہے جس کا ربط ''مرا غمز کردند کان پر سخن" الخ سے درست بیٹھتا ہے ۔ آخری شعر میں حمایت اور حکایت عربی الفاظ ہیں ۔ شاہ نامے میں مشکل سے ان الفاظ کا سراغ چلے گا ۔

باین زاده ام هم برین بگزرم
چنان دان که خاک پی حیدرم

یہ شعر شاہ نامے کے دیباچے میں ملتا ہے ، اگرچہ مطبوعہ نسخوں میں اس کا سراغ نہیں چلتا ۔ (مولانا نظامی کا یہ بیت بھی یاد رہے :

بخوی خوش آموده شد گوهرم
برین زیستم هم برین بگزرم)

جهان تا بود شهریاران بود
پیامم بر شهریاران بود
که فردوسی طوسی پاک جفت
نه این نامه بر نام محمود گفت
بنام نبی و علی گفته ام
گهر های معنی بسی سفته ام

پہلے شعر کے قافیے میں کسی قسم کی غلطی رہ گئی ہے ۔ شعر سوم کا آخری مصرعہ بالکل برائے بیت ہے ۔ ایسے مصرعوں کے لیے قادر نامہ اور خالق باری کے صفحات زیادہ موزوں تھے نہ ہجو کے اشعار ۔ مصرعہ فی نفسہٖ نہایت بلیغ ہے لیکن اس کی بندش

صاف کہہ رہی ہے کہ میں فردوسی کے قلم سے نہیں نکلی ۔ اسدی اور نظامی کی زبان پر البتہ بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ ان اشعار میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ میں نے یہ کتاب سلطان محمود کے نام پر نہیں لکھی بلکہ نبی اور علی کے نام پر ۔ شاہ نامہ اس دعوے کا سب سے اچھا قول فیصل ہے ۔ فردوسی اگر ایسا کرنا چاہتا تو چند مقام پر سلطان کی مدح کے ابیات ، جو شاہ نامے میں پائے جاتے ہیں ، نکال کر ان کی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کی شان میں اشعار لکھ دیتا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا بلکہ برخلاف اس کے ہم کو شاہ نامے سے معلوم ہے کہ فردوسی نے خود نعت اور منقبت کے اشعار نہایت کمی کے ساتھ لکھے ہیں اور اس قدر کمی کے ساتھ لکھے ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے ۔ اس لیے ذرا مشکل سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر ہجو کے میدان میں آ کر اتنا جوشیلا شیعہ بن جائے کہ پورے بیس بیت ہجو کے منقبت اور نعت میں بھر دے ۔ یہ بحث کہ آیا فردوسی شیعہ تھا یا سنی یا کچھ اور، ہم کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں ۔ یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ فردوسی اگر شیعہ تھا ، جو بہت مشتبہ امر ہے ، تاہم اتنا جوشیلا شیعہ ہرگز نہیں تھا ، جس کا وہ ہجو میں دعویٰ کر رہا ہے ۔ اگر وہ اپنے مذہب میں اتنا سخت تھا تو متعدد شیعہ سلاطین کو چھوڑ کر محمود کے دربار میں کیوں آتا : مصرع

که فردوسی طوسی پاک جفت الخ

پر غور کرو ۔ کیا فردوسی اس شعر کا قائل ہے ۔ فردوسی میں اور عیب ممکن ہے کہ ہوں لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ خودستائی کا عیب اس میں نہیں تھا ۔ شاہ نامہ اس قدر ضخیم ہے ، اب یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر نے اس میں اپنا نام کے مقام پر لیا ہے ۔ مشکل سے دو مقام پر ۔ وہ بھی دقیقی کے ذکر میں اور وہاں بھی

پورا پورا شبہ ہوتا ہے کہ آیا اصل میں گوینده تھا یا فردوسی کیوں کہ سب سے قدیم نسخے میں جو ۷۵۲ھ کا نوشتہ ہے ، گوینده پایا جاتا ہے ۔ اور وہ اشعار یہ ہیں :

بفردوسی آواز دادی کہ می
مخور جز بآئین کاؤس کی

دیگر

ز فردوسی اکنون سخن یاد گیر
سخن های شایستۂ دل پذیر

آمدم برسر مطلب ۔ اس شعر کی تمام طرز یہی کہہ رہی ہے کہ اس کا قائل کوئی غیر فردوسی ہے ۔

چو فردوسی اندر زمانہ نبود
بدان بد کہ بختش یگانہ نبود

یہ شعر بھی علیٰ ہذا کسی غیر فردوسی کے قلم سے نکلا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ شعر فردوسی کا تھا ۔ ہجو تراشوں نے بقدر ضرورت اس میں اصلاح دے دی ۔ فردوسی نے اس کو یوں لکھا تھا :

سپاهی کہ آن را کرانہ نبود
بدان بد کہ بختش یگانہ نبود

(جلد اول ، صفحہ ۳۸ ، سطر ۱۳ ، بمبئی ، ۱۲۷۵ھ)

نہ کردی درین نامۂ من نگاہ
بگفتار بد گوی گشتی ز راہ
هر آن کس کہ شعر مرا کرد پست
نگیرَدش گردون گردندہ دست

پہلا شعر شاہ نامے میں یوں آتا ہے :

نہ کرد اندرین داستان ها نگاہ
ز بد گوی و بخت بد آمد گناہ

ہجو کے بانیوں نے بقدر ضرورت اصلاح دے کر اس کو خطابیہ

صورت میں بدل دیا ۔ شعر دوم کا شاہ نامے میں پتہ نہیں چلا ۔

چو عمرم بہ نزدیک هشتاد شد
امیدم بیکباره برباد شد
بسی سال اندر سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج

دونوں شعر خاتمۂ شاہ نامہ میں ملتے ہیں ۔

(از شاہ نامۂ قلمی ۷۵۲ھ)

ز ابیات غرا دو ره سی هزار
مر آن جمله در شیوۂ کار زار

اس شعر پر غور کیجیے ۔ وہ متأخرین کی طرز میں ہے ۔ فردوسی یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے :

بود بیت شش بار بیور هزار

دوسرے مقام پر کہتا ہے :

بشش بیور ابیاتش آمد شمار

دیکھیے مطلب وہی ہے مگر ادائے مطلب میں کس قدر فرق ہے ۔

ز شمشیر و تیر و کمان و کمند
ز گوپال و از تیغ های بلند
ز برگستوان و ز خفتان و خود
ز صحرا و دریا و از خشک رود
ز گرگ و ز شمشیر و پیل و پلنگ
ز عفریت و از اژدها و نهنگ
ز نیرنگ غول و ز جادوی دیو
کزیشان بگردون رسیده غریو
ز مردان نامی بروز مصاف
ز گردان جنگی گہ رزم و لاف

همان نامداران با جاه و آب
چو تور و چو سلم و چو افراسیاب
چو شه آفریدون و چون کیقباد
چو ضحاک بد کیش بی دین و داد

یہ ابیات نیز آنے والے اشعار شاہ نامے کے مضامین کی فہرست دے رہے ہیں وہ بالکل متأخرین کی زبان ہے ۔ پلنگ اور نہنگ کا ذکر شاہ نامے میں نہیں آتا ۔ ان کا داخلہ اس فہرست میں ثابت کرتا ہے کہ یہ ابیات فردوسی کے قلم سے نہیں نکلے ۔

چو گرشاسپ و سام و نریمان گرد
جہان پہلوانان با دست برد

شاہ نامے میں گرشاسپ و نریمان کا قصہ (اگرچہ شاہ نامہ ان کے ناموں سے واقف ہے) جو رستم کے اجداد میں سے مشہور پہلوان ہیں ، کہیں نہیں آتا ۔ ان کی شہرت گرشاسپ نامہ کے بیانات پر منحصر ہے ۔ چوں کہ گرشاسپ نامۂ اسدی بھی غلطی سے شاہ نامے میں ملا دیا گیا تھا اس لیے ہجو کے مصنفین نے گرشاسپ نامے کو شاہ نامے کا جزو جان کر شعر بالا میں گرشاسپ اور نریمان کا بھی ذکر کر دیا ۔ فردوسی اگر یہ ابیات لکھتا تو کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہ کرتا ۔ اس کا دوسرا مصرعہ 'داستان سوسن رامش‌گر' میں ملتا ہے :

ز جا در رسیدہ بہ هومان سپرد
جہان پہلوانان با دست برد
(ملحقات ، صفحہ ۱۲۰۵ ، ۵۷۹ھ)

چو هوشنگ و طهمورث دیو بند
منوچہر و جمشید شاہ بلند
چو کاؤس و کیخسرو تاجور
چو رستم چو روئین تن نامور

چو گودرز و هشتاد پور گزین
سواران میدان و شیران کین

شاہ نامے میں یہ شعر یوں آتا ہے :

چو گودرز و هفتاد پور گزین
سواران میدان و شیران کین

دوسرے مقام پر یوں آتا ہے :

چو گودرز و هفتاد پور گزین
همه نامداران با آفرین

گودرز بن کشواد کے اصل میں اٹھتر فرزند تھے ۔ جنگ پشن ولاون میں ان میں سے ستر مقتول ہوئے ۔

همان نامور شاہ لہراسپ را
زریر سپہدار و گشتاسپ را
چو جاماسپ کاندر شمار سپہر
فروزنده تر بد ز تابنده مہر

شعر دوم شاہ نامے میں یوں آتا ہے :

چو جاماسپ کاندر شمار سپہر
فروزنده تر بد ز ناهید و مہر

(صفحہ ۵۴۳ ، جلد چہارم ، ۱۲۷۵ھ)

چو دارای داراب و بہمن همان
سکندر که بد شاہ شاهنشهان

اگر یہ شعر فردوسی کے قلم سے نکلتا تو وہ سکندر کے لیے شاہ شاہنشہاں کا لفظ استعمال نہ کرتا ۔ سکندر اسلام میں ، اس میں شک نہیں ، بہت کچھ ہردل عزیز ہے لیکن فردوسی اس معاملے میں ایرانی اور بالخصوص ساسانی خیال کا واقع ہوا ہے ۔ محب ایران ہونے کی حیثیت سے سکندر کو جو ایران کے چراغ سلطنت کا گل کرنے والا تھا پسند نہیں کرتا تھا ۔ چناں چہ اشعار ذیل ہمارے دعوے کے شاہد ہیں :

(۱) هیونی ز کرمان بیامد دمان
بنزدیک اسکندر بدگمان
(۲) بد آنکه که اسکندر آمد ز روم
بایران و ویران شد آن مرز و بوم
گر او نا جوانمرد بود و درشت
که سی و شش از شهریاران بکشت
لب خسروان پر ز لفرین اوست
همه روی گیتی پر از کین اوست
(۳) کسی نیست زین نامدار انجمن
ز فرزانه و مردم رای زن
که نشنید کاسکندر بد نهان
چه کرد از فرومایگی در جهان
(۴) نخست اندر آیم ز سلم سترگ
باسکندر آنکینه ور پیر گرگ
(صفحه ۵۳۵ ، بمبئی ، ۱۲۷۵ ھ)
(۵) مراو را سکندر همی پاره کرد
ز بیدانشی کار یکباره کرد
(۶) سکندر که او خون دارا بریخت
چنان آتش کین بما بر به بیخت
که دارا برادر پدر خواندی
همی فیلقوسش پسر خواندی
پدر پاک بد مادرش بد گهر
چنان دان کزو پاک ناید پسر

چو شاه اردشیر و چو شاپور او
چو بهرام و نوشیروان نکو

"او" پہلے مصرع میں حشو ملیح ہے۔ کیا فردوسی اسی شستہ زبان کے لیے مشہور ہے ؟

چو پرویز ہرمز چو پورش قباد
چو خسرو کہ پرویز نامش نہاد

اس شعر کے مطالعے کے وقت خیال کیا گیا کہ اس میں کوئی غلطی ہو گی لیکن مختلف نسخوں میں ہم اس کو اسی صورت میں دیکھتے ہیں ۔ فردوسی اگر اس شعر کا مالک ہوتا تو کیوں کر یقین کیا جاتا ہے کہ خسرو پرویز کو جو ایک مشہور بادشاہ ہے دو شخص یا دو بادشاہ بیان کرتا ۔ اس شعر کے مصنف کے نزدیک ایک پرویز ہرمز کا بیٹا ہے دوسرا خسرو ہے جس کا نام پرویز ہے ۔ کیا فردوسی یہ غلط شعر لکھ سکتا تھا ؟

چنین نامداران و گردنکشان
کہ دادم یکایک از ایشان لشان
ہمہ مردہ از روزگار دراز
شد از گفت من نام شان زندہ باز
چو عیسٰی من این مردگانرا تمام
سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

ہجو کے مصنفین کو یہاں فردوسی کے ان اشعار سے توارد ہو گیا ہے :

ہمہ پہلوانان و گردنکشان
کہ دادم درین قصہ زیشان نشان
ہمہ مردہ از روزگار دراز
شد از گفت من نام شان زندہ باز
منم عیسٰی آن مردگان را کنون
روا نشان بمینو شدہ رہنمون
(از ابتدای ہفتخوان اسفندیار)

یکی بندگی کردم ای شہریار
که ماند ز تو در جہان یادگار
بنا ہای آباد گردد خراب
ز باران و از تابش آفتاب
پی افگندم از نظم کاخی بلند
که از باد و باران نیابد گزند
برین نامه بر عمر ہا بگذرد
ہمی خواند آنکس که دارد خرد

نه زینگونه دادی مرا تو نوید
نه این بودم از شاه گیتی امید
بد اندیش کش زوز نیکی مباد
سخن ہای نیکم ببد کرد یاد
بر بادشه پیکرم زشت کرد
فروزنده اخگر چو انگشت کرد

ان اشعار کا اگرچه شاه نامے میں کہیں پته نہیں چلتا مگر زبان پر لحاظ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے که فردوسی مصنف نہیں ۔

”بد اندیش کش روز نیکی مباد“ کے قریب قریب سعدی کہتے ہیں : ع

که بد مرد را روی نیکی مباد

اگر منصفی بود از راستان
به اندیشه کردی درین داستان
بگفتی که من در نہاد سخن
بدادستم از طبع داد سخن
جہان از سخن کرده ام چون بہشت
ازین پیش تخم سخن کس لکشت

سخن گستران بیکران بوده اند
سخن های اندازه پیموده اند
ولیک ارچه بودند ایشان بسی
همانا نگفت ست زینسان کسی

'سخن پیمودن' فردوسی نے کم سے کم شاہ نامے میں نہیں لکھا نہ وہ 'ولیک' لکھتا - اشعار بالا میں الفاظ 'سخن' و 'سخن‌گستر' شعر اور شاعر کے معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں - ذیل میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ فردوسی سخن کو شعر کے معنی میں نہیں لکھتا - سخن فردوسی کے ہاں کلام ، گفتگو ، بات چیت ، افسانہ ، تاریخ اور واقعے کے معنوں میں ملتا ہے - مثال :

سخن گوی دهقان چه گوید نخست
که نام بزرگی بگیتی که جست

دیگر

سخن‌گوی دهقان چو بنهاد خوان
یکی داستان راند از هفتخوان

دیگر

سخن های هرمزد چون شد به بن
یکی نو پی افگند موبد سخن

دیگر

یکی پیر بد پهلوانی سخن
بگفتار و کردار گشته کهن

دیگر

پژوهندهٔ روزگار نخست
گزشته سخن ها همه باز جست

دیگر

بگفتند پیشش یکایک مہان
سخن ہای شاہان و گشت جہان

دیگر

جہان دیدہ و نام او بود ماخ
سخن‌دان با برگ و با برز و شاخ

دیگر

کنون داستانہای دیرینہ گوی
سخن ہای بہرام چوبینہ گوی

دیگر

الا ای سخن گوی مرد کہن
بگرد از رہ آز و بگسل سخن
نمردست و ہرگز نمیرد سخن
بود تازہ ہر چند گردد کہن

ان اشعار میں سخن گوی ، سخن دان اور سخن کو ممکن ہے کہ شاعر و شعر کے مفہوم میں لیا جائے اور بعض موقعوں پر وہ معنی درست بھی بیٹھتے جائیں لیکن شاعرحقیقت میں انھیں راوی ، داستان گو، مورخ ، واقعہ ، تذکرہ اور کلام کے معنوں میں استعمال کر رہا ہے۔ اگر ہمارے یہ مشاہدات درست مانے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہجو کے یہ اشعار فردوسی کے قلم سے نہیں نکل سکتے ۔

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی

یہ شعر اگرچہ مطبوعہ شاہ ناموں میں ہجو کے سوائے کہیں نہیں ملتا لیکن قلمی شاہ نامہ نوشتہ ۷۵۲ھ کے خاتمے میں یوں آتا ہے :

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم گرم کردم بدین پارسی

جہان دار اگر نیستی تنگ دست

مرا بر سر گاہ بودی نشست

بدانش نبد شاہ را دست گاہ

وگرنہ مرا برنشاندی بگاہ

پہلا شعر یقیناً دوسرے شعر سے ماخوذ ہے جو نظامی عروضی کے چھ شعروں میں سے ایک ہے ۔ شاہ نامے میں ان کا سراغ نہیں ملا ۔

چو دیہیم دارش نبد در نژاد

ز دیہیم داران نیاورد یاد

چو اندر تبارش بزرگی نبود

نیارست نام بزرگان شنود

دونوں شعر ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں ۔ دوسرا شعر نظامی کے چھ شعروں میں ملتا ہے اور پہلا شعر فردوسی کی زبان نہیں ۔ میری حجت صرف اسی قدر ہے کہ فردوسی کے ہاں اسم فاعل 'دیہیم دار' کا رواج نہیں ۔ شاہ نامہ 'دیہیم' سے واقف ہے اور ترکیبی صورت میں 'دیہیم جوی' اس میں پایا جاتا ہے ۔ مثلاً

گرانمایہ سیندخت بنہاد روی

بدرگاہ سالار دیہیم جوی

یا

بصندوق در مرد دیہیم جوی

دو اسپ گرانمایہ بست اندروی

(صفحہ ۱۰۶)

دیگر

بفرمود سالار دیہیم جوی

کہ ندھند آنروز چیزی بدوی

(صفحہ ۲۰۶)

دیگر

چنین داد پاسخ کہ او را بگوی

نہ تو شہر یاری نہ دیہیم جوی

(صفحہ ۱۰۸۸)

'دیہیم دار' باوجود تلاش شاہ نامے میں میری نظر سے نہیں گزرا اس لیے میں اسی ایک نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ شعر بالا فردوسی کا نہیں ہوسکتا۔

اگر شاہ را شاہ بودی پدر

بسر بر نہادی مرا تاج زر

وگر مادر شاہ بانو بدی

مرا سیم و زر تا بزانو بدی

دونوں شعر حقیقت سے دور ہیں۔ محمود کا باپ خود بادشاہ تھا۔ محمود کی ماں، مورخین کہتے ہیں، رئیس زابل کی دختر تھی اسی لیے اس کو محمود زابلی کہا جاتا ہے۔ یہ شعر شاہ نامے میں نہیں ملتے۔

کف شاہ محمود عالی تبار

نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

ایسے بعید زمانے میں عقد انامل کا رواج نظم میں، جب کہ طریق ابجدی کا استعمال بھی نا معلوم تھا، قیاس میں نہیں آتا[1]۔

۱۔ مجلۂ مہر کے فردوسی نامے میں سید محمد علی جمال زادہ نے ''حساب العقود'' کے اعتبار سے اس شعر کی تشریح کی ہے۔ مضمون کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''...مقصود از این بیت بیان بخل و امساک سلطان محمود بوده است ولی چون عموماً با اینکه میدانند تفسیر این بیت مربوط با انگشتهای دست است درست از کیفیت این تفسیر اطلاع جامع و صحیحی در دست نیست ذیلاً در این باب توضیحاتی داده میشود...''

ملاحظہ ہو مضمون ''نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار'' از محمد علی جمالزادہ۔ (مرتب)

چو سی سال بردم بشہنامہ رنج
که شاہم بہ بخشد بپاداش گنج
شہی کو نترسندہ درویش بود
بشہنامہ او را نشاید ستود

فردوسی اپنی تصنیف کو شاہ نامے کے نام سے کبھی یاد نہیں کرتا ۔ وہ اسے دفتر پہلوی ، نامۂ خسروان ، نامۂ پاستان وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے ۔ یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ اس کا نام شاہ نامہ ہو گیا کیوں کہ فردوسی کے زمانے سے پیشتر کم سے کم دو کتابیں ایسی موجود تھیں جن کا نام شاہ نامہ تھا ۔ ایک ابوالموئد بلخی کی تالیف تھا جس کا ذکر ہم تاریخ طبری اور قابوس نامے میں پڑھتے ہیں چوں کہ فردوسی کی تصنیف بھی اسی مضمون پر تھی اس لیے اس کا نام بھی عوام میں شاہ نامہ ہو گیا ۔ عنصری بھی شاہ نامے کا ذکر کرتا ہے لیکن وہ فردوسی کا شاہ نامہ معلوم نہیں ہوتا ۔ عنصری :

اگر ز دجلہ فریدون گزشت بی کشتی
بشاہ نامہ بر این بر حکایت است سمر

فردوسی کی تالیف کا سب سے اول ذکر کرنے والا اسدی طوسی ہے جو کہتا ہے :

بشہنامہ فردوسیِ نغز گوی
چو از پیش گویندگان برد گوی

شعر مذکورۂ بالا خاتمۂ شاہ نامہ کے اس شعر کے بہت قریب ہے :

بسی سال و پنج از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج

اس میں شک نہیں کہ شاہ نامے کی نظم میں تیس پینتیس سال صرف ہوئے لیکن شاعر غزنیں میں سلطان کے پاس ۳۸۸ھ میں آیا ہے ۔ دوسرے مصرعے سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ فردوسی برابر تیس سال سلطان سے انعام لینے کی امید میں کام کرتا رہا اس لیے ہجو کے مولفین

پھر اسی مشہور غلطی سے کام لے رہے ہیں کہ شاہ نامہ سلطان محمود غزنوی کے حکم سے لکھا گیا تھا۔

مرا زین جہان بی لیازی دھد
میان یلان سرفرازی دھد

یہ شعر شاہ نامے میں یوں درج ہے:

مرا از جہان بی نیازی دھد
میان یلان سرفرازی دھد
(خاتمۂ جنگ پیران و گودرز)

بپاداش گنج مرا در کشاد
بمن جز بہای فقاعی نداد
فقاعی بیرزیدم از گنج شاہ
ازان من فقاعی خریدم براہ

ان شعروں سے یہی مطلب اخذ ہو سکتا ہے کہ جب مجھ کو صلہ بخشنے کے لیے سلطان نے اپنا خزانہ کھولا تو صرف پیالہ بھر شربت کی قیمت عنایت فرمائی (یعنی بہت ہی کم انعام دیا) چوں کہ اس قابل مقدار سے صرف ایک پیالہ شربت خریدا جا سکتا تھا اس لیے میں نے ایسا ہی کیا۔ ان اشعار کا مصنف اگر فردوسی ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی ذی ہوش انسان باور نہیں کر سکتا کہ فردوسی ان ساٹھ ہزار درم کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جو اس نے فقاعی، حمامی اور انعام لانے والوں میں تقسیم کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان شعروں کا مصداق یہی قصہ ہے۔ یہ قصہ ان ابیات کی ایجاد کا باعث ہے یا یہ شعر اس قصے کے اختراع کے ذمہ دار ہیں۔ ناظرین جو چاہیں سمجھیں مگر میں ان کو فردوسی کی ٹکسال کا نہیں مانوں گا۔

پشیزی بہ از شہر یاری چنین
کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دین

شاہنامے میں یہ شعر یوں وارد ہوتا ہے:

پلنگی بہ از شہریاری چنین
کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دین
(جلد چہارم ، صفحہ ۳۳۶ ، ۱۲۷۵ھ)

پرستار زادہ نیاید بکار
اگر چند دارد پدر شہریار

یہ شعر بھی نظامی عروضی کے چھ اشعار میں شامل ہے ۔ اس میں پھر سلطان کی ماں کی طرف اشارہ ہے ۔ لیکن جیسا کہ اوپر دکھا چکا ہوں سلطان کی ماں کو لونڈی باندی کہنا بالکل غلط ہے اور جھوٹی ہجو لکھ کر فردوسی اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرتا ۔ یہ شعر بے شک فردوسی کا ہے لیکن اس نے مختلف مقصد سے لکھا تھا جس کا قصہ یہ ہے کہ مہران ستاد نوشیرواں کے لیے خاقان چین کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی پسند کرنے اور لانے کے لیے بھیجا جاتا ہے ۔ رخصت کے وقت نوشیرواں اسے ہدایت کرتا ہے کہ تو خاقان کی شبستان کو غور سے دیکھنا ؛ اس کے کئی بیٹیاں ہیں ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو اس کی خوبصورتی اور آرائش لباس سے فریب کھا جائے ۔ اصلی بیوی سے خاقان کی جو اولاد ہو اسے پسند کرنا ۔ پرستار کی اولاد کی مجھ کو کوئی ضرورت نہیں ۔ وہ بادشاہ کی اولاد ہو تو ہو ۔ اس موقعے پر نوشیرواں کہتا ہے :

پرستار زادہ نیاید بکار
اگر چند دارد پدر شہریار

فردوسی نے اس کا استعمال اگرچہ مختلف غرض سے کیا تھا لیکن ہجو کے معماروں نے اپنے مطلب کا پا کر ہجو میں داخل کر کے ثابت کرنا چاہا کہ سلطان محمود اصیل سے نہیں تھا بلکہ باندی کا لڑکا تھا۔

سر ناسزایان برافراشتن
و ز ایشان امید بہی داشتن

سر رشتۂ خویش گم کردنست
بجیب اندرون مار پروردنست

جن اصحاب نے شاہ نامے کو غور سے پڑھا ہے کیا یقین کر سکتے ہیں کہ یہ فردوسی کی زبان ہے۔ فردوسی کے عہد میں ایسے کنایات کا رواج نہیں تھا اور نہ وہ خود لکھتا ہے۔ زبان میں یہ صفائی اور گھلاوٹ نظامی کے ہاں البتہ ملتی ہے۔ شاہ نامے میں ان اشعار کا کہیں پتہ نہیں چلتا نہ ان کے قریب المعنی اشعار ملتے۔ بہمن نامہ جو سلطان محمود شاہ بن ملک شاہ سلجوق (۵۱۱ھ و ۵۲۵ھ) کے عہد کی تصنیف ہے اس کے چند اوراق سرکاری کتب خانہ ٹونک کی ایک جلد نمبر ۳۵۸ میں محفوظ ہیں۔ یہ اوراق اس میں شک نہیں اب سے تین ساڑھے تین سو برس پہلے کے نوشتہ ہیں۔ ان میں یہ شعر فرامرز بن رستم، بہمن بن اسفند یار کو خطاب کرکے پڑھتا ہے:

ز ناجنس چشم بہی داشتن
بدل تخم یاری ازو کاشتن
سر رشتۂ خویش گم کردن است
بجیب اندرون مار پروردن است

آخر شعر دونوں میں ایک ہے اور پہلے شعر میں اگرچہ بندش ایک ہی وضع کی ہے، الفاظ میں اختلاف ضرور ہے۔ ہر ایک شعر کی اصلیت کا اس زمانے میں پتہ چلنا بہت مشکل کام ہے مگر اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ دونوں شعر ایک دوسرے سے ماخوذ ہوئے ہیں۔ اس قدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ بہمن نامہ مطبوعہ بمبئی میں یہ اشعار نہیں ملتے۔

درختی کہ تلخست ویرا سرشت
گرش در نشانی بباغ بهشت
ور از جوی خلدش بهنگام آب
به بیخ انگبین ریزی و شهد ناب

سرانجام گوهر بکار آورد
همان میوهٔ تلخ بار آورد

یہ معروف و مشہور اشعار ہیں اور عام طور پر فردوسی سے منسوب ہیں ۔ جامی نے جب ہاتفی کا شاعری میں امتحان لیا تو یہی مضمون دیا تھا جس کو ہاتفی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :

اگر بیضۂ زاغ عنبر سرشت
نہی زیر طاؤس باغ بہشت
بہنگام آن بیضہ پروردنش
ز انجیر جنت دھی ارزنش
دھی آبش از چشمۂ سلسبیل
بر آن بیضہ گر دم دمد جبرئیل
شود عاقبت بچۂ زاغ زاغ
برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

یہ ابیات خواہ فردوسی کے ہوں خواہ کسی اور کے لیکن قدردانی بھی دولت کی طرح اندھی ہے جس نے اس کے معائب کی مطلق پروا نہیں کی ۔ ''انگبیں'' اور ''شہد ناب'' میں کیا فرق رہا ۔ یہ میرا اعتراض نہیں ہے بلکہ صاحب خزانۂ عامرہ کا ۔ ممکن ہے کہ اصل میں یہاں ''شیر ناب'' ہو ۔ اور نہ اس بات کی پروا کی گئی کہ اس کا مضمون استاد ابوشکور بلخی (۳۳۶ھ) کے اشعار سے ماخوذ ہے :

بد شمن برت مہربانی مباد
کہ دشمن درختیست تلخ از نہاد
درختی کہ تلخش بود گوہرا
اگر چرب و شیرین دھی مروَرا
همان میوهٔ تلخ آرد پدید
از و چرب و شیرین نخواهی مزید

شاہ نامے میں درخت کی تشبیہ بہت عام ہے مثلاً : ع

بسان درختی بباغ بہشت

یا

درختی کہ پروردی آمد ببار
بہ بینی برش ہم کنون در کنار
گرش بار خارست خود کشتۂ
وگر پرنیانست خود رشتۂ

یا

درختی[1] کہ شیرین بود بار او
نگردد کسی گرد آزار او
دگر زانکہ شیرین نباشد برش
بخاک اندر آرند تاگہ سرش
بماند بباغ آن و در آتش این
توخواہی چنان باش وخواہی چنین

ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ اشعار فردوسی کے ہیں یا نہیں مگر سلیس اور سادہ گو فردوسی سے مشکل سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اصلی رنگ کو چھوڑ کر یکایک ایسی شان دار ترکیبیں استعمال کرتا جن سے محض بلاغت یا لفظی شان و شوکت مقصود ہو جو ہم ''درنشانی''''باغ بہشت''''جوی خلد'' اور''شہدناب'' میں معائنہ کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ تمام مضمون تکلف کے ساتھ ادا کیا گیا ہے ۔

جب کوئی شاعر ایک خاص خیال کسی موقعے پر ادا کرتا ہے جب دوسرے مقام پر اس کا مرادف یا ہم معنی خیال ادا کرے گا تو

۱ ۔ یہ اشعار نواب بندہ علی خاں (۱۱۵۶ھ) نے فردوسی کے کلام کے نمونے میں شاہ نامے سے دیے ہیں لیکن مطبوعہ نسخوں میں میری نظر سے نہیں گزرے ۔ (حاشیۂ مصنف)

اس میں بھی غالباً وہی تناسب ، مساوات اور طرز ادا ملحوظ رکھے گا جو پہلے خیال کی تسوید کے وقت اس نے مدنظر رکھی تھی کیوں کہ شاعر کا متخیلہ محدود ہے جس طرح کہ اس کے الفاظ کا ذخیرہ ۔

اگر اس کو ہم ایک کلیہ مان لیں اور پھر اس میزان میں جس طرح کہ خط سے ملا کر خط شناخت کیا جاتا ہے ہم شاعر کے معلوم اشعار سے اس کے نا معلوم یا مشتبہ اشعار کا موازنہ و مقابلہ کریں تو ہمارا خیال ہے کہ ہم صحیح نتیجے پر پہنچنے کی امید کر سکتے ہیں ۔

شاہ نامہ ایک سمندر ہے اور فردوسی نے وہی ایک خیال مختلف موقعوں پر متغائر پہلوؤں سے باندھ دیا ہے ۔ تلاش نے اشعار مبحث فیہ کے مقابل اشعار بھی شاہ نامے میں دریافت کر لیے جو حسب ذیل ہیں :

اگر بچۂ شیر ناخوردہ شیر
بپوشد کسی درمیان حریر
دھد نوش او را ز شیر و شکر
ھمیشہ ورا پروراند بہ بر
بہ گوھر شود باز چون شد بزرگ
نترسد ز آھنگ پیل سترگ

یہ اشعار شاہ نامے میں سیاؤش کے بارے میں افراسیاب اور کرسیوز کے درمیان مکالمے کے وقت آتے ہیں ۔ سادہ طبیعت فردوسی اپنے شیر کے بچے کو حریر میں لپیٹ کر انسانی بغل میں دے دیتا ہے اور شیر و شکر سے اس کے کھانے کا انتظام کر دیتا ہے ۔ لیکن وہ عالی دماغ شاعر اپنے درخت کو سیدھا دنیا کے پردے سے اٹھا کر نہ صرف بہشت بلکہ 'باغ بہشت' میں لے جاتا ہے ۔ ہمارا خیال تھا کہ آب کوثر سے وہ پانی کا انتظام کر دے گا جس کے متعلق ہمیں علم ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شکر سے زیادہ شیریں ہے ' نہیں وہ اس کو مبتذل اور پا افتادہ لفظ مان کر اس کے بجائے "جوی خلد"

کا شان دار لفظ استعمال کرتا ہے جو آب کوثر یا نہر کوثر سے زیادہ بلند اور باشکوہ ہے ۔ پھر اس جوے سے وہ انگبیں لاتا ہے اور انگبیں بھی کیسا دوسرے الفاظ میں دوہرا کر کہتا ہے "شہد ناب" ۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تکلفات فردوسی کے مزاج میں داخل نہیں اور نہ یہ فلک سیر تخیل فردوسی کا ہے ۔ اسدی یا اس کا ہم مشرب اپنی زبان میں یہ لوچ اور تخیل میں پرواز دکھا سکتا ہے ۔ فردوسی نے یہی شیر کے بچے کا مضمون شاہ نامے کے دوران میں بار بار دوہرایا ہے ۔ مضمون کا پیرایہ وہ بدل دیتا ہے لیکن اپنی اصلی سطح نہیں چھوڑتا اور نہ تخیل بدلتا ہے ۔ چناں چہ :

(۱) ہمان بچۂ شیر ناخوردہ شیر
ستاند همی موبد تیزویر
مر او را درآرد میان گروہ
چو دندان برآرد شود زو ستوہ
ابی آن کہ دیدہ است پستان مام
بخوی پدر باز گردد تمام
(صفحہ ۹۱)

(۲) کہ گر بچۂ شیرنر پروری
چو دندان کند تیز کیفربری
چو با زور و باچنگ برخیزد اوی
بہ پروردگار اندر آویزد اوی
(صفحہ ۲۲۱)

(۳) چنین گفت با من یکی هوشمند
کہ جانش خردبود و رایش بلند
کہ ای دایۂ بچۂ شیر نر
چہ رنجی کہ جان هم لیاری ببر

بکوشی و او را کنی پر هنر
تو بی بر شوی چون وی آید ببر
نخستین که آیدش نیروی جنگ
همان پرورانندہ آرد بچنگ
(صفحہ ۲۳۱)

(۴) ز دانا تو نشنیدی این داستان
کہ برگوید از گفتۂ باستان
کہ گر پروری بچۂ نرہ شیر
شود تیز دندان و گردد دلیر
چو سر برکشد زود جوید شکار
نخست اندر آید بپروردگار

بہ عنبر فروشان اگر بگذری
شود جامۂ تو همہ عنبری
وگر تو شوی نزد انگشت گر
ازو جز سیاهی نیابی دگر
ز بدگوهران بد نباشد عجب
نشاید ستردن سیاهی ز شب

میں اعتراف کرتا ہوں کہ شاہ نامے میں یہ ابیات نہیں ملتے ۔ نہ یہ انداز تکلف فردوسی کا مستمرہ انداز ہے ۔

ز ناپاک زادہ مدارید امید
کہ زنگی ز شستن نگردد سفید

یہ شعر شہرت پیدا کرکے ضرب المثل بن گیا ہے ۔ ایسی صاف اور ہموار زبان مشکل سے فروسی کی کہی جا سکتی ہے ۔ فردوسی اس کے قریب قریب خیال ان الفاظ میں لکھتا ہے :

ہر آن کس کہ دارد ز گیتی امید
چو جوئندہ خرماست از شاخ بید

دیگر

بساسانیان تا مدارید امید
مجوئید یاقوت از سرخ بید
(صفحہ ۵۱۴)

دیگر

بنابودنیہا مدارید امید
نگوید کہ بار آورد شاخ بید

بوستان سعدی میں ایک شعر یوں آتا ہے:

بکوشش نروید گل از شاخ بید
نہ زنگی بگرمابہ گردد سفید
(حکایت مرد درویش در خاک کیش)

سعدی کا پہلا مصرع فردوسی کے مصرعے سے ماخوذ ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک 'بار' کہتا ہے دوسرا 'گل'۔ لیکن سعدی کا دوسرا مصرع زنگی اور حمام کے خیال کا نہایت بلند واقع ہوا ہے۔ مگر ہجو کا مصرع اس سے بھی زبردست اور صاف ہے۔ مخفی نہ رہے کہ اگر سعدی کو ہجو کے اس مصرعے کی اطلاع ہوتی تو ہرگز ہرگز اپنا مصرع نہ لکھتے کیوں کہ جو لطافت کہ "زنگی بشستن نگردد سفید" میں ہے وہ سعدی کے مصرعے "نہ زنگی بگرمابہ گردد سفید" میں نہیں۔ حالانکہ کل فرق دونوں مصرعوں میں "گرمابہ" اور "شستن" کے استعمال میں ہے۔ اور نہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ شیخ سعدی ایک مبتذل سرقہ اپنے لیے کیوں گوارا کرتے۔ نیز فردوسی کی ہجو سے سعدی کا ناواقف رہنا بھی احتمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوا ہوں کہ ہجو نگاروں نے سعدی کے مصرعے میں "شستن" کے اضافے سے لطافت پیدا کرکے مصرعے پر اپنا

قبضہ کر لیا ۔ علاوہ ازیں بہمن نامے میں یہ شعر یوں ملتا ہے :

ز ناپاک زادہ مدارید امید
کہ ہندو بشستن نگردد سفید

ز بد اصل چشم بہی داشتن
بود خاک در دیدہ انباشتن

بیت ہٰذا ان ابیات سے ماخوذ ہے :

سر ناسزایان برافراشتن
وزیشان امید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردن ست
بجیب اندرون مار پروردن ست

دونوں کا مقصد ایک ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہی مضمون ایک مقام پر مختصر کر دیا گیا ہے اور دوسرے مقام پر طوالت سے بیان کیا گیا ہے ۔ بہمن نامہ کے شعر مذکورۂ بالا پر بھی لحاظ رہے۔

جہاندار اگر پاک نامی بدی
در این راہ دانش گرامی بدی
شنیدی چو زین گونہ گونہ سخن
ز آئین شاہان و رسم کہن
دگرگونہ کردی بکارم نگاہ
نہ گشتی چنین روزگارم تباہ

ان اشعار میں جو مطلب ادا کیا گیا ہے وہ اس سے قبل ان الفاظ میں ادا ہوا تھا :

اگر منصفی بودی از راستان
بہ اندیشہ کردی درین داستان
بگفتی کہ من در نہاد سخن
بدادستم از طبع داد سخن

ان کی بندش کی کمزوری کہہ رہی ہے کہ ان کا فردوسی سے کوئی تعلق نہیں ۔

اس تنقید سے جو گزشتہ صفحات میں کی گئی ہے ناظرین کرام پر ہجو کی مصنوعی ہستی کا راز فاش ہوگیا ہوگا ۔ اس کی مصنوعیت اور مجعولیت کا پردہ کامل طور پر چاک کر دیا گیا ہے ۔ اس ٹکسال کے اکثر سکے قلب ہیں اور وہ ابیات جن پر فردوسی کا داغ ہے شاہ نامے سے سرقہ کیے گئے ہیں ۔ ایک خفیف جزو دیگر اساتذہ کے ہاں سے لیا گیا ہے ۔ ہجو کا ایک حصہ اس قسم کا بھی ہے جن کو شاہ نامہ نہ اپنے خیابان کے پھول تسلیم کرتا ہے اور نہ تنقید کی روشنی ان پر سے تاریکی کے پردوں کو اٹھا سکتی ہے ۔ ممکن ہے کہ مستقبل ان کی اصلیت پر روشنی ڈالے ۔ فردوسی نے اگر نفس الامر میں کوئی ہجو لکھی تھی تو وہ فوراً برباد کر دی گئی ہے اور ضائع شدہ ہجو کا اب ایک شعر بھی ہمارے پاس نہیں ، البتہ اگر یہ فرض کرلیں کہ یہ وہی حصہ ہے جس کی سراغ رسانی کسی ماخذ تک نہیں کی جا سکتی ۔ اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر جان منڈویل کے ہیروں کی طرح ہجو کے ابیات میں بھی بالیدگی ، توالد اور تناسل کی قوت حلول کر آئی تھی کیوں کہ نظامی کے عہد میں چھ بیت سے چودھویں صدی میں ایک سو پچاس اشعار سے زیادہ اس کی تعداد پہنچ گئی ہے ۔ اس قسم کی ترقی ہم تبرکات میں مشاہدہ کرتے ہیں اور فردوسی کی ہجو کیا تبرک سے کم تھی ۔ حضرت عیسیٰ کی صلیب اگرچہ ابتدا میں ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا لیکن قرون وسطیٰ میں وہی تبرک اگر یورپ کے کلیساؤں سے لے کر ایک جگہ انبار کر دیا جاتا تو یقین ہے وہ انبار کئی گڑیوں میں نہ سما سکتا ۔ دنیا کی آبادی روزانہ ترقی کرتی جا رہی ہے ۔ اسی طرح فردوسی کی ہجو بھی روز افزوں ترقی کرتی گئی ۔ یہ کرشمہ اس میں شک نہیں نہایت حیرت انگیز ہے لیکن مظاہر افعال انسانی اس قسم

کی بہت مثالیں پیش کر رہے ہیں ۔

ہجو کیا ہے ؟ شاہ نامہ خواں دنیا کا انتقام ہے سلطان محمود غزنوی کے خلاف کیوں کہ وہ کسی فرد واحد کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے قصر کی تعمیر میں ساری قوم نے ہاتھ بٹایا ہے اور اس کی تکمیل میں کئی صدیاں گزری ہیں ۔ گرشاسپ نامۂ اسدی ، یوسف زلیخا ، بہمن نامہ اور بوستان سعدی میں چار صدیوں کا فاصلہ ہے اور جو اشعار ان وسائل سے لیے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سعدی کے زمانے تک ہجو کی تکمیل نہیں ہو چکی تھی ۔

مضمون کے لحاظ سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہجو کے ضمن میں بہت شعر مرادف اور مکرر ہو گئے ہیں ۔ ایسے ابیات کی طرف میں اپنی تنقید کے دوران میں اشارہ کر چکا ہوں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجو کی دو ولادت گاہیں ہیں ۔ شیعی نقطۂ خیال کے ابیات کی کثرت سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اس عقیدے کے اصحاب نے ہجو کی سرپرستی میں غالب حصہ لیا ہے ۔ ہجو کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ ذخیرہ شاہ نامے سے لیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ربط کلام کی غرض سے بعض اشعار میں اصلاح یا تبدیلی کی گئی ہو گی ۔ سلسلہ قائم کرنے کے لیے نئے اشعار کی بھی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی ۔ اس طرح سے یہ ہجو تیار ہوئی ہے جو آج بغیر کسی شبہے کے فردوسی کی تصنیف مانی جاتی ہے ۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دیباچہ نگار بایسنغر خانی نے ہجو کی تنظیم و تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے ۔

ذیل میں وہ اشعار قلمی ہوتے ہیں جو اسی غرض سے شاہ نامے سے لیے گئے ہیں نیز جو غیر ذرائع سے اخذ ہوئے ہیں ۔

اشعار ھجو

(۱) چہ گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نہی

(۲) که من شهر علمم علیم در است
درست این سخن قول پیغمبر است
(۳) گواهی دهم کین سخن راز اوست
تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست

اشعار شاه نامه

(طبع محمد مهدی اصفهانی ،
بمبئی ، ۱۲۶۲ھ)

(۱) چه گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نهی
(٦) که من شهر علمم علیم در است
درست این سخن گفت پیغمبرست
(۷) گواهی دهم کین سخن راز اوست
تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
(از دیباچهٔ شاه نامه، درستایش پیغمبر
و یارانش صفحه ، ۴)

---

(۴) چو باشد ترا عقل و تدبیر و رای
بنزد نبی و علی گیر جای
(۵) گرت زین بد آید گناه من است
چنین است و این رسم و راه من است
(٦) نباشد بجز بی پدر دشمنش
که یزدان بآتش بسوزد تنش

(۱) اگر چشم داری بدیگر سرای
بنزد نبی و علی گیر جای
(۲) گرت زین بد آید گناه من است
چنین ست آئین و راه من است

(۴) نباشد جز از بی پدر دشمنش
که یزدان بآتش بسوزد تنش
(دیباچهٔ شاه نامه در ستایش پیغمبر و یارانش ، صفحه ۴)

منم بندهٔ اهل بیت نبی
ستایندهٔ خاک پای وصی

منم بندهٔ اهل بیت نبی
سر افکنده بر خاک پای وصی
(شکایت فردوسی از پیری خود ، جلد اول ، صفحه ۲۵٦ ، و یوسف زلیخاے فردوسی)

بشش بیت این نامه و شش هزار
بگفتم نکرد ایچ در من نظار
چنین شهریاری و بخشندهٔ
بگیتی ز شاهان درخشندهٔ
نکرد اندرین داستانم نگاه
بگفتار بدگوی گم کرده راه
حسد برد بدگوئی درکار من
تبه شد بر شاه بازار من

(۱) بود بیت شش بار بیور هزار
سخن های شایستهٔ غم گسار
(۴) چنین شهریاری و بخشندهٔ
بگیتی ز شاهان درخشندهٔ
(۵) نکرد اندرین داستان‌ها نگاه
ز بدگوی و بخت بد آمد گناه

(۶) حسد برد بدگوئی درکار من
تبه شد بر شاه بازار من
(جلد چهارم ، ابتدائے داستان شیرین
و خسرو ، جلد چهارم ، صفحه ۱۰۵۱)

بسی سال و پنج از سرای سپنج
چنین رنج بردم بامید گنج
چو برباد دادند رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا
چو عمرم بنزدیک هشتاد شد
امیدم بیکبار برباد شد

سی و پنج سال از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج
چو برباد دادند رنج مرا
نبد حاصلی سی و پنج مرا
کنون عمر نزدیک هشتاد شد
امیدم بیکباره برباد شد
(تاریخ انجام شاه نامه ، صفحه ۱۱۰۲)

نه خسرو نژادی نه والا سری
پدر ز اصفهان بود آهنگری

نه خسرو نژادی نه والا سری
پدر ز اصفهان بود آهنگری
(جلد اول ، صفحه ۱۶۱ ، سطر ۱۵ -
از آخر ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

چو جاماسپ کاندر شمار سپهر
فروزنده تر بد ز تابنده مهر

چو جاماسپ کاندر شمار سپهر
فروزنده تر بد ز ناهید و مهر
(جلد چهارم ، صفحه ۱۰۷۳ ، ایضاً
صفحه ۵۴۳ ، نولکشور)

مر این نامهٔ شهریاران بخوان
سر از چرخ گردون همی بگذران

یکی نامهٔ شهریاران بخوان
نگر تا که باشد چو نوشیروان
(جلد چهارم ، عهد نامهٔ نوشیروان
بفرزند خود هرمز ، صفحه ۹۴۰)

چنین نامداران و گردن کشان
که دادم یکایک از ایشان نشان
همه مرده از روزگار دراز
شد از گفت من نام شان زنده باز
چو عیسلی من این مردگان را تمام
سراسر همه زنده کردم بنام

همه پهلوانان و گردن کشان
که دادم دربن قصه زیشان نشان
همه مرده از روزگار دراز
شد از گفت من نام شان زنده باز
منم عیسٰی آن مردگان را کنون
روانشان بمینو شده رهنمون
(جلد سوم ، ابتدای هفتخوان
اسفندیار ، صفحه ۵۹۹)

مرا در جهان بی نیازی دهد
میان یلان سرفرازی دهد

یکی بندگی کردم ای شهریار
که ماند ز تو در جهان یادگار
بناهای آباد گردد خراب
ز باران و از گردش آفتاب
پی افگندم از نظم کاخ بلند
که از باد و باران نیابد گزند
برین نامه بر عمرها بگزرد
بخواند هر آنکس که دارد خرد

(۱) مرا زین جهان بی نیازی دهد
میان یلان سرفرازی دهد
(۵) یکی بندگی کردم ای شهریار
که ماند ز من در جهان یادگار
(٦) بناهای آباد گردد خراب
ز باران و از تابش آفتاب
(۷) پی افگندم از نظم کاخ بلند
که از باد و باران نیابد گزند
(۸) برین نامه بر عمرها بگزرد
همی‌خواند آن کس که دارد خرد
(جلد دوم ، خاتمهٔ جنگ پیران ، در ستایش محمود وگلهٔ روزگار صفحه ۹۷۳)

چو این نامور نامه آمد به بن
پشیمان شد از گفتهای کهن
هر آن کس که دارد هش و رای و دین
پس از مرگ بر من کند آفرین
نمیرم ازین پس که من زنده ام
که تخم سخن را پراگنده‌ام

چو این نامور نامه آمد به بن
ز من روی گیتی بشد پر سخن
هر آن‌کس‌که داردهش و رای و دین
پس از مرگ بر من کند آفرین
نمیرم ازین پس که من زنده ام
که تخم سخن را پراگنده ام
(تاریخ انجام شاه نامه ، صفحه ۱۱۰۲)

پرستار زاده نیاید بکار
اگر چند باشد پدر شهریار

پرستار زاده نیاید بکار
وگر زان که باشد پدر شهریار
(جلد چهارم ، پاسخ نامهٔ خاقان از نوشیروان و فرستادن مهران ستاد را ، صفحه ۸۹۶)

پشیزی به از شهریاری چنین
که نه کیش دارد نه آئین و دین

پلنگی به از شهریاری چنین
که نه کیش دارد نه آئین و دین
(جلد چهارم ، صفحه ۳۳۶ - ۱۲۷۵ھ بمبئی)

چو فردوسی اندر زمانه نبود
بدان به که بختش جوانه نبود

که آن را میان و کرانه نبود
همان بخت نوذر جوانه نبود
(جلد اول ، آمدن افراسیاب بجنگ نوذر ، صفحه ۹۵)

چو گودرز و هشتاد پور گزین
سواران میدان و شیران کین

چو گودرز و هفتاد پور گزین
سواران میدان و شیران کین
(جلد چهارم ، صفحه ۱۰۷۲)

چو پروردگارش چنین آفرید
نیابی تو بر بند یزدان کلید

چو پروردگارش چنین آفرید
نیابی تو بر بند یزدان کلید
(جلد چهارم)

چو این نامور نامه آمد به بن
پشیمان شد از گفتهای کهن

چو بشنید شاه از پشوتن سخن
پشیمان شد از کردهای کهن
(جلد سوم ، رهائی زال از دست بهمن
صفحه ۶۶۲)

مرا در جهان شهریاری تو است
بسی بندگانم چو کیخسرو است

نه او در جهان شهریاری تو است
بزرگست و با عهد کیخسرو است
(جلد سوم ، پاسخ گشتاسپ باسفندیار ،
صفحه ۶۱۸)

من این نامهٔ شهریاران پیش
بگفتم بدین نغز گفتار خویش

که این نامهٔ شهریاران پیش
به پیوندم از خوب گفتار خویش
(خاتمهٔ جلد دوم ، صفحه ۵٦۴)

بدین زادم و هم برین بگزرم
چنان دان که خاک پی حیدرم

برین زادم و هم برین بگزرم
چنان دان که خاک پی حیدرم
(دیباچهٔ شاه نامهٔ قلمی، نعت و منقبت)

که پیش از تو شاهان فراوان بدند
همه نامداران گیهان بدند

برینگذشت بسیار شاهان بدند
همه نامداران گیهان بدند
(گرفتاری خاقان چین و شکست
تورانیان بدست رستم ، جلد سوم
صفحه ۳۸۰)

بنالم بدرگاه یزدان پاک
فشانده بر سر پراگنده خاک

بنالم ز تو پیش یزدان پاک
خروشان بسر بر پراگنده خاک
(خاتمهٔ داستان اسکندر ، در گلهٔ
آسمان و ستائش سلطان محمود ، جلد
سوم ، صفحه ۲۰ـ۷)

نمرده است و هر گز نمیرد سخن
سخندان ز من این سخن فهم کن
فزون از تو بودند یکسر بجاه
بگنج و سپاه و به بخت و کلاه

نمرده است و هرگز نمیرد سخن
بود تازه هر چند گردد کهن
ز فرهاد و گیوت بر آرم بجاه
بگنج و سپاه و به تخت و کلاه
(خواستن بیژن نبرد هومان از گودرز ،
جلد دوم ، صفحه ۴۴۰)

اشعار هجو

ز ناپاک زاده مدارید امید
که زنگی بشستن نگردد سفید

اشعار غیر شاه نامه

بکوشش نروید گل از شاخ بید
نه زنگی بگرمابه گردد سفید
(بوستان سعدی ، حکایت مرد درویش
در خاک کیش)

که سفله خداوند هستی مباد
جوانمرد را تنگ دستی مباد

که سفله خداوند هستی مباد
جوانمرد را تنگ دستی مباد
(بوستان سعدی ، حکایت کریم تنگدست
با سائل)

بزرگی سراسر بگفتار نیست
دو صد گفته چون نیم کردار نیست

هنرها سراسر بگفتار نیست
دو صد گفته چون نیم کردار نیست
(گرشاسپ نامهٔ اسدی ، رسیدن
رسول گرشاسپ نزد فغفور)

چو گرشاسب و سام و نریمان گرد
جهان پهلوانان با دست برد

ز جا در ربوده بهومان سپرد
جهان پهلوانان با دست برد
(برزو نامه داستان سوسن رامش گر ،
ملحقات)

سر ناسزایان بر افراشتن
وز ایشان امید بهی داشتن
سر رشتهٔ خویش گم کردن است
بجیب اندرون مار پروردن است
ز بد اصل چشم بهی داشتن
بود خاک در دیده انباشتن

ز ناجنس چشم بهی داشتن
بدل تخم یاری ازو کاشتن
سررشتهٔ خویش گم کردن است
بجیب اندرون مار پروردن است
ز ناجنس چشم بهی داشتن
بدل تخم یاری ازو کاشتن
(بهمن نامه ، قلمی)

فردوسی کا مذہب

مذہب فردوسی کے موضوع پر حافظ صاحب کا یہ فاضلانہ مضمون جنوری ۱۹۲۵ع کے ''اردو'' میں چھپا - ''فردوسی پر چار مقالے'' کا یہ تیسرا مقالہ ہے -

اس موضوع پر اکثر و بیشتر ایرانی فضلا کسی بحث کی گنجائش کے معترف نہیں ہیں - ان کے نزدیک یہ ایک فیصلہ شدہ امر ہے - البتہ مجلہ ''مہر'' کے فردوسی نمبر میں محمد محیط طباطبائی صاحب کا ایک خیال افروز مضمون ''عقیدۂ دینی فردوسی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا ، جس میں وہ اپنے ہم وطنوں سے مختلف نتیجے پر پہنچے ہیں اور انھوں نے اس مسئلے پر مزید تحقیق کی ضرورت کا اعتراف بھی کیا ہے - چنانچہ اپنے مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں :

''...خیلی متاسفم از اینکہ از طرف مجلہ ''مہر'' خیلی دیر از این ناتوان تقاضا شد کہ راجع بفردوسی چیزی بنویسد و تا موقعی کہ شروع بہ تحقیق و نگارش این مقالہ شد گمان نمی کرد نتیجۂ بحث تاریخی بدینجا رسد کہ فردوسی شیعۂ زیدی باشد پس از آنکہ خلاصہ استقرا و بحث بپایان آمد و بدین نتیجہ رسید دیگر مجال آن نیافت کہ یکایک مواردتی را کہ در شاہنامہ موافق اصول عقائد زیدیہ و معتزلہ سخن راندہ است استخراج کند......و آرزو دارد کہ آقایان خاور شناسان و پژوھندگان ھر نظری در این باب دارند اظہار فرمایند تا در نتیجہ بحث و انتقاد این جزٔ تاریک از شخصیت فردوسی روشن گردد -'' (مرتب)

جس طرح فردوسی کے حالات کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غیر یقینی ہے ، فردوسی کے مذہب کے متعلق بھی ہمارا علم ناقابل اعتبار ہے - ہم نے یہ مان لیا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور اسی پر مطمئن ہیں - لیکن تحقیقات کی روشنی میں ہمارا یہ اعتقاد وہم و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا -

پرانی روایات اس کو شیعہ بیان کرتی ہیں - 'شاہ نامہ' اس بارے میں متضاد اور متناقض شہادت پیش کرتا ہے جس کی رو سے فردوسی شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سنی بھی - یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص شیعہ اور سنی دونوں ہو نہیں سکتا - البتہ ایک امر یقینی ہے کہ جہاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی ، فلسفی ، دہریہ ، ملحد ، کافر اور معتزلی کہا وہاں اس کو رافضی بھی کہا - اب دشمنوں کے بیانات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے - اگر وہ ملحد اور مجوسی تھا تو شیعہ بھی تھا - اگر یہ نہیں تھا تو وہ بھی نہیں تھا -

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا ان ایام میں مذہبی نوعیت کے افترا اور بہتان لگانے کا میلان رکھتی تھی - حسنک میکال آخری وزیر سلطان محمود غزنوی پر بھی ملحد اور قرمطی ہونے کا الزام لگایا گیا تھا اور خلیفہ بغداد نے سلطان محمود سے اس کا سر طلب کیا تھا - اصل واقعہ صرف اس قدر تھا کہ جب حسنک حج بیت اللہ کے لیے گیا ، فاطمین مصر نے اس کے اور سلطان کے لیے چند تحائف بھیجے ، جن کو اس نے قبول کر لیا - سلطان محمود نے ، جو اپنے وزیر کے مذہب سے خلیفہ کی بہ نسبت زیادہ صحیح واقفیت رکھتا تھا ، جواب میں کہلا بھیجا کہ حسنک میرے سامنے کا بچہ ہے - میں نے اس کو تربیت کیا ہے - اگر وہ تمھارے نزدیک قرمطی ہے تو سمجھ لو کہ میں بھی قرمطی ہوں - لیکن محمود کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطان مسعود کے دور میں حسنک میکال کو اسی جرم میں سولی دی جاتی ہے -

قدیم روایات جن کے متعلق ایما ہو چکا ہے، حقیقت میں فردوسی کو شیعہ مانتی ہیں۔ ان میں سب سے پرانی دیباچہ قدیم کی روایت ہے جس کی رو سے سلطان محمود کے دربار میں فردوسی کی محرومی کا اولین محرک اس کا مذہب تھا۔ لیکن صاحب دیباچہ یہ ذکر نہیں کرتا کہ وہ مذہب کیا تھا۔ اس کے الفاظ ہیں :

"اما بر سر شاہ نامہ شرط ادب نگاہ نداشتہ بود و سخن در مذہب خود گفتہ :

گرت زین بد آید گناہ منست

چنین است این رسم و راہ منست

سلطان را ناخوش آمد و سیاست فرمود۔ پس عنصری و جملہ شاعران زمین بوس کردند و از سیاست خلاص دادند۔"

نظامی عروضی کی شہادت کی رو سے فردوسی صریحاً شیعہ اور معتزلی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ خواجہ کے دشمنوں نے سلطان کو فردوسی کے انعام کے لیے مشورہ دیتے وقت کہا کہ صرف پچاس ہزار درم کافی ہوں گے اس لیے کہ وہ رافضی اور معتزلی ہے۔ دوسرے موقعے پر نظامی فردوسی کی شیعیت کا اس وقت ذکر کرتا ہے جب فردوسی سلطان محمود کی ہجو لکھ کر اور فرار ہو کر طبرستان میں اسپہبد شہریار کے پاس جو آل باوند کا ایک رکن تھا، پناہ گزین ہوتا ہے۔ جب شاعر شہریار کے نام پر شاہ نامہ منسوب کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اسپہبد شہریار جواب میں اس وقت کہتا ہے : اے استاد! محمود کو دشمنوں نے بہکا دیا اور تیری کتاب کا ذکر مناسب موقعے پر نہیں کیا اور تیری بدگوئی کی گئی۔ دوسرے تو شیعہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور جس کو خاندان پیمبر سے محبت ہوتی ہے دنیاوی معاملات میں سرسبز نہیں ہوتا کیونکہ خود اہل بیت کو کامیابی نہیں ہوئی۔ نظامی کی اصل عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے :

(۱) "اما خواجۂ بزرگ (احمد بن حسن میمندی) منازعان

داشت که پیوسته خاک تخلیط در قدح جاه او همی انداختند ـ محمود با آن جماعت تدبیر کرد که فردوسی را چه دهم ـ گفتند پنجاه هزار درم و این خود بسیار باشد که او مرد رافضی است و معتزلی مذهب و این بیت بر اعتزال او دلیل کند که او گفت :

به‌بینندگان آفریننده را
نه بینی مرنجان دو بیننده را

و بر رفض او این بیت ها دلیل است که او گفت :

خردمند گیتی چو دریا نهاد
برانگیخته موج ازو تند باد
میانه یکی خوب کشتی عروس
بر آراسته هم چو چشم خروس
اگر خلد خواهی بدیگر سرای
به نزد نبی و وصی گیر جای
چو هفتاد کشتی درو ساخته
همه بادبانها برافراخته
پیمبر بدو اندرون با علی
همه اهل بیت نبی و وصی
گرت زین بد آید گناه منست
چنین دان و این راه راه منست
برین زادم و هم برین بگذرم
یقین دان که خاک پی حیدرم

(چهار مقاله، طبع یورپ ، صفحه ۴۹)

(۲) "و شاه نامه برگرفت و بطبرستان شد به نزدیک اسپهبد شهریار که از آل باوند در طبرستان بادشاه او بود و آن خاندانی است بزرگ ، نسبت ایشان بیزدگرد شهریار پیوندد

و پس محمود را هجا کرد در دیباچه بیتی صد و بر شهریار خواند و گفت من این کتاب را از نام محمود با نام تو خواهم کردن که این کتاب همه اخبار و آثار جدان تست ۔ شهریار او را بنواخت و نیکوئی ها فرمود وگفت یا استاد! محمود را بر آن داشتند و کتاب را بشرطی عرضه نه کردند و ترا تخلیط کردند و دیگر تو مرد شیعیئی و هرکه تولیٰ به خاندان پیغمبر کند او را دنیاوی هیچ کاری ارود که ایشان را خود نه رفته است ۔ محمود خداوندگار منست ، تو شاه نامه بنام او رها کن و هجو او به من ده تا بشویم و ترا الدک چیزی بدهم ۔"

(چہار مقالہ ، صفحہ ۴۹ - ۵۰)

لیکن نظامی کے بیانات پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لیے کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سرپرستی کی روایت کی ، جس کا نظامی مدعی ہے ، شاہ نامہ تائید نہیں کرتا ۔ البتہ سلطان کے وزیر اول کا ذکر دو مقام پر شاہ نامے میں ملتا ہے اور فردوسی اس کا شکر گزار بھی معلوم ہوتا ہے :

ز دستور فرزانۂ داد گر

پراگندہ رنج من آمد بسر

(شاہ نامہ ، صفحہ ۲۴۴ ، طبع بمبئی ، سن ۱۲۷۵ھ)

نیز فردوسی کے شیعہ تذکرہ نگار خواجہ احمد بن حسن میمندی کو ، جسے غلطی سے وہ عام طور پر حسن میمندی لکھنے کے عادی ہیں ، بالعموم فردوسی کا دشمن بیان کرتے ہیں ۔ فردوسی کے ان دوستوں میں خواجہ کی نسبت اظہار دشمنی میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ غریب خواجہ کو خارجی مشہور کر دیا گیا ۔ چنانچہ عبارت ذیل ملاحظہ ہو :

"و چنین گویند ارکان دولت سلطان از سہر و نواحی

بافردوسی انواع خلق و محبت و کرم همی نمودند و فردوسی در مدح ایشان سخن گفتی و حسن میمندی ازین جهت با فردوسی مظنه داشتی و غباری درمیان ایشان شده بودی و هیچ نوع چنان چه فرمودهٔ سلطان بود با او بجا نیاوردی تا بحدی که فردوسی گفت که حضرت حق عز شانه در ازل چنان تقدیر فرموده بود که این کتاب بر زبان من تمام شود و مرا در مال سلطان طمعی نیست و بجاه و تقرب حسن میمندی احتیاجی ندارم - می گفت - مثنوی (کذا) :

من بنده کز مبادی فطرت نبوده ام
مائل به مال هرگز و طامع بجاه نیز
سوی در وزیر چرا ملتفت شوم
چون فارغم ز بارگه بادشاه نیز

و گویند حسن میمندی در طبع خوارج بود و فردوسی که تشیع به طبیعت داشت او را عدم الوجود میدانست وهر چند احبا و اودا فردوسی را بر موافقت و ترک مخالفت وزیر تحریص می کردند او اجتناب و اعتراض زیاده نموده میگفت :

بدل هر که بغض علی کرد جای
ز مادر بود عیب آن تیره رای
که ناپاک زاده بود خصم شاه
اگر چند باشد بایوان و گاه
ز میمندی آئین مردی مجوی
ز نام و نشانش مکن جستجوی
قلم بر سر او بزن همچو من
که گم باد نامش به هر انجمن

(دیباچه بایسنغرخانی)

یہ بیانات اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے سر و پا ہیں ؛ نہ فردوسی

ایسا خود پسند اور مغرور تھا ، نہ خواجہ احمد بن حسن میمندی خارجی ، اور نہ یہ اشعار فردوسی کے ۔ لیکن میں نے اس غرض سے ان کو یہاں نقل کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ شیعہ حلقوں میں خواجہ کس نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔

فردوسی کی انتہائی پیری اور جسمانی کمزوریوں کا خیال کرتے ہوئے اسّی سال کی عمر میں طبرستان جیسے دور دراز ملک کا سفر اختیار کرنا اور جاتے ہی شہریار کے ہاں رسائی پیدا کر لینا غیراغلب معلوم ہوتا ہے ، جس طرح کہ خود شہریار کی شخصیت غیریقینی ہے ۔

اسپہبد شہریار

تاریخ میں اس کی شخصیت نہایت عجیب ہے ۔ نہ صرف اس کے نام بلکہ اس کی ہستی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جانا چاہیے ۔ اس کی زندگی کے کارناموں سے ہمیں اس قدر علم ہے کہ :

شہریار ، شروین بن رستم بن سرخاب بن قارن بن شہریار کا فرزند ہے جو ماکان بن کاکی کا معاصر تھا اور شہریار خود رکن‌الدولہ بویہ اور وشمگیر بن زیار کا ہم عصر تھا ۔ اس کا فرزند جو دادا کے نام پر شروین کے نام سے موسوم تھا ، اس کی حیات میں وفات پا جاتا ہے اور شہریار قابوس بن وشمگیر اور سلطان محمود کے زمانے تک زندہ رہتا ہے اور فردوسی اسی کے دربار میں شاہ نامہ لے کر جاتا ہے ۔

یہ بیان میں نے ابن اسفند یار کی تاریخ طبرستان کے انگریزی ترجمے سے لیا ہے جس کو پروفیسر براؤن نے شائع کیا ہے ۔ مرزا محمد قزوینی شہریار کے زمانے کے متعلق صاحب مرزبان نامہ کے ذکر میں کہتے ہیں :

"پدر مرزبان اسپہبد رستم بن شہریار بن شروین معاصر شمس المعالی قابوس بن وشمگیر (۳۶۶—۴۰۳م) بود در

فریم (بریم) و شہریار کوہ قائم مقام پدر شد و پدرش شہریار بن شروین معاصر سلطان محمود غزنوی بود و در ۳۳۷ هجری(بقول شیفر۔ معلوم نیست از روی چہ ماخذی) بہ تخت نشست و مدتی دراز بماند و زمان سلطان محمود را درک نمود و اوست کہ فردوسی بعد از فرار از دربار سلطان محمود بنزد وی رفت و خواست کہ شاہ نامہ بنام او کند و آن حکایت معروفست ۔"

(مرزبان نامہ ، مقدمۂ مصحح ، صفحہ واو)

اس کی تاریخ وفات کے لیے مرزا موصوف لکھتے ہیں :

"تاریخ وفات این شہریار معلوم نیست ۔ همین قدر ابن اسفندیار گوید : "شہریار مدتی دراز بماند ۔ تا در عہد شمس المعالی قابوس بن وشمگیر و هم در عہد سلطان یمین الدولہ محمود بماند" و چون تاریخ اتمام شاہ نامہ در ۴۰۰ هجری است در هرحال وفات شہریار بعد ازان واقع شدہ است ۔" (چہار مقالہ ، صفحہ ۱۹۰)

گویا ۳۳۷ ہجری میں شہریار تخت نشین ہو کر ۴۰۰ هجری کے بعد تک زندہ رہا ۔ یہ طویل مدت سلطنت بجائے خود ایک حیرت خیز امر ہے اور تریسٹھ سال سلطنت کرنے کے باوجود اس دراز مدت میں وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کا تاریخیں ذکر کرتیں ۔

اس کے معاصر وشمگیر اور رکن الدولہ جب کہ ۳۵۷ هجری اور ۳۶۶ھ میں وفات پاتے ہیں شہریار فردوسی کے انتظار میں پانچویں صدی کے آغاز تک مرنے کا نام نہیں لیتا ۔ مرزا محمد کا بیان اور بھی عجیب ہے ؛ وہ کہتے ہیں کہ رستم شہریار کا فرزند شمس المعالی قابوس کا ہم عصر ہے اور خود شہریار سطان محمود (۳۸۸ھ و ۴۲۱ھ) کا ہم عہد ہے ۔ اس طرح بیٹا باپ سے پہلے تخت نشین ہوجاتا

ہے ۔ اس سے عجیب وہ بیان ہے جو ابن اسفندیار دے رہا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

”شہریار کا جانشین اسپہبد دارا ہوا جس نے صرف تھوڑی مدت حکومت کی ۔ دارا کے بعد اس کا فرزند اسپہبد شہریار[1] برسر تخت آیا جو قابوس بن وشمگیر کے ساتھ اس کی اٹھارہ سالہ مہاجرت میں شریک رہا ۔ جرجان میں قابوس کے ساتھ واپس آیا اور یہاں آ کر اس نے کارہائے نمایاں کیے ۔ شہریار کوہ فتح کیا اور باقی بن سعید کی اعانت سے ۳۸۷ھ میں اس نے فیروزان بن حسن کو شکست دی اور قابوس کے لیے ملک کو پاک و صاف کر کے جب خود طاقت ور ہوگیا تو قابوس سے بغاوت کی اور رستم بن مرزبان کے ہاتھ پر گرفتار ہو کر باقی عمر قید میں گزاری ۔“

اب ایک نئی دشواری پیش آتی ہے ؛ یعنی ایک شہریار کے بجائے ایک ہی وقت میں دو شہریار ماننے پڑتے ہیں ۔ یعنی شہریار ثانی اور شہریار ثالث (آل باوند میں تین شہریار گزرے ہیں) شہریار ثالث اگرچہ دارا کا فرزند اور جانشین ہے اور شہریار ثانی اگرچہ دارا کا مورث ہے ، دونوں ہمعصر بن جاتے ہیں کیوں کہ بقول ابن اسفندیار دونوں قابوس اور سلطان محمود کے معاصر ہیں ۔ شہریار ثالث قابوس کے لیے اس کا آبائی ملک فتح کرتا ہے لیکن شہریار ثانی کسی اور ضرورت سے نہیں ، صرف فردوسی کی خاطر سنہ ۴۰۰ ھجری کے بعد تک زندہ ماناجاتا ہے ۔

---

۱ ۔ یہ یاد رہے کہ اسی شہریار کو تاریخ یمینی میں ”اسپہبد شہریار بن شروین“ کہا گیا ہے ۔ دیکھو صفحہ ۱۷۳ ، تاریخ یمینی ، مطبع محمدی ۔ لاہور ۔ (حاشیۂ مصنف)

ان مشکلات کو مدنظر رکھ کر میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ شہریار ثانی کی وفات کو قابوس کی جلا وطنی کے زمانے سے قبل جو سنہ ۳۷۰ھ سے شروع ہو کر سنہ ۳۸۸ ہجری پر ختم ہوتا ہے، مان لیا جائے اور اس کے دربار میں فردوسی کے جانے کے قصے کو بے بنیاد تصور کیا جائے۔

ایک فرانسیسی کتاب میں (مملوکہ پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور [1]) جس کا نام اس وقت میری یاد سے اتر گیا ہے، شہریار ثانی دارا اور شہریار ثالث کے سنین سلطنت حسب ذیل ملتے ہیں:

شہریار ثانی: جلوس	سنہ	۳۱۷ھ م	سنہ ۹۲۹	عیسوی
وفات	"	۳۵۵ھ م	" ۹۶۶	"
دارا: جلوس	"	۳۵۵ھ م	" ۹۶۶	"
وفات	"	۳۶۲ھ م	" ۹۷۲	"
شہریار ثالث: جلوس	"	۳۶۲ھ م	" ۹۷۲	"
وفات	"	۳۹۷ھ م	" ۱۰۰۶	"

ان سنین پر بہ ظاہر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ شہریار ثانی کے پاس فردوسی کا سنہ ۴۰۰ ہجری میں جانا ناممکن ہے۔ رہا شہریار ثالث، اول تو اس کے دربار میں فردوسی کا جانا تسلیم نہیں کیا جاتا، اگر مان لیا جائے، کیوں کہ تاریخ عتبی میں اسی شہریار کو اسپہبد شہریار بن شروین کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس لیے احتمال ہوسکتا ہے کہ فردوسی اس کے پاس گیا ہو۔ لیکن فردوسی کو اس کے پاس جانے کے لیے کوئی وقت نہیں ملتا۔ شہریار ثالث سنہ ۳۹۷ ہجری میں وفات پاتا ہے لیکن وفات سے قبل

۱۔ یہ مضمون تحریر کیے جانے کے وقت مولوی صاحب مرحوم اسی عہدے پر متمکن تھے۔ (مرتب)

ایک عرصہ قید میں گزارتا ہے اس لیے سنہ ۴۰۰ ہجری میں فردوسی اس کے ہاں بھی نہیں جا سکتا ۔

ایک اور امر قابل توجہ ہے ؛ مرزا محمد حاشیۂ چہار مقالہ صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ چہار مقالہ کے تمام نسخوں میں شہریار کے بجائے شہرزاد اور طہران کے مطبوعہ چہار مقالہ میں شیرزاد اور ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان کے نسخوں میں شہریار تھا ۔ چوں کہ تاریخ میں کسی شہرزاد یا شیرزاد کا سراغ نہیں چلا اسی لیے انھوں نے ابن اسفندیار کی سند پر شہریار اختیار کر لیا ۔ بہر حال یہ شہریار یا شہرزاد یا شیرزاد ، خواہ ہم اس کو کسی نام سے پکاریں ایک ایسی عجیب ہستی ہے جس کے نام اور شخصیت پر پردہ پڑا ہوا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کا وجود افسانوی ثابت ہو ۔

بقول نظامی شہریار محمود کو اپنا آقا تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے "محمود خداوندگار منست" لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان ایام میں سلطان محمود کا طبرستان سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔ ان ممالک کا بادشاہ قابوس بن وشمگیر تھا اور شہریار اس کا محکوم تھا ۔ ان حدود میں محمود کے سیاسی اثرات قابوس کی وفات کے ایک عرصے بعد پھیلتے ہیں ۔

حق یہ ہے کہ فردوسی نہ طبرستان گیا ، نہ اور کہیں بلکہ جب سلطان محمود سے مایوس ہوا تو امیر ابوالمظفر نصر بن ناصر الدین برادر سلطان محمود کے پاس غالباً خراسان یا سجستان چلا گیا ۔ میرا یہ عقیدہ خود شاہ نامے کے بیانات پر مبنی ہے ۔ نصر ان ایام میں یا امیرالجیوش خراسان تھا یا والیِ سجستان ۔ اس کا ایک درہم ضرب سجستان سنہ ۴۰۱ ہجری لاہور میوزیم میں محفوظ ہے ۔

داستان شیریں خسرو کی تمہید میں فردوسی شاہ نامے کے ذکر کے بعد سلطان سے اپنے تعلقات کی برہمی کا تذکرہ یوں کرتا ہے :

بود بیت شش بار بیور هزار
سخن های شایستهٔ غمگسار
نه بیند کسی نامهٔ پارسی
نوشته بابیات صد بار سی
اگر باز جویند ازو بیت بد
همانا نباشد کم از پنج صد
چنین شہریاری و بخشندهٔ
بگیتی ز شاهان درخشندهٔ
نکرد اندرین داستان‌ها نگاه
ز بد گوئی و بخت بد آمد گناه
حسد برد بد گوی درکار من
تبه شد بر شاه بازار من

اور سالار شاہ یعنی امیر نصر کی خدمت میں شاہ نامہ پیش کرکے صلہ کا امیدوار ہوتا ہے - ساتھ ہی امیر نصر سے استدعا کرتا ہے کہ امیر موصوف سلطان سے اس کی سفارش کرے - چنانچہ شاہ نامہ :

چو سالار شہ این سخنہای نغز
بخواند ببیند بپاکیزه مغز
ز گنجش من ایدر بوم شادمان
کزو دور بادا بد بدگمان
وزان پس کند یاد بر شہریار
مگر تخم رنج من آید ببار
که جاوید باد افسر و تخت او
ز خورشید تابنده تر بخت او

اشعار بالا میں فردوسی سلطان کی نا قدر دانی کا شاکی ہے جو دشمن کی سعایت اور بد گوئی کا نتیجہ ہے - اس بدگوئی کی تشریح اور تاویل تذکرہ نگاروں نے فردوسی کے اعتزال اور شیعیت سے کی ہے -

لیکن ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاویل بالکل نا مناسب ہے اور میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ اس بدگوئی کا فردوسی کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔ عام اس سے کہ وہ شیعہ ہو یا معتزلی یا سنی ، مختصر یہ کہ مذہب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ۔

حقیقت نفس‌الامر یہ ہے کہ قدما بھی فردوسی کے مذہب سے اسی قدر تاریکی میں ہیں جس قدر کہ ہم اور ہمارے اہل عصر ۔ ذیل میں شاہ نامے سے وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو ہمارے شاعر کی شیعیت کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ دیباچۂ شاہ نامہ میں خلفائے راشدین کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد ، جیسا کہ اہل تسنن کا دستور ہے ، یہ اشعار آتے ہیں :

حکیم این جهان را چو دریا نهاد
برانگیخته موج ازو تند باد
چو هفتاد کشتی برو ساخته
همه بادبانها برافراخته
یکی پهن کشتی بسان عروس
بیاراسته هم چو چشم خروس
محمد بدو اندرون با علی
همان اهل بیت نبی و وصی
خردمند کز دور دریا بدید
کرانه نه پیدا و بن نا پدید
بدانست کو موج خواهد زدن
کس از غرق بیرون نخواهد شدن
بدل گفت اگر با نبی و وصی
شوم غرقه دارم دو یار وفی
همانا که باشد مرا دستگیر
خداوند تاج و لوا و سریر

خداوند جوی و می و انگبین
همان چشمهٔ شیر و ماء معین
اگر چشم داری بدیگر سرای
بنزد نبی و علی گیر جای
گرت زین بد آید گناه منست
چنین است این رسم و راه منست
دلت گر براه خطا مائل است
ترا دشمن اندر جهان خود دلست
نباشد جز از بی پدر دشمنش
که یزدان بآتش بسوزد تنش

خلفاے راشدین کی منقبت کے بعد ہی دیباچے میں ان اشعار کا ایراد ان کی حیثیت کو مشتبہ کر رہا ہے - پچھلے تین اشعار ، جن میں غیر ضروری جوش دکھایا گیا ہے ، رہا سہا پردہ فاش کر دیتے ہیں - فردوسی سے سخت انتعال کے موقعوں پر بھی ایسی سخت زبان کی مشکل سے امید کی جاتی ہے - وہ جس طرح نرم گفتاری اور شیریں زبانی کی تلقین کرتا ہے اسی طرح اس پر عمل بھی کرتا ہے - اس بارے میں اس کا مقولہ ہے کہ :

درشتی ز کس نشنود نرم گوی
سخن تا توانی - بآزرم گوی

جو لوگ شاہ نامے کے ذریعے فردوسی کے اخلاق ، خصائل اور سیرت سے واقف ہیں ، ہرگز ہرگز یقین نہیں کر سکتے کہ فردوسی ان اشعار کا مصنف ہے - نیز شاہ نامے کا دیباچہ تنگ چشمانہ مذہبی جوش دکھلانے کے لیے قطعی غیر موزوں مقام ہے - اظہار عقیدت کی غرض سے میں مانتا ہوں کہ فردوسی شیعہ ہونے کی بنا پر محبت و تفضیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے جو چاہتا لکھتا لیکن نہ ایسی زبان میں جس سے دوسرے فریق کی دل آزاری کا احتمال ہو -

سلطان محمود ایک سنی بادشاہ تھا اور شیعہ حلقوں میں کٹر سنی مانا جاتا ہے ۔ بلکہ نظامی عروضی کہتا ہے ''سلطان محمود مردی متعصب بود'' (چہار مقالہ ، صفحہ ۹۴) ۔ ایسے بادشاہ کے دربار میں اول تو شیعہ سلاطین بویہ و دیالمہ کو چھوڑ کر فردوسی کا جانا کیا ضرور تھا ، اور اگر گیا تھا تو اپنے مذہب کا آشکار کرنا کیا فرض تھا ، اور اگر کیا تھا تو صورت حالات میں سب سے معقول اور سنجیدہ طریقہ یہی تھا کہ اپنے مذہب کا ایسے الفاظ میں ذکر کرتا جس سے کم سے کم درباری مذہب یا اس مذہب کو جس کہ سلطان پیرو تھا ، صدمہ نہ پہنچتا کیوں کہ سلطان کے ہاں فردوسی (اور اس امر پر تمام اسناد اور خود فردوسی متفق ہیں) انعام اور صلے کی امید میں گیا تھا نہ اس کے مذہب پر سب و شتم کرنے اور اپنے مذہب کی احمقانہ تلقین کرنے ۔ میرا مقصد اسی قدر ہے کہ فردوسی کو معقول پسند انسان ہونے کی حیثیت سے سلطان کے مذہبی جذبات کو کسی طرح بر افروختہ کرنا نہیں چاہیے تھا ۔ اس قدر جاننے کے بعد جب ہم شاہ نامے میں ایسے اشعار دیکھتے ہیں :

دلت گر براہ خطا مائلست
ترا دشمن اندر جہان خود دلست

نباشد جز از بی پدر دشمنش
کہ یزدان بآتش بسوزد تنش

تو ہمارا استعجاب اس کے انتہائی درجے تک پہنچ جاتا ہے ۔ اگر فردوسی ان اشعار کا مالک ہے تو ہم کو ماننا ہو گا کہ یا تو اس کو سلطان سے صلے کی کوئی توقع تھی ہی نہیں یا یہ کہ مذہبی جنون اس پر غالب تھا جس کے اثرات میں اس نے محمود جیسے جابر بادشاہ کے تعصبات مذہبی کی پروا نہ کر کے اس کے جلال اور دبدبے اور

کروفر اور مطابق العنانی کو یک قلم فراموش کر کے صاف صاف اس کو خارجی بنا دیا اور اس کے منہ پر کہہ بھی دیا :

"تم اگر راہ خطا پر جاتے ہو تو تم خود اپنے دشمن ہو۔ حضرت علی کا دشمن ایک بے پدر ہی ہوسکتا ہے جس کو خدا آتش جہنم میں جھونکے۔"

اب یہ راہ خطا کیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دشمن کون ہے ؟ خارجی فرقہ ! فردوسی صلے کی امید میں دربار سلطانی میں جاتا ہے ، نہ اس کو خارجی المذہب بیان کرنے اور بلا وجہ اشتعال دینے ۔ اگر اس کو جنون نہ کہا جائے تو کیا سمجھا جائے ۔ بے پدر (حرام زادہ) جیسے عریاں لفظ کا استعمال فردوسی نے انتہائی اشتعال کے موقعوں پر بھی نہیں کیا ۔ دیباچے میں ایسی بے باکی اس سے نا ممکن ہے ۔

ہماری خوش عقیدگی کو اس کے انتہائی مدارج تک پہنچا دینا ہے اگر ہم سے اس اعتقاد کی امید کی جائے کہ یہ اشعار فردوسی نے واقعۃً سلطان کو خطاب کر کے پڑھے تھے ۔ اس سے میں یہ مان لینا ہزار درجے بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ الحاقی ہیں اور فردوسی نے ہرگز نہیں لکھے ۔

دیباچے کے علاوہ شاہ نامے میں دو تین مقام اور ایسے ہیں جہاں شیعہ رنگ کے اشعار ملتے ہیں ۔ مثلاً خاتمۂ داستان سیاوش کے یہ ابیات :

بدان گیتیم نیز خواهش گراست
که با ذوالفقار است و با منبراست

منم بندهٔ اهل بیت نبی
سر افگنده بر خاک پای وصی

اور داستان نوش[1]زاد کے خاتمے کے یہ ابیات :

(١) اگر در دلت هیچ مهر علی‌است
ترا جد شبتر بخواهش گریست

(٢) همینو بدو رسته گردیم و بس
در رستگاری جز او نیست کس

(٣) اگر در دلت زو بود هیچ ریغ
بدان کو بهشت از تو دارد دریغ

(٤) دل شهریار جهان شاد باد
همین گفتهٔ من ورا یاد باد

(٥) جهان دار محمود جویای حمد
کزو در همه دل بود جای حمد

(٦) سر تاج او شد ستون سپهر
همیشه ز فرش فروزنده مهر

داستان نوشزاد فردوسی کے غزنوی کلام سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ سلطان کے مدحیہ ابیات سے صاف ظاہر ہے - یہاں پھر فردوسی سلطان کو اپنے مذہب کی تلقین کر رہا ہے اور بدقسمتی سے ایسی طرز میں جو ایک معمولی مستمع کو بھی ناگوار گزرے ، چہ جائے کہ ایک سلطان جابر و قاہر کو جو محمود کے پائے کا ہو اور خود اپنے مذہب میں سخت ہو - حضرت علی سے کینہ رکھنے والا خوارج کے سوا اور کوئی نہیں -

ان اشعار کو بھی پہلے اشعار کی طرح میں الحاقی مانتا ہوں -

---

١ - شاہ نامے کے ایک مخطوطہ نوشتہ ٨٥٥ھ میں اشعار ٢ و ٣ درج نہیں اور شعر ١ حسب ذیل ہے :
اگر در دلت هیچ حب علیست
ترا روز محشر بخواهش نیست
(حاشیۂ مصنف)

مذکورۂ بالا وہ تمام عنصر ہے جس پر شاہ نامے میں فردوسی کی شیعیت کی شہادت ختم ہو جاتی ہے ۔

ہجو میں اس کی شیعیت کے اثبات کا مواد شاہ نامے سے کہیں زیادہ ملتا ہے ۔ یہاں میں وہ اشعار بھی حوالۂ قلم کرتا ہوں :

(۱) مرا غمز کردند کان بد سخن
بمہر نبی و علی شد کہن

(۲) هر آنکس که دردلش کین علیست
ازوخوارتر درجهان گو که کیست

(۳) منم بندۂ هر دو تا رستخیز
اگر شه کند پیکرم ریز ریز

(۴) من از مہر این هر دو شه نگزرم
اگر تیغ شه بگزرد بر سرم

(۵) نباشد جز از بی پدر دشمنش
که یزدان بآتش بسوزد تنش

(۶) منم بندۂ اهل بیت نبی
ستایندۂ خاک پای وصی

(۷) نه ترسم که دارم ز روشندلی
بدل مہر جان نبی و علی

(۸) چه گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نہی

(۹) که من شهر علمم علیم در است
درست این سخن قول پیغمبر است

(۱۰) گواهی دهم کین سخن راز اوست
تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست

(۱۱) چو باشد تراعقل و تدبیر و رای
بنزد نبی و وصی گیر جای

(۱۲) گرت زین بد آید گناه منست
چنین است و این رسم و راه منست

(۱۳) باین زاده ام هم برین بگزرم
چنان دان که خاک پی حیدرم

(۱۴) ابا دیگران مر مرا کار نیست
بدین در مرا جای گفتار نیست

(۱۵) چو بر تخت شاهی نشاند خدای
نبی و علی را بدیگر سرای

(۱۶) گر از مہر شان من حکایت کنم
چو محمود را صد حمایت کنم

(۱۷) جہان تا بود شہریاران بود
پیامم بر تاجداران بود

(۱۸) که فردوسی طوسی پاک جفت
نه این نامه بر نام محمود گفت

(۱۹) بنام نبی و علی گفته ام
گہرهای معنی بسی سفته ام

سلطان محمود کی ہجو بقول نظامی برباد کر دی گئی تھی - موجودہ ہجو ایک مجعول دستاویز ہے اور فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور نہ فردوسی کے عہد تک اس کی سراغ‌رسی ہو سکتی ہے - اشعار نمبر ۵ - ۸ - ۹ - ۱۰ - ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ - ۱۴ - شاہ نامے کے دیباچے سے منقول ہیں - بیت نمبر ۶ داستان سیاوُش کے خاتمے پر ملتا ہے - نمبر ۱۵ شاہ نامے کے قلمی نسخوں میں مل جاتا ہے اور یوسف زلیخائے فردوسی کے دیباچے میں بھی منقول ہے - ابیات نمبر ۱ و ۱۳ نظامی کے چہار مقالے میں ملتے ہیں -

کیا یہ امر قابل حیرت نہیں کہ فردوسی شاہ نامے میں امیر نصر کے سامنے ، جیسا کہ اوپر دیکھا جا چکا ہے ، صرف دشمن کی بدگوئی

کے بیان پر قناعت کرتا ہے اور کوئی تشریح نہیں کرتا کہ وہ بدگوئی کس نوعیت کی تھی ۔ دیباچۂ قدیم صرف اس بیان پر قناعت کرتا ہے کہ "سخن در مذہب خود گفتہ" لیکن یہ بیان نہیں کرتا کہ وہ مذہب کیا تھا ۔ فردوسی سے ایک اور نصف صدی بعد نظامی دعوے سے کہتا ہے کہ وہ بدگوئی فردوسی کا اعتزال اور شیعیت تھی جو ہجو کے اشعار میں محبت نبی و علی کے نام سے یاد کی گئی ہے ۔ حقیقت میں اگر فردوسی کو اس بدگوئی کی اصلی نوعیت سے اطلاع ہوتی تو وہ امیر نصر کو ضرور اس سے واقف کرتا ۔ اگر کوئی جھوٹی تہمت تھی تو اس کی تردید کرتا ، اگر راست تھی تو عذر اور معافی کا خواستگار ہوتا ۔ اس قدر ضرور ہے کہ وہ بدگوئی خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو فردوسی اس اتہام سے اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا تھا ۔ سلطان کی ناقدردانی کے باوجود وہ سلطان کی توجہ اپنے معاملات میں مبذول کرنے کا ساعی تھا کیونکہ امیر نصر سے وہ ملتمس ہے کہ آپ بھی میری اس محنت کی داد دیں اور سلطان سے سفارش کرکے میرے نہال امید کو بار ور کریں ۔ اگر یہ ناقدری فردوسی کے مذہب کی بنا پر تھی تو فردوسی امیر نصر کے ہاں ہرگز نہ جاتا کیونکہ خود امیر نصر اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا جو فردوسی کے نزدیک مذہب خوارج تھا ۔

اعتزال اور شیعیت کی تہمت ، اگر واقعی فردوسی ایسا تھا ، تو کوئی ایسا گہرا راز نہیں تھا جو امیر نصر سے چھپایا جاتا کیونکہ نصر سے فردوسی کے تعلقات خوش گوار تھے ۔ شاہ نامے میں کئی موقعوں پر فردوسی اس کی مدح سرائی کر رہا ہے اور اسی وجہ سے اس موقعے پر وہ اس کے پاس جاتا ہے ۔ شیعہ یا معتزلی ہونا ان ایام میں کوئی جرم نہیں تھا ، پھر کیا وجہ ہے کہ فردوسی نصر سے چھپاتا اور ہجو میں اس کو بیان کرتا ہے ۔ میری دلیل یہی ہے کہ فردوسی اپنے بدگو اور اس کی بدگوئی کی نوعیت سے ناواقف محض تھا اس لیے

وہ تو نہ جان سکا لیکن فردوسی کے بعد میں آنے والی نسلوں نے ان اشعار کی تاویل کی غرض سے جو امیر نصر کے ذکر میں اس سے قبل مذکور ہو چکے ہیں، اس کو مذہبی رنگ دے دیا کیونکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محض ان اشعار کی تشریح میں تذکرہ نگاروں اور فردوسی پرستوں نے یہ تمام طوفان بے تمیزی اٹھایا ہے، ورنہ ہم‌عصر تاریخیں فردوسی اور مذہبی بنا پر سلطان کی اس کے ساتھ بد سلوکی کا ایک حرف بھی نہیں کہتیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ فردوسی نے ہجو کے ایک سو اشعار میں انیس بیس ابیات اپنی شیعیت کے اظہار میں صرف کیے ہیں۔ اگر مختلف ہجووں سے یہی اشعار فراہم کیے جائیں تو ان کی تعداد ساٹھ تک پہنچے گی، لیکن شاہ نامے کے ساٹھ ہزار ابیات میں اس رنگ کے اشعار کاہم اٹھارہ انیس ملتے ہیں۔ ہجو کے میدان میں فردوسی کا یکایک اس قدر جوشیلا شیعی ہو جانا نہایت غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاہ نامے کے دوران میں وہ اپنے اصلی جذبات کا اظہار سلطان محمود کے تعصب کی بنا پر نہیں کر سکتا تھا تو یہ کوئی سنجیدہ عذر معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ شاہ نامے کے ضمن میں بعض موقعوں پر نہ صرف وہ اپنے مذہبی جذبات کا ذکر کرتا ہے بلکہ ساتھ ہی سلطان کو اس طرح خطاب کرتا ہے کہ گویا وہ خارجی تھا۔

شاہ نامے کا اکثر حصہ طوس میں لکھا گیا ہے جہاں کوئی چیز فردوسی کو اپنے مذہبی جذبات کے اظہار سے مانع نہیں تھی، لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اس حصہٗ شاہ نامہ میں جو موجودہ شاہ نامے کی ڈھائی جلدوں سے زیادہ ہے، صرف ایک موقعے پر اس نے دو بیت منقبت میں لکھے ہیں جو داستان سیاوش کے خاتمے میں ملتے ہیں اور جن کو میں اوپر نقل کر آیا ہوں۔ شاہ نامے کا باقی حصہ، (تقریباً ڈیڑھ جلد) غزنی میں لکھا گیا۔ یہاں پہ دیباچہ اور

داستان نوشزاد اس نے غزنی ہی میں لکھے ہیں ۔ انھی دو مقام پر منقبت کے سلسلے میں اس نے ایسے شعر بھی لکھے ہیں جن پر ہر سنی[1] اعتراض کر سکتا ہے ۔ تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ فردوسی کو غزنین پہنچ کر ، جو اہل تسنن کے زیر اثر تھا ، یہ بات یاد آئی کہ مذہباً میں شیعہ ہوں اور مجھ کو اپنے مذہب کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے ، اور وہ بھی اس طریقے پر کہ جس سے دوسرے فرقے کی دل آزاری ہو ۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی تنگ خیالی فردوسی سے ، جس کا اخلاق معیار تمام شعرائے ایران سے بلند ہے ، بعید بلکہ محال ہے ۔

ذیل میں اس قصیدے کا ذکر کیا جاتا ہے جو مجالس المومنین میں قاضی نور اللہ شوستری نے فردوسی سے منسوب کیا ہے ۔ مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں فردوسی کو سب سے اول جگہ دی گئی ہے ۔ قاضی صاحب کا عقیدہ ہے کہ شاہ نامہ فردوسی نے طوس میں بنام نبی و علی لکھا تھا اور سلطان محمود کی خاطر اصحاب ثلاثہ کا ذکر تقیہ کر کے کر دیا ۔ نبی و وصی کے نام پر شاہ نامہ لکھے جانے کا ثبوت قاضی صاحب ہجو کے ان اشعار سے دیتے ہیں :

که فردوسی طوسی پاک جفت
نه این نامه بر نام محمود گفت
بنام نبی و علی گفته ام
گهرهای معنی بسی سفته ام

اب موقع آ گیا ہے کہ میں اس قصیدے کو ہدیۂ ناظرین کروں :

۱ - داستان نوشزاد کے سنیوں کو ناراض کرنے والے دو شعر قلمی نسخہ د ۸۵۵ میں موجود نہیں جیسا کہ میں اس سے قبل اشارہ کر آیا ہوں ۔ (حاشیۂ مصنف)

اگر بری بخم زلف تاب‌دار انگشت
ز زلف خویش برآری بزینهار انگشت
مگر شمارهٔ زلف تو می‌کند شانه
که کرده در خم زلف تو بی‌شمار انگشت
گره کشود ز رگ های جان خسته دلان
چو کرده زلف سیاه تو تار تار انگشت
بحرف قتل من انگشت کش نهادی دوش
سرم فدای تو زین حرف بر مدار انگشت
سزای شهد شهادت شهید عشق بود
چو یار تیغ برآرد دلا برآر انگشت
بی نظاره مشکین هلال تو هر ماه
کشد مه نو ازین نیل‌گون حصار انگشت
به مستی آرزوی پای بوس او کردم
نهاد بر لب چون نوش خود نگار انگشت
دلا چو پیر شدی بگذر از هوا و هوس
ز بهر آرزوی نفس خود برآر انگشت
بگو که بود که شد فتح باب خیبر ازو
که کرد بر در آن قلعه استوار انگشت
که پاره کرد کمند نفاق و رشتهٔ کفر
بگاهواره که زد در دهان مار انگشت
علی عالی اعلی که دست همت او
هزار پی زده در چشم ذوالخمار انگشت
شهی که تا بدو انگشت در ز خیبر کند
برآمد از پی اسلام صد هزار انگشت
شهی که زد بدو انگشت مره را بدو نیم
برای قتل عدو ساخت ذوالفقار انگشت

شہی کہ دلدل او را گہی خرامیدن
بخارہ در شدیش دست و پا چہار انگشت
ز تیغ دست تو جان برد و ز جہان ایمان
ہر آن کہ کرد بدین تو استوار انگشت
ز دست تیغ تو جان بردی از براوردی
پی شہادت دین تو ذوالخمار انگشت
کسی کہ حب تواش نیست تا بروز شمار
بہرزہ گوی بہ تسبیح می‌شمار انگشت
کسی کہ دست بدامان حیدر و آلش
نزد بسا کہ بدندان کند فگار انگشت
شہا تراست مسلّم کرم کہ گاہ رکوع
کند برای تو انگشتری نثار انگشت
کمینہ چاکر و مداح تست فردوسی
ہمیشہ با قلمش گشتہ دستیار انگشت
قبول کردہ غلامی قنبر تو بجان
نہادہ از مژہ بر چشم اشکبار انگشت
بزرگوار خدایا بحق حیدر و آل
در آن نفس کہ رود خلق را ز کار انگشت
موالیان علی را ز روی لطف و کرم
ز ہول روز جزا برقرار دار انگشت
شہا غلام غلام تو ام مرا مگذار
برای فاقہ برآرم بزینہار انگشت[۱]

قاضی صاحب نے فردوسی کی شیعیت کا اس قصیدے سے ثبوت دیا ہے جس میں لطف یہ ہے کہ فردوسی کا تخلص تک موجود ہے۔ معلوم

۱ - از مجالس المومنین ۔

ایسا ہوتا ہے کہ شاہ نامے کی رو سے فردوسی کی شیعیت کی شہادت قاضی صاحب کی نگاہ میں ناکافی تھی اس لیے یہ قصیدہ ۔ چوں کہ میں واقف ہوں قاضی صاحب نے اکثر سنی مشاہیر کو اپنی جماعت میں شامل کر لیا ہے اس لیے مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں فردوسی کے ساتھ بھی وہی سلوک مرعی نہ کیا گیا ہو لیکن میں اس قصیدے کے متعلق چند نکات پیش کرتا ہوں ۔

۱ تمام دنیا تلاش میں ہے کہ فردوسی کا کلام بہ صورت قطعہ و قصیدہ و غزل دستیاب ہو لیکن نو صدیاں گزرنے کے باوجود چند قطعات کے سوا ، جو اکثر قدیم و جدید تذکروں میں ملتے ہیں ، ایک شعر بھی نہیں ملتا ۔ قاضی صاحب نہایت خوش قسمت ہیں کہ ان کو پورا قصیدہ مل گیا ۔ لیکن بد قسمتی سے انھوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں دیا ۔ اس لیے شبہ کرنے کے لیے کافی گنجائش ہے کہ کہیں وہ مجعول نہ ہو ۔

۲ کلام پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قصیدۂ بالا کی زبان فردوسی کے عہد اور کلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ۔ زبان کی یہ روانی ، بندشوں کی چستی ، ترکیبوں کی لمبی نشست ، کنایات و محاورات و اضافات زیادہ تر قاضی صاحب کے عہد میں پائے جاتے ہیں ۔

۳ ردیف جو فارسی شاعری کا اسلوب خصوصی ہے ، انگشت نمائی کر رہی ہے کہ فردوسی کے عہد میں عام طور پر اس کا رواج نہیں تھا اور نہ ایسی سنگلاخ زمینوں میں ، جس میں یہ قصیدہ لکھا گیا ہے ، ان ایام میں قصیدے لکھے جانے کا دستور تھا ۔ دواوین عنصری فرخی اور منو چہری کے تتبع سے یہ نکتہ آسانی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے ۔

۴ تخلص کی موجودگی اس کی حالت کو اور بھی مشتبہ کیے دیتی ہے کیوں کہ شعرا ان ایام میں اپنے تخلص کے استعمال کے

پابندی کے ساتھ عادی نہ تھے ، بالخصوص فردوسی اس بارے میں نہایت بے پروا ہے ۔ شاہ نامے میں دقیقی کے اشعار کے آغاز و اختتام پر دو جگہ اس کا تخلص ملتا ہے ۔ لیکن قدیم نسخوں میں انھی اشعار میں "گوینده" تھا جس کی بجائے متاخرین نے فردوسی بنا دیا ہے ۔

ایک اور مجعول قصیدہ جو فردوسی کی طرف منسوب ہے ، ذیل میں حوالۂ قلم کیا جاتا ہے :

اے دل ار داری هوای جنت‌الماوی بیا
در حریم کبریا بی کینه و کبر و ریا
گر بقای جاودان خواهی ره عقبیٰ گزین
ور سرای خلد خواهی بگذر از دارالفنا
نعمت اسلام عامست و نه خاص از بهر عام
خوان دین گسترده و درداده مردم‌را صلا
جهد کن تا ناسزا هرگز نه گوئی با کسی
ور بگوئی ناسزا یابی جزا روز جزا
عاقل دنیا و دینی آنگه از علم و عمل
سنت احمد بجا آری و فرض کبریا
سنت احمد بود از حب اولاد رسول
زانکه فرض کبریا باشد ز حب مرتضیٰ
بگذرانی پایۂ قدر خود از ایوان عرش
گر بجا آری ز ایمان شرح شرع مصطفیٰ
کی رسد هرگز بسر حکمت عهد الست
تا نخوانی معنی آیات قرآن هل اتیٰ
معنی قرآن کلام الله اگر دانی بحق
از پی فصل ولی الله بر خوان انما
گر هنر از تیغ میجوئی مجو جز ذوالفقار
ور حدیث از جود میگوئی مگو جز لافتیٰ

لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار
مادر شبیر و شبر فاطمه خیرالنسا
پس برین معنی نظیرش در جهان هرگز نبود
گر تو گوئی بود در گیتی کدامین کی کجا؟
رو بتوریت کلیم و بشنو از بی چون که چون
خواند احمد میت و مرتضی را عیلیا
دیدهٔ تحقیق بکشا و ببین عین الیقین
در ولایاتش نشان معجزات انبیا
گر خلیل الله نبود معجز اندر منجنیق
کان زمان آمد درون نار نمرود از هوا
گرشد اندر نار ابراهیم هم خوش درگذشت
از سه فرسنگ آتش مدین علی مرتضی
هم شنودی کز پی فتح سلاسل بوالحسن
رفت اندر منجنیق و شد دران حصن از قضا
گر کلیم حق بمعجز از سر چاه شعیب
برگرفت و باز پشت افکند سنگ آسیا
لام و جیم الف من از حصن حیدر دربکند
مرتضی در بازپشت افکند چل گام از قضا
گر بموسی داد بعد از مدتی دختر شعیب
در زمان دختر به حیدر داد شاه انبیا
داد گرگی پاسخ یعقوب چون پرسید ازو
بهر فرزند عزیز آن یوسف زیبا لقا
نیز با شیرخدا هم گرگ آمد در سخن
از برای گوسفند آن زن پیر وغا
صالح پیغمبر از معجز اگر پیش گروه
یک شتر آورد بیرون از صیل گاه دعا

حیدر از تل حصا آورد بیرون اشتران
یک قطار او داد در قرض نبی فخر رجا
پس بسان موسیٰ و هارون بقرب ومنزلت
ابن‌عم‌خواند اوبه معنی‌او ز خود داماد را
ذوالفقار از بهر دفع کفر حیدر را بداد
هم چنان از بهر دفع سحر موسیٰ را عصا
گرشد اندر دست داؤد نبی آهن چو موم
از برای درع و دفع تیر در روز وغا
پیل آهن نیز حیدر ساخت در حال آوژه
خوردشدهم سنگ خارا درکفش چون توتیا
راستی را گر به ملک اندر سلیمان نبی
مور را دانست دفعاً زد مرغان را ندا
بوالحسن‌مفتی‌مور و مار و ماهی و وزغ
قاضی باز و کبوتر میر نمل و اژدها
گر ز روی معجز مطلق بهر حدی مگر
از دم عیسیٰ مریم مرده یابیدی بقا
جمجمه اندر زمین با آب و ابقا کبرکرد
زنده شد از نطق حیدر بعد چندین سالها
اندرین گردون‌گردان قرص ماه نور بخش
شد دو نیم از معجزات مصطفای مجتبیٰ
از برای طاعت عصرش علی را بازگشت
خسرو سیارگان خورشید در اوج سما
چشم برکنده بریده دست قصاب از دمش
شد درست و بهتر از اول به فرمان خدا
این همه برهان و صد چندین ز روی راستی
گر برای دیگران داری بیاور انما

کہربا گرزانک با قیمت بود اما ولی
نزد عاقل قیمت گوهر ندارد کہربا
گر بدانی نور حیدر ہمچو نور مصطفیٰ
از خداوند جہان آید بجانت مرحبا
چون کنم شرحش چہ گویم چون ہمی نالم زدرد
ہر زمان از درد جان سوز شہید کربلا
برنگردم از رہ حب علی و آل او
از رہ حیدر بگردیدن خطا باشد خطا
ہر کہ برگشت از رہ حب علی و آل او
رفت و ماند او جاودان در محنت و رنج وعنا
دولت جاوید فردوسی طوسی را ببین
گفت مدح خاندان از ہمت آل عبا

میں اس قصیدے کے متعلق کوئی رائے دینا نہیں چاہتا ۔ یہ بالکل روشن ہے کہ اس قصیدے کو فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا[1] ۔ قصہ مختصر ، یہ وہ تمام شہادت ہے جس کی رو سے فردوسی کی شیعیت کا ادعا کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ شہادت زیادہ تر ناقص اور غیر معتبر ہے ۔

۱ ۔ مجلہ 'مہر' کے فردوسی نامے میں ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے ایک مضمون بعنوان ''اشعار متفرقہ فردوسی'' سپرد قلم کیا تھا ۔ اس میں زیر بحث قصیدے کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے :
''در جنگی خطی محفوظ در شہر (گتا) آلمان بنام فردوسی نسبت داده شده ۔ چون از سبک معاصرین فردوسی دور و قطعاً از شعرای متاخر تر است بنقل چند شعر از آن اکتفا می شود :
ای دل ار داری ہوای جنت الماوی بیا...الخ'' (مرتب)

فردوسی کا اعتزال

شاہ نامے کے دیباچے میں حمد باری میں ایک شعر وارد ہوتا ہے -

بہ بینندگان آفریننده را
نہ بینی مرنجان دو بیننده را

اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات پاک کا مشاہدہ باصرہ کے ذریعے سے ممکن نہیں اس لیے اپنی آنکھوں کو اس کے دیدار کی جستجو میں زحمت نہ دے - شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ذات باری کا ادراک حواس کی معرفت نہیں ہو سکتا -

علاوہ اور تفریقی مسائل کے جو اشاعرہ اور معتزلہ میں بحث و جدال کے مورث ہوئے ہیں ، ایک مسئلہ رویت باری ہے - اشاعرہ کا اعتقاد ہے کہ قیامت کے روز خدا کا دیدار بلا کیف ہو گا - وہ اپنے مذہب کی تائید میں یہ آیہ کریمہ پیش کرتے ہیں :

"وجوہ یومئذ ناضرۃ الٰی ربہا ناظرۃ"

معتزلہ جن کا اعتقاد اس کے بالکل برعکس ہے ، اس آیہ کریمہ سے متمسک ہوتے ہیں :

"لا تدرکہ الابصار و ہو یدرک الابصار و ہواللطیف الخبیر"

اس آیت کی دلیل پر یہ معتزلی عقیدہ ہے کہ دنیا و عقبیٰ میں خدا کا دیدار نا ممکن ہے -

شعر بالا کے استدلال پر نظامی عروضی فردوسی کو اہل اعتزال سے مانتا ہے - میرے خیال میں کسی مسلسل نظم سے منفردہ شعر لے کر خاص معنی پہنا دینا اور پھر شاعر پر اعتراض کرنا صریح بے انصافی ہے - بھلا اس شعر سے کون خیال کر سکتا ہے کہ فردوسی رویت کا منکر ہے - شاعر کا صحیح مفہوم دریافت کرنے کی نیت سے ہم کو شعر مذکور اس کے اور اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے تا کہ تسلسل قائم رہے - یعنی اس طرح :

خرد گر سخن بر گزیند همی
ہماں را گزیند کہ بیند همی

بہ بینندگان آفریننده را
نہ بینی مرنجان دو بیننده را

نیابد بدو نیز اندیشہ راه
کہ او برتر از نام و از جایگاه

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ذات باری کے ادراک سے قاصر ہیں کیوں کہ ہمارا تعقل انھی اشیا کے وجود کا قائل ہو سکتا ہے جو حواس کی معرفت اس تک پہنچیں ۔ لیکن ذات باری کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہو سکتا ۔ حواس ایک طرف ، خدا کی ذات تو دائرۂ تخیل کے تصرفات سے بھی بالا ہے ۔

نظامی گنجوی جو اہل تسنن سے ہیں ، فردوسی کی تقلید میں قریب قریب یہی خیال ادا کر رہے ہیں ۔ چناں چہ :

بآن چیزها یابد اندیشہ راه
کہ باشد بدو دیده را دست گاه

خدا را نشاید باندیشہ جست
کہ درتست هرچہ آن زاندیشہ رست

(سکندر نامۂ بحری)

اب فردوسی ایک شعر کی بنا پر جس کا تسلسل توڑ دیا گیا ہے کیوں کر معتزلی مانا جا سکتا ہے ۔ اس قسم کے استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نماز اس لیے نہیں پڑھتا کہ قرآن مجید میں ”لا تقربوا الصلٰوة“ آیا ہے اور ”و انتم سکاریٰ“ کو بالکل چھوڑ جائے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے ہاں یہ ایک مقبولہ خیال رہا ہے ۔ شاہ نامے میں کسی موقعے پر فلاسفہ کی تردید اور بطلان

میں کوشش کرتا ہوا فردوسی قریب قریب یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے :

ایا فلسفہ‌دان بسیار گوی
نپویم براهی که گویی بپوی

ترا هرچه بر چشم بر بگزرد
بہ‌گنجد همی در دلت با خرد

چنان‌دان کہ یزدان نیکی دهش ..
جز آنست و زین بر مگردان منش

سخن هیچ بہتر ز توحید نیست
بنا گفتن و گفتن ایزد یکی‌است

فلاسفہ کے نزدیک وہی باتیں قابل قبول ہیں جو حواس کی معرفت ادراک میں آ سکیں اور جن کو عقل باور کر لے ۔ فردوسی کا یہ مقصد ہے کہ ذات باری کے ادراک کے لیے یہ طریقہ غلط ہے ، وہ سرحد ادراک اور اندیشے سے بالا ہے ۔

فردوسی کا تسنن

فردوسی کے تسنن کے متعلق اگرچہ کسی تاریخ میں کوئی شہادت نہیں اور نہ سنیوں میں کوئی ایسی روایت ہے ۔ شاہ نامے میں کچھ ایسا ذخیرہ ملتا ہے جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ سنت جماعت تھا ۔ سب سے بیشتر دیباچے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

اگر دل نہ خواهی کہ باشد نژند
نہ خواهی کہ دایم بوی مستمند

چو خواهی کہ یابی ز هر بد رها
سر اندر نیاری بدام بلا

بوی در دو گیتی ز بد رستگار
نکو نام باشی بر کردگار
به گفتار پیغمبرت راه جوی
دل از تیرگیها بدین آب شوی
ترا دین و دانش رهاند درست
ره رستگاری ببایدت جست
چه گفت آن خداوند تنزیل و وحی
خداوند امر و خداوند نہی
که خورشید[۱] بعد از رسولان مہ
نتابید بر کس چو بوبکر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار
بیاراست گیتی چو باد بہار
پس از هر دو آن بود عثمان گزین
خداوند شرم و خداوند دین
چہارم علی بود جفت بتول
که او را بخوبی ستاید رسول
که من شہر علمم علیم در است
درست این سخن قول پیغمبر است
گواهی دهم کین سخن راز اوست
توگوئی دو گوشم بر آواز اوست
بدان باش کوگفت و زین بر مگرد
چو گفتار و رایت نیاید بدرد
علی را چنین گفت و دیگر همین
کز ایشان قوی شد بهر گونه دین

---

۱ - تلمیح ہے اس حدیث کی طرف ''ماطلعت الشمس ولا غربت علی احد بعد النبیین افضل من ابی بکر۔'' (حاشیہ مصنف)

نبی آفتاب و صحابہ چو ماہ
بہم نسبتی یک دگر راست راہ

ان کے علاوہ یہ اشعار شاہ نامے میں اور ملتے ہیں :

(۱) بدو آفرین کو جہان آفرید
ابا آشکارا نہان آفرید
خداوند دارندۂ ہست و نیست
ہمہ چیز جفت‌است‌و ایزدیکیست
بہ پیغمبرش بر کنم آفرین
بیارانش بر ہر یکی ہم چنین

(ساختن سیاوش کنگ دژ ، صفحہ ۱۲۰ ، جلد اول ، شاہ نامہ)

(۲) وزو بر روان محمدؐ درود
بیارانش بر ہر یکی بر فزود
ہمہ پاک بودلد و پرہیز گار
سخن ہای شان برگزشت از شمار

(خاتمۂ داستان اردشیر بابکان ـ نیایش آفرینندۂ بی لیاز و مدح و ثنای سلطان محمود ، صفحہ ۹۳ ، جلد سوم ، ۱۲۷۵ھ)

(۳) وزو بر روان محمدؐ درود
بیارانش بر ہر یکی بر فزود

(خاتمہ داستان سکندر ، گلۂ فردوسی از آسمان و نیایش خدای را صفحہ ۷۸ ، جلد سوم ، ۱۲۷۵ ھ)

(۴) سپاس خداوند دانا کنم
زبان و خرد را توانا کنم
توانا خداوند بر ہرچہ ہست
خداوند بالا و دارای پست

فرستم درود فرستاده اش
گزین گزینان آزاده اش
محمدؐ کہ بر بودنیها سراوست
خداوند را از همہ روی دوست
کہ ایزد ز یارانش خوشنود باش
روان بداندیش پر دود باد

(خاتمہ شاہ نامہ قلمی)

یہ اشعار ایسے نسخوں میں ملتے ہیں جن میں اختتام شاہ نامہ کی تاریخ سنہ ۴۰۰ ہجری کی بجائے ۳۸۹ ہجری دی گئی ہے۔ چنان چہ :

اگر سال نیز آرزوت آمدست
نہم سال هشتاد با سی صد است
مہ بہمن و آسمان روز بود
کہ کاکم بدین نامہ پیروز بود

(۵) حضرت عمر خلیفہ ثانی کے حق میں داستان یزدجرد کے آغاز میں یہ اشعار آتے ہیں :

چنان بد کجا سرفراز عرب
کہ از تیغ او روز گشتی چو شب
عمر آن کہ بد مومنان را امیر
ستودہ ورا۱ خالق بی نظیر

یہ تمام وہ مواد ہے جس کی رو سے فردوسی کو سنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شاہ نامے میں دونوں رنگ کے اشعار کی موجودگی کے کیا معنی ؟ اس عقدہ کا حل یوں ہی ممکن ہے کہ

۱ - اس آیت کی طرف اشارہ ہے :
''یا ایہا النبی حسبک اللہ و من اتبعک من المومنین''۔
'من اتبعک' سے مراد فاروق اعظم ہیں۔ (حاشیہ مصنف)

یا تو فردوسی زیدیہ فرقے کا متبع تھا[1] یا اس کو اہل تسنن و تشیع نے اپنے اپنے مذہب کا رکن بنانے کی کوشش کی ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مذہبیت کے اشعار شاہ نامے میں ملنے لگے ہیں۔ لیکن سنیوں کی فارسی ادبیات سے عام بے اعتنائی خصوصاً اپنے ہم مذہبوں کے خلاف ان کا تعصب، ادنیٰ ادنیٰ اختلافات پر الحاد اور کفر و زندقہ کا الزام اور تہمت تراشنے کا ان کا عام انداز بھلا ان کو کب اجازت دیتا کہ مطعون فردوسی کی تصنیف میں وہ اپنے رنگ کے اشعار اضافہ کرنے کی زحمت گوارا کرتے۔ نظامی عروضی نے جب کہ اس کو شیعہ اور معتزلی بنانے پر قناعت کی تھی، آشوب تورانی نے تو اسے گبر اور مزدکی بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا[2]

۱ - محمد محیط طباطبائی اپنے مضمون ''عقیدۂ دینی فردوسی'' میں اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ:

''پس نتیجۂ مختصر کلیہ ابیاتی کہ در شاہنامہ و یوسف و زلیخا آوردہ، اینست کہ فردوسی مرد مسلمانی است پیرو محمد و علی۔ یاران و صحابۂ رسول را پاک و متقی می داند و خلفای راشدین را می‌ستاید۔ مہر آل علی را موجب نجات و بغض ایشان را سبب زیان آخرت می شناسد۔ و علی را از ہمہ صحابۂ پیمبر برتر می‌داند۔ ولی باوجود این از توصیف ابوبکر و عمر و عثمان بخلافت روگردان نیست و از راہ ہای اسلامی آن راہی را کہ مربوط بہ نبی و علی است می پسندد و با راہ ہای دیگر کاری ندارد۔ کسیکہ با عقاید فرق اسلامی و مقالات ایشان آگاہی داشتہ باشد میداند چنین مسلمانی باید قطعاً از فرقہ زیدیہ از دستہ شیعہ باشد چہ اجتماع این مطالب با یکدیگر و اعتقاد بہمۂ این اجزا جزو اصول عقاید زیدیان است۔'' (مرتب)

۲ - لیکن باخبر سنیوں میں وہ ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ چناں چہ امام احمد الغزالی، انوری، نظامی گنجوی، صاحب راحت الصدور، صاحب مرزبان نامہ، صاحب جہان گشا، شیخ سعدی اور مولانا جامی اس کے مداح ہیں۔ (حاشیۂ مصنف)

ہر قسم کی سب و شتم فردوسی کے حق میں استعمال کرتا ہے۔
میں چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں ۔ شاعر فردوسی کو خطاب کر رہا ہے :

نہ سنی نہ شیعی نہ مغ نی جہود
نہ ترسا ، نہ دانم ترا دین چہ بود
ز ہر مذہبی فارغ از ملحدی
ز دیری برون خارج از مسجدی
بہر مذہب و پیشہ جنگ و جدل
ز بحث فگندن بہر دین خلل
بہر علت از مرتدی و بدی
نجس بودی اکنون نجس‌تر شدی
ازین پیشتر سعدی بی بدل
بحق تو گویا سرود این مثل
کہ گر چاہ نصرانیان نیست پاک
بشوئی اگر مردہ گبری چہ باک [1]

ازین پیش شاید سخن‌گوی طوس
بہ دوغ سخن آبش از جوی طوس
مغ مغ نسب گبر آتش پرست
بہ بیعت بہر موبدی دادہ دست
کہن موبدی وجہ نان مجوس
بہر دخمہ مرثیہ خوان مجوس

---

۱ ۔ سعدی :

اگرچہ چاہ نصرانی نہ پاک است
جہود مردہ می‌شویم چہ باک است
(حاشیۂ مصنف)

دلش گبر و جان گبر و گبری زبان
ز گبران بگبری زبان قصہ خوان
دل و دین بفرمان کسریٰ کیش
ز اسلام بیگانہ با کفر خویش
بہ انکارش از کعبہ گم کردہ راہ
تراشیدہ آتش کدہ قبلہ گاہ
ز زردشت احکام دینش ستد
پرستندۂ هیر چون هیر بد
زپاژند و ژندش بدل وعظ و پند
مفسر بہ تفسیر استا و ژند
بوخشوری مژدک و زردهشت
درون دامن اعتقادش بہشت
مرادش ز زردشت پیر مغان
براهیم پیغمبر اندر جہان
شب و روز نازندہ بر تخت عاج
بہ زرینہ کفش و بہ زرینہ تاج
نویسندۂ داستان مغان
بزرگی دہ خاندان مغان

شاہ نامے کے متعلق بھی آشوب کی رائے قابل ملاحظہ ہے -
کہا ہے :

نہ دانم جہان را چہ دنگی گرفت
کہ ملک سخن مست تنگی گرفت
ز فہم سخن دور بر رفتگان
بہ تقلید هم سربسر رفتگان
نہ پی بردہ بر قبح گفتار تو
نہ بی لطفی و لطف اشعار تو

ز ترکیب یک چند لفظ دری
ترا موجدی دیده در شاعری
به نظمت نه خوانده حروف زیاد
ز شه نامه ات قصها کرده یاد
همه غافل از جا و بیجای حرف
لقب داده ات اوستاد شگرف
مگر شعر فهمان همه مرده‌اند
و یا رخت فهم بیان برده‌اند
کز ایران و توران و هندوستان
یکی برنیامد ز دانشوران
که بر ستم گفتار تو راه یاب
کند آگهت از خطا و صواب
بالفاظ سست و زخت و کرخت
چه لازم شدت نظم شهنامه گفت
ابا و ابر رستها بیژنا
حکیم این الفهای زاید چرا[1]
ضیافت گر نکته سنجان دهر
نه فرموده تمیز پازهر و زِهر
چنین بد خورش خوانی آراستن
چنین بزم بی لطف پیراستن
بطعن دقیقی ز گفتار تو
پسندم شد این بیت ز اشعار تو

۱ - مجھے شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ الف زائدہ پر آشوب کا اعتراض قدیم زبان سے بے خبری پر مبنی ہے - اسی طرح اس کی باقی ہذیان سرائی کا قیاس کیا جا سکتا ہے - (حاشیہ مصنف)

"دہان گر بہ ماند ز خوردن تہی
ازان بہ کہ ناساز خوانی نہی[1]"
(صولت فاروق)

(حاشیہ مصنف)

۱ - ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ہم وطنوں میں بوجہ تصنیف شاہ نامہ ، جس کو ادب و شعر کی خدمت کے بجائے صریحاً مجوسیوں کی خدمت کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا ، بدنام تھا اور اسی بنا پر شیخ ابوالقاسم طوسی نے (جن کو متاخرین نے ابوالقاسم خرقانی لکھا ہے) اس کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا وغیرہ - یہ قصہ اگرچہ دیباچہ بایسنغرخانی کی وجہ سے ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے لیکن اس کا کوئی قدیمی ماخذ معلوم نہ تھا - شیخ عطار کا 'اسرار نامہ' ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں اس روایت کا سب سے قدیم ماخذ مانا جا سکتا ہے جس میں یہ تمام قصہ درج ہے - میں یہاں بعینہ اس کو حوالہ قلم کرتا ہوں :

شنودم من کہ فردوسی طوسی
کہ کرد او در حکایت بی فسوسی
بہ بست و پنج سال از نوک خامہ
بسر می‌برد بیت شاہ نامہ
بآخر چون رسیدش دم بآخر
ابوالقاسم کہ بُد شیخ الاکابر
اگرچہ بود پیر پر نیاز او
نہ کرد از راہ دین بر وی نماز او
چنین گفت او کہ فردوسی بسی گفت
ہمہ در حق گبری نا کسی گفت
بہ مدح گبرگان عمری بسر برد
چو وقت مردن آمد بی‌خبر مرد
مرا درکار او برگ ریا نیست
نمازم بر چنین شاعر روا نیست

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

یا بقول قاضی نوراللہ شوستری فردوسی نے تقیہ کرکے سنی رنگ کے اشعار بخوف سلطان محمود داخل کر دیے ہیں ۔ لیکن اگر واقعہ ایسا ہوتا تو شاہ نامے میں صرف سنی رنگ کے اشعار پائے

(بقیۂ حاشیہ مصنف)

چو فردوسی مسکین را ببردند
بزیر خاک تاریکش سپردند
در آن شب شیخ او را دید درخواب
کہ پیش شیخ آمد دیدہ پر آب
زمرد رنگ تاجی سبز بر سر
لباسی سبز تر از سبزہ در بر
بہ پیش شیخ بنشست و چنین گفت
کہ ای جان تو با نور یقین جفت
نہ کردی آن نماز از بی‌نیازی
کہ بی ننگ آمدت زین بی‌نمازی
خدای ما جہانی پر فرشتہ
ہمہ از فیض روحانی سرشتہ
فرستاد اینت لطف کارسازی
کہ تا گردند بر جانم نمازی
خطم دادند بر فردوس اعلیٰ
کہ فردوسی بفردوس است اولیٰ
خطاب آمد کہ ای فردوسی پیر
اگر راندت ز پیش آن طوسی پیر
پذیرفتم منت تا خوش بہ خفتی
بدان یک بیت توحیدم کہ گفتی
مشو نومید از فضل الٰہی
مدہ بر فضل ما بخلی گواہی
یقین میدان چو ہستی مرد اسرار
کہ عاصی اندک است و مرد بسیار

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

جاتے نہ شیعہ رنگ کے ، کیوں کہ ایسی صورت میں فردوسی اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا - پھر جب کہ ایک طرف فردوسی سلطان کے تعصب کے خوف سے اپنے آپ کو سنی لباس

(بقیہ حاشیہ مصنف)

گر آمرزد بیک رہ خلق را پاک
نیامرزیده باشد جز کف خاک
خداوندا تو میدانی کہ عطار
ہمہ توحید می‌گوید در اشعار
ز نور تو مساعی می‌نماید
چو فردوسی فقاعی می کشاید
چو فردوسی بہ‌بخشش رایگان تو
بہ فضل خود بہ فردوسش رسان تو
بہ فردوسی کہ علیینش خوانند
مقام صدق و نورانیش خوانند

لطف اس وقت تھا جب یہ بیان آشوب کی نگاہ سے گزرتا -

اسلامی حلقوں میں فردوسی کی بدنامی کے اسباب زیادہ تر شاہ نامے کے اس حصے سے تعلق رکھتے ہیں جو ایران پر استیلاے عرب کا مذکور کرتا ہے - مصنف پر الزام یہ ہے کہ اس نے عربوں کے ساتھ نہایت بے انصافی کی ہے - ان کے جس قدر کارنامے ہیں ان کو دانستہ ترک کر دیا یا نہایت خفیف کر کے دکھایا - اس طرح نہ صرف وہ عربوں کے قومی وقار کو پامال کرنے کا مجرم ہے بلکہ اسلامی جذبات کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے - بعض اصول کا جو اسلام سے تعلق رکھتے ہیں ، اگر بے ادبی سے نہیں تو ادب سے بھی ذکر نہیں کرتا - مذہبی حلقوں میں اس پر بہت لعن طعن ہوئی - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فردوسی کو ہمارے شیعہ بھائیوں نے اپنے طبقے میں نہایت محترم جگہ دی اور قاضی نوراللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں پہلی کرسی ہمارے شاعر ہی کو دی -

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

میں ظاہر کر رہا ہے دوسری طرف شیعہ رنگ میں ایسے اشعار لکھ رہا ہے جس سے سلطان کو خارجی بنایا جا رہا ہے ، تو

(بقیہ حاشیہ مصنف)

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی جس کی نازک اورکمزور بنیاد پر الزامات کے عالی شان قصر تعمیر کر لیے گئے ۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایران مرحوم کی عظمت اور شکوہ کی افسانہ خوانی کر رہا تھا ۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی جس کا تمام نقطۂ نظر ایرانی بلکہ یوں سمجھو ساسانی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جب قومی فخر و مباہات کا صنم کدہ تعمیر ہو رہا ہو تو دوسری قوموں کے کارناموں کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی ، جس حالت میں کہ رقابت کی آگ بھی زیر خاکستر ہو ۔ فردوسی صنادید عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا ، ساسانی ایران اور کیانی ایران کی مرثیہ خوانی کر رہا تھا ؛ وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا ۔ علاوہ بریں اس معاملے میں اس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی ۔ جو واقعات اس کو پہلوی ذرائع سے ملے ، وہی اس نے نقل کر دیے ۔ ان ذرائع میں ، جو زیادہ تر افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخی نقطۂ نظر سے چنداں وقیع بھی نہیں ، اگر جذبات عرب کے آبگینے پر سنگ اندازی کی گئی تو ان کی ترجمانی میں فردوسی ، جس نے کہ ہم جان سکتے ہیں ، ان کی شدت کے معتدل کرنے میں ایک حد تک جدوجہد بھی کی ہے ، عقلاً و انصافاً چنداں ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ بحیثیت مورخ اس کا یہی فرض تھا کہ جو واقعات اس کی روایات نے اس تک پہنچائے ہیں عیناً ذکر کر دے[۱] ۔ مثلاً ایک معاند اسلام رستم ، سپہ سالار یزد جرد نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

(حاشیہ مرتب :

۱ ۔ ایران کے مشہور فاضل ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے مجلہ 'مہر' کے فردوسی نمبر میں ایک مضمون ''شعوبیت فردوسی'' کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا جس میں انھوں نے فردوسی کو ایک متعصب ایرانی قوم پرست ثابت کرنے پر پورا زور قلم صرف کر دیا تھا ۔ اس مضمون کے چند

اس متضاد عنصر کی موجودگی میں تقیہ کا نظریہ ایک لمحے کے لیے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ یا وہ سلطان سے خائف تھا یا نہیں تھا ۔ اگر خائف تھا تو وہ سلطان کو خارجی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا

(بقیہ حاشیہ مصنف)

جب کہ وہ قادسیہ کی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا ، اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر عربوں کے لیے کہا ۔ شعر :

زیان کسان از پی سود خویش
بجویند و دین اندر ارند پیش

(شاہ نامہ ، جلد چہارم ، صفحہ ۱۲۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

''شاعر بزرگ ما سخت تر و شدید تر از ہر یک از شعوبیان وطن پرست ایرانی ہر جا کہ برسوم و زندگی عرب میرسد از ذم و تکذیب آن خودداری نمی‌کند و آنان را بالفاظ و القابی چون ''سوسمار خوار'' و ''مارخوار'' و ''اہرمن چہرہ'' و ''بی بہرہ از دانایی و شرم'' و ''نواغ سار'' و ''بی ہوش'' و''بی دانش''و''بی نام و ننگ'' و گرسنہ شکم'' و ''ہیونان مست‌گسستہ مہار'' و مانند اینہا می خواند و از ذکر مثالب آنہا کوتاہی نمی نماید ۔''

''عقاید اعراب را بطرزی عجیب در پردہ تمسخر میکند و از بہشت و حور و کافور و مشک و ماء معین و امثال آن کہ رویاً ہای اعراب گرسنۂ بیابان‌گرد را تشکیل میداد سخن می‌راند و با لحنی شیرین کہ آہنگ استہزا بخوبی از آن ہویداست از زبان سعد وقاص یزدگرد را کہ در بہشت ہای زمینی می چمید و با حوران دلربای مرز ایران قدح بر میگرفت بہ بہشت و حور دعوت میکند ۔ ۔ ۔ ۔ ''

''این شعوبی فداکار وطن پرست تا آنجا بر تازیان خشمگین

(بقیہ آیندہ صفحے پر)

تھا اور اگر خائف نہیں تھا تو اس کو اپنے مذہب کے چھپانے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ سنی عقیدے کے اشعار کہنے کی حاجت۔

(بقیہ حاشیۂ مصنف)

اور فردوسی نے اس قول کو نقل کر دیا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ فردوسی کیوں مستوجب تشنیع ٹھہرایا جائے۔ لیکن کچھ اسی قسم کے وجوہ تھے جن کی بنا پر فردوسی بدنام ہو گیا۔ ہمیں تعجب اس امر پر آتا ہے کہ عرب کی مذمت کے اشعار:

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجای رسید است کار

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

(بقیہ حاشیۂ مرتب:

است کہ تمام بدبختی‌های اجتماعی و سیاسی ایران بعد از اسلام را از ایشان می بیند و عقیده دارد کہ چون پای آن برهنگان باین مرز دراز شد دیگر سعی و عمل بی معنی گردید و داد و بخشش مقهور بیداد گری و زفتی شد و تخت و تاج و زرینہ و کفش و گوهر و افسر و رخشان درفش همہ از میان رفت۔ پیمان و راستی رخت بر بست و کژی و کاستی بر کرسی نشست۔"

مجلہ مہر کا فردوسی نامہ ۱۳۱۳ ہجری شمسی میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے ۱۳۲۴ شمسی میں اپنی کتاب "حماسہ سرایی در ایران" شائع کی۔ اس میں انھوں نے اپنے سابق خیالات کی تردید کی اور سجدۂ سہو ادا کیا۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴ سے ایک اقتباس یہاں پیش کرنا بے موقع نہ ہو گا۔ فرماتے ہیں:

"گروهی هنوز پس از تحقیقاتی کہ تا کنون بهمت دانشمندان اروپائی در باب شاهنامہ و مآخذ آن صورت گرفتہ است چنین می پندارند کہ فردوسی در نظم شاهنامہ و داستانهای قدیم بمیل و نظر شخصی کار میکرده و پهلوانانی را کہ در شاهنامہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

غزنین میں فردوسی کے تعلقات سلطان کے ساتھ جب تک کہ دشمن کی بدگوئی کا واقعہ پیش نہ آیا نہایت خوش گوار تھے۔ شاہ نامے کی بعض داستانوں سے ثابت ہے کہ وہ سلطان کے سامنے

(بقیہ حاشیہ مصنف)

که تاج کیان را کنند آرزو
تفو باد بر چرخ گردان تفو

سب کو یاد رہے لیکن وہ اشعار جو ان کے جواب میں ایرانی سفیر کو خطاب کرکے حضرت سعد بن وقاص کی زبان سے فردوسی نے ادا کیے، کبھی شرمندۂ التفات نہ ہوئے۔ چنانچہ :

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

(بقیہ حاشیہ مرتب)

می بینیم با تمام خصایص خود بوجود میاورده و ''ساخته'' است و بهمین دلیل هنگام بحث در باب عقاید و دین فردوسی بسیاری از مسائل را که مربوط بقهرمانان داستانهاست بفردوسی نسبت میدهند و گاه دشنامهای را که مثلاً یک ایرانی زردشتی بیک تن از اعراب مسلمان گفته است از زبان فردوسی می پندارند۔

من نیز خود در آغاز کار بچنین خطائی دوچار بودم و بعضی از آثار این خطا در مقاله ای که به‌عنوان ''شعوبیت‌فردوسی'' در فردوسی نامهٔ مهر نگاشته ام آشکار است ۔ ولی تحقیقات اخیر و مطالعهٔ دقیق در شاهنامه و اطلاع از مسائلی تازه بر من ثابت کرده است که فردوسی در عین علاقه بایران و در عین دشمنی با عناصر غیر ایرانی در شاهنامه خود مردی بیطرف و بی غرض است و هر دشنامی که بعرب یا ترک و یونانی و کیش‌های زردشتی و اسلام و یهود و نصرانی در شاهنامهٔ او می بینم منقول از یک متن یا زبان حال گوینده ایست که بدان سخنان تفوه کرده بود لاغیر ۔''

(مرتب)

سنائی گئی تھیں ۔ داستان ہفت خوان اسفند یار سلطان کے سامنے پڑھی گئی ہے ۔ اس داستان کے خاتمے پر فردوسی کہتا ہے :

اگر شاہ پیروز بپسندد این
نہادیم بر چرخ گردندہ زین

(بقیہ حاشیہ مصنف)

شما را بہ مردانگی نیست کار
ہمہ چون‌زنان رنگ و بوی و نگار
ہنر تان بدیباست پیراستن
دگر نقش بام و در آراستن

آخر وہ زمانہ آیا جب خدائے سخن کی حمایت میں رد عمل شروع ہوا ۔ ایک روز امام احمد الغزالی نے اثنائے وعظ میں بر سر منبر حاضرین کو خطاب کرکے کہا کہ اے مسلمانو ! تم کو وعظ و نصیحت کرتے مجھ کو چالیس سال کا زمانہ گزرا ۔ اس دراز زمانے میں جو پند و نصیحت میں نے تم کو کی ہے ، فردوسی نے اس کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے ۔ وہ شعر یہ ہے :

ز روز گزر کردن اندیشہ کن
پرستیدن دادگر پیشہ کن

(شاہ نامہ ، جلد اول ، صفحہ ۱۲۸)

اگر اس پر عمل کرو تو پھر تم کو کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ۔

(بحوالہ مرزبان نامہ ، باب سوم ، داستان سہ رہزن انباز با بکریگز ، صفحہ ۷۸ ، ۷۷ ، طبع یورپ)

جب فردوسی کے اشعار منبر پر پڑھے جانے لگے ہیں ، تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ غیر مذہبی حلقوں میں شاہ نامہ اس عہد میں بہت کچھ مقبول ہو چکا ہوگا ۔

(حاشیہ مصنف)

داستان اردشیر کی تمہید میں ایک شعر یوں آتا ہے :

ز ساسان و بابک چہ داری خبر
بخوان هین بشه بر همه سر بسر

(از شاہ نامہٗ قلمی ، ۵۲ے ھ)

اور سلطان سے فردوسی کی اس قدر بے تکلفی ہو گئی تھی کہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے بعض اوقات سلطان کو وعظ و نصیحت بھی کی ہے ۔ چناں چہ داستان اردشیر میں شاعر اردشیر کے انتظامات ریاست و قواعد ملکی بیان کرکے سلطان کو الفاظ ذیل میں خطاب کرتا ہے :

ز دانا سخن بشنو ای شهریار
جهان را بدین گونه آباد دار
چو خواهی که آزاد باشی ز رنج
بی آزار و آگنده بیرنج گنج
بی‌آزاری زیردستان گزین
که یابی ز هر کس بداد آفرین

داستان مہبود وزیر نوشیرواں کے اختتام پر شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو نصیحت کرنے میں مصروف ہے ۔ کہتا ہے :

اگر داد گر باشی ای شهریار
نه مانی و نامت بود یادگار
تن خویش را شاه بیداد گر
جز از گور و نفرین نیارد بسر
اگر پیشه دارد دلت راستی
چنان دان که گیتی تو آراستی
چو خواهی ستایش پس مرگ تو
خرد باید ای نامور برگ تو
چنان کز پس شاه نوشیروان
به گفتار من داد او شد جوان

نوشیرواں جب اپنے ملک دو چار حصوں میں منقسم کرکے رعایا و مزارعین کی بہبود کے لیے فرامین جاری کرتا ہے ، اس ذکر میں بوڑھا شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو خطاب کرکے کہتا ہے :

اگر دادگر باشی ای شہریار
به گیتی بمانی یکی یادگار
که جاوید هر کس کند آفرین
برآن شاه کاباد دارد زمین

فردوسی اس پائے کا شخص ہے کہ اپنے مذہب کو چھپانا یا تقیہ کرنا اس کے لیے ایک ہتک کہا جا سکتا ہے ۔ دوسرے سلطان محمود کے دربار میں ہر ملت و مذہب کے شخص کا گزر تھا ۔ جو بادشاہ ہندوؤں کو اپنے لشکر میں اعلیٰ عہدے دے سکتا تھا کیا وہ ایک شیعہ شاعر کی موجودگی کا اپنے دربار میں روادار نہ ہوتا ۔ بالخصوص جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسی سلطان نے ایک اور شیعہ شاعر یعنی غضائری رازی کو ہیل بار انعام بخشی کی ہے ۔ غضائری کہتا ہے :

امیدوارم کین بار صد هزار تمام
به من بیارد برپای فیل برفیتال[1]

ابو ریحان البیرونی ایک اور شیعہ فاضل کو ، خود محمود نے خواہش کرکے اپنے دربار میں بلایا ہے ۔ محمود کی دو لڑکیاں شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس اور عنصرالمعالی کیکاؤس کو بیاہی گئی ہیں ۔ اس لیے فردوسی کے متعلق تقیہ کا خیال میرے نزدیک بالکل غیرموزوں ہے ۔ شاہ نامے میں ایسے اشعار کی موجودگی جو سلطان محمود پر خارجی ہونے کی تعریض کرتے ہیں صاف ظاہر کر رہی ہے کہ فردوسی

---

۱ ۔ مسعود سعد سلمان کہتا ہے ۔ مصرع :
''چون لطف شاه ماضی بر شاعر غضاری'' (حاشیہ مصنف)

ان اشعار کا قائل نہیں ہو سکتا ـ کیوں کہ فردوسی حقیقت میں اگر ایسا دیوانہ ہوتا تو محمود کے دربار سے اپنی جان سلامت نہیں لے جا سکتا تھا ـ اس لیے میں اس عقیدے پر آیا ہوں کہ شاہ نامے میں شیعہ عقیدے کے اشعار کا ادخال کسی غیر فردوسی کا کام ہے اور خود فردوسی سے ان کو کوئی تعلق نہیں ـ جن حضرات نے اس کے نام پر قصائد شائع کیے ہیں کیا چند اور اشعار نہیں لکھے جا سکتے تھے ـ

لیکن فردوسی کے مذہب کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہم کو کسی اور جدید شہادت کی ضرورت ہے جو بالکل غیر مشتبہ اور معتبر ہو ـ یہ شہادت بھی شاہ نامے میں موجود ہے اور میں اس کا ذیل میں ذکر کرتا ہوں :

۱ ـ اشاعرہ اور معتزلہ میں مسئلہ جبر و قدر سنگ تفرقہ انداز رہا ہے ـ متکلمین کے نزدیک جبر ضد عدل ہے ـ اس سے ان کی مراد بندوں کی مقہوریت اور مغلوبیت ہے جس کے اثر میں ان کے تمام افعال مہد سے لے کر لحد تک گویا اقوال و افعال خدا ہیں جو ان کے ہاتھ اور زبان سے ان کے اختیار اور ارادے کے بغیر جاری کرتا ہے یعنی اعمال خیر و شر میں جو کچھ اس زندگی میں ہم سے سرزد ہونے والا ہے خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کیا جا سکتا ـ

سعدی :

به بدبختی و نیک بختی قلم
به گردید و ما هم چنین درشکم

نظامی :

اگر نیکم و گر بدم در سرشت
قضای تو این نقش بر من نوشت

اور خواجہ حافظ :

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو درطریق ادب کوش و گو گناہ منست

دیگر :

در کوی نیک نامی ما را گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یہ اشاعرہ کا مسئلۂ جبر ہے ۔ صاحب گلشن راز کہتے ہیں :

ہر آن کس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود کو مانند گبر است

یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ :

القدریتہ مجوس ہذہ الامتہ

لیکن معتزلہ کا مختار یہ ہے کہ عباد اپنے اقوال و افعال میں فاعل و موجد ہیں ۔ جبریہ کہتے ہیں کہ عباد فاعل بالایجاب ہیں نہ فاعل بالارادہ و اختیار ۔ خلاصہ یہ کہ معتزلہ انسانوں کو اپنے افعال کا مختار مانتے ہیں اور یہی ان کا مسئلۂ قدر ہے اور اسی بنا پر ان کو قدریہ کہا جاتا ہے ۔ اب شیعوں اور معتزلیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اکثر مسائل ان میں عام ہیں چناں چہ اس مسئلے میں دونوں فرقے متفق ہیں ۔ محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں :

”و بندگان در فعل خود مختار اند و خود فاعل فعل خود اند خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت و اکثر امامیہ و معتزلہ باین قول قائل اند و اشاعرہ کہ اکثر اہل سنت اند می گویند ، فاعل ہمہ افعال بندہ خداست و بندگان مطلق در آنہا اختیار ندارند بلکہ خدا بردست ایشان افعال را جاری می کند و در آن فعل مجبوراند ۔ اما بعضی از ایشان می گویند کہ ارادۂ بندہ مقارن آن فعل می باشد اما آن ارادہ مطلقاً دخلی در وجود آن فعل ندارد و این

مذہب باطل است ۔" (از حق الیقین)

یہ شیعہ نقطۂ نظر ہے ۔ ان مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی معتزلہ کے برخلاف اشاعرہ کا ہم زبان ہے ۔ تقدیر کے بارے میں فردوسی کا اعتقاد ہے کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ ازل کے دن ہمارے مقدرات میں لکھ دیا ہے انھی احکام کے مطابق ہم چلتے ہیں ۔ وہ احکام ایسے طاقت ور اور زبردست ہیں کہ نہ ہم ان پر چون و چرا کر سکتے ہیں اور نہ ان سے احتراز کر سکتے ہیں ۔ ان میں رد و بدل ، تغیر و تبدل کے لیے سرمو گنجائش نہیں ۔ اس کے حکم کے بغیر سانس تک نہیں لیا جا سکتا اور نہ پائے مور حرکت کر سکتا ۔ تقدیر الٰہی کے آگے تدبیر انسانی کوئی چیز نہیں ۔ نوشتۂ تقدیر اسٹ اور اٹل ہے ۔ حیلہ اور پرہیز سے کوئی تبدیلی اس میں پیدا نہیں کی جا سکتی گویا انسان تقدیر خداوندی کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے ۔ وہ جس طرف اور جس طرح چاہتی ہے اس کو توڑتی اور موڑتی ہے ۔

امثال از شاہ نامہ

(۱) بدانگہ کہ لوح آفرید و قلم
بزد بر ہمہ بودنیہا رقم

(صفحہ ۴۳ ، جلد اول)

(۲) کہ ہر چیز کو آفرید از بوش
بد آنسو کشد بندگان را روش

(صفحہ ۳۲ ، جلد چہارم ۔ فرستادن خاقان دختر خود را با نامہ و خواستہ ہمراہ مہران نزد نوشیروان)

یعنی جیسا ازل میں تقدیر کر دیا گیا ہے اسی کے مطابق ہم چلتے ہیں ۔

(۳) اگر زو مرا رنج خواہد نزود
قلم رفت و این بودنی کار بود

یعنی جس بات پر قلم جاری ہو گیا ہے وہ ہو کر رہے گی ۔

(صفحہ ۱۳۰ ، جلد اول ، بخواب دیدن پیران سیاوش را و پیدا شدن خسرو)

(۴) همه بندگانیم و او پادشاست
خرد بر توانائی او گواست
نفس جز به فرمان او نگزرد
پی مور بی او زمین نسپرد

(صفحہ ۲۱ ، جلد چہارم ، باسخ نامۂ خاقان از نوشیروان)

اس کی قدرت ایسی زبردست ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر سانس تک نہیں لیا جا سکتا اور رینگنے والی چیونٹی کا پاؤں تک نہیں ہل سکتا ۔

(۵) ازوگر نوشته بمن بر بدی است
نه گردد به پرهیزکان ایزدی است

(جلد اول ، صفحہ ۱۳۰)

اگر ہماری تقدیر میں کوئی برائی لکھی ہے تو ہمارے پرہیز سے وہ بدی ٹل نہیں سکتی ۔

(۶) که کار خدائی نه کاریست خورد
قضای نبشته نشاید سترد

نوشتۂ تقدیر مٹایا نہیں جا سکتا ۔

(۷) نبشته بسر بر دگرگونه بود
ز فرمان نکاهد نخواهد فزود
قضا چون ز گردون فروهشت پر
همه زیرکان کور گردند و کر

(صفحہ ۲۴ ، جلد اول ، پرسیدن سہراب نام و نشان سرداران از هجیر)

مولانا روم اس شعر کو یا اس کے عربی ماخذ کو مدنظر رکھ کر کہتے ہیں :

چون قضا بیرون کند از چرخ سر
عاقلان گردند جملہ کور و کر

یعنی خدا کے حکم میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہو سکتی - جب قضائے الٰہی آتی ہے تو دانشمند اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں -

(۸) نوشتہ چنین بود ما در بوش
برسم بوش اندر آید روش
(صفحہ ۲۱ ، جلد اول)

(۹) چو یزدان چنین راند الدر بوش
برین گونہ پیش آوریدم روش
(صفحہ ۲۵ ، جلد اول)

(۱۰) چنین گفت دستان کہ دانا یکیست
بہ تقدیر او راہ تدبیر نیست
(صفحہ ۶۴ ، جلد اول)

یعنی تقدیر کے آگے ہماری تدبیر بے کار ہے -

(۱۱) بہ کوشیم و از کوشش ماچہ سود
کز آغاز بود آنچہ بایست بود
(صفحہ ۱۵۲ ، جلد اول)

ہماری کوشش بے کار ہے - جو ہونا ہے ازل کے دن مقرر ہو چکا ہے -

(۱۲) نوشتہ چنین بود و بود آنچہ بود
ز فرمان نکاھد نخواھد فزود
(صفحہ ۹۶ ، جلد چہارم ، کشتہ شدن بہرام چوبین بدست قلون)

(۱۳) ز بخش جہان آفرین بیش و کم
نہ گردد بہ خیرہ مپیمای دم

خدا نے جو ہمارا نصیبہ مقرر کر دیا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی ۔ اس پر گفتگو کرنا فضول ہے ۔ گویا ان معاملات میں فردوسی بحث کرنا بھی پسند نہیں کرتا ۔ چنانچہ ایک اور مقام پر کہتا ہے :

نوشتہ چنین بود و بود آنچہ بود
سخن بر سخن چند خواهی فزود

(صفحہ ۹۷ ، جلد چہارم ، رسیدن خسرو و بہرام چوبین بہم دیگر و گفتگو با یک دگر کردن)

میں بخوف طوالت صرف انھی امثال پر قناعت کرتا ہوں ورنہ شاہ نامے میں یہ جذبات و خیالات قدم قدم پر ملتے ہیں ۔

(۲) معتزلہ جو اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم سے خیر و صلاح کے سوا اور کچھ صادر نہیں ہو سکتا اور بحکم عقل رعایت مصالح عباد اس پر واجب ہے پس خدا کی نسبت یہ اعتقاد کرنا کہ وہ اپنے بندوں کو اعمال خیر و شر پر اول تو مجبور کرے اور بعد میں ان کی پاداش میں سزا دے قبیح معلوم ہوتا ہے ۔

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں :

"حق تعالیٰ حکیم است و کار های او منوط بہ حکمت و مصلحت است و فعل عبث و بی فائدہ ازو صادر نمی شود ۔ او را در افعال اغراض صحیح و حکمت های عظیمہ ملحوظ می باشد و لیکن غرض در افعال الہی عاید بہ بندگان می گردد ۔ غرض او تحصیل نفع از برای خود نیست و برین قول اتفاق کردہ اند امامیہ و معتزلہ و حکما و اشاعرہ گفتہ اند کہ افعال خدا معلل باغراض نیست و آیات و احادیث بسیار بر بطلان این قول دلالت می کند ۔

و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ آن چہ اصلح باشد از

برائی خلق و نظام عالم ، فعلش بر حق تعالیٰ واجب است " (از حق الیقین)

بر خلاف اس کے اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ بروے عقل خدا پر کچھ واجب نہیں ، وہ قادر مطلق اور فعال مایشا ہے ، وہ جو چاہے اور جب چاہے کرے ، کسی کو اس پر قدرت نہیں ۔ وہ چاہے تو چھوٹی چیز کو وسیع کر دے اور وسیع کو سمیٹ دے ، جس کو چاہے بلند کرے اور جس کو چاہے پست کرے ، ذلیل کو عزت دے اور عزت والے کو ذلیل کر دے ، جس کو چاہے راہ راست پر لائے اور جس کو چاہے سیدھی راہ سے الگ کر دے ، جسے جو چاہے دے اور جو چاہے چھین لے ۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا کرے گا وہی عدل اور انصاف ہے ۔ نفع و ضرر اس کے ہاتھ میں ہے ۔ اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا ۔ اللہ عز و جل پر ثواب یا عذاب یا بندے کے ساتھ لطف یا اس کے ساتھ وہ کرنا جو اس کے حق میں بہتر ہو کچھ واجب نہیں ۔ مالک علی الاطلاق ہے ۔ جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے اس پر کوئی جور و حیف لازم نہیں آتا ۔

اس روشنی میں دیکھتے ہوئے فردوسی اشاعرہ کا ہم زبان ہے ۔ اس کے نزدیک ذات باری قادر علی الاطلاق ہے ۔ نہ شیعہ اصحاب کی طرح اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ عز و جل پر اصلح واجب ہے اور نہ وہ یہ مانتا ہے کہ نیکیوں کا خالق اللہ ہے اور برائیوں کا خالق انسان ہے ان میں سے ہر مسئلے میں وہ فرقۂ سنت والجماعت کا پیرو ہے ۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :

(۱) یکی را برآری بہ چرخ بلند
یکی را کنی خوار و زار و نژند
یکی را ز ماہ اندر آری بچاہ
یکی را ز چاہ اندر آری بماہ

یکی را برآری و شاهی دهی
یکی را بدریا به ماهی دهی
نه با آنت مہرو نه با اینت کین
که به دان توئی ای جہان آفرین
جہان را بلندی و پستی توئی
نه دانم چه ٔ هر چه هستی توئی
(صفحه ۳۹۱ ، جلد دوم ـ گرفتار شدن خاقان و شکست خوردن تورانیان)

(۲) غم و انده و رنج و تیمار و درد
زنیک و ز بد هر چه آید به مرد
کمی و فزونی و نیک اختری
بلندی و پستی و کند آوری
زداد تو بینم همی هر چه هست
دگر کس ندارد درین کار دست

یعنی غم و رنج ، درد و تکلیف ، نیکی بدی ، کمی بیشی ، نیک بختی اور بد بختی ، بلندی اور پستی جو انسان پر عارض ہوتی ہیں ، سب خدا کی طرف سے ہیں اور انصاف ہیں ۔

(صفحه ۷۰ ، جلد اول ، کشتن رستم ارژنگ دیو را)

(۳) توانائی او را ست ما بنده ایم
هم از راستی هاش گوینده ایم
یکی را دهد تاج و تخت بلند
یکی را کند خوار و زار و نژند
نه با آلش مہرو نه با اینش کین
نه میداند این جز جہان آفرین
(صفحه ۳۹ ، جلد چہارم)

(۴) وزویست پیروزی وهم شکست
به نیک و به بد زان بود کام دست
زمان و مکان و جهان آفرید
پی مور و کوه گران آفرید
خرد داد و جان و تن زورمند
بزرگی و دیهیم و تخت بلند
رهائی نیابد سر از بند او
یکی را بود فر و اورند او
یکی را دگر شور بختی بود
نیازو غم و درد و سختی بود
ز رخشنده خورشید تا تیره خاک
همه داد بینم ز یزدان پاک
(صفحه ۱۶۲ ، جلد اول)

(۵) بدونیک زان دان کش انباز نیست
به کاریش فرجام و آغاز نیست
(صفحه ۳۰ ، جلد چهارم)

(٦) ازویست نیک وبدوهست و نیست
همه بندگانیم ایزد یکیست
(صفحه ۳۹ ، جلد اول)

دیگر

تو مگزار هرگز ره ایزدی
که نیکی ازویست و هم زو بدی

دیگر

بزرگی و خوردی ز پیمان اوست
همه بودنی زیر فرمان اوست

دیگر

جز او را مخوان کردگار بلند

کزو شادمانی و زو مستمند

دیگر

بد و نیک بیند ز یزدان پاک

و زو دارد اندر جہان ترس و باک

(صفحہ ۱۰۳ ، جلد چہارم)

(۳) فرقۂ اہل تسنن و تشیع میں ہاروت و ماروت کے متعلق بھی اختلاف ہے ۔ ان فرشتوں کی بابت وہ قصہ جس سے ان کا بشری حیثیت اختیار کرکے دنیا میں آنا ، لوگوں کو جادو کی تعلیم دینا ، زہرہ پر عاشق ہونا اور اس کو اسم اعظم سکھانا مفہوم ہوتا ہے اور جو اہل سنت و جماعت میں مقبول ہے اہل تشیع نہیں مانتے ۔ فردوسی کے ہاں شاہ نامے میں ایک سے زیادہ موقعوں پر ہاروت کا ذکر آتا ہے اور اس طریقے سے آتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قصے پر اس کا اعتقاد تھا ۔ کیوں کہ ان کی جادوگری کا وہ ذکر کرتا ہے ۔ چناں چہ :

گہی میگسارید و گہ چنگ ساخت

تو گفتی کہ ہاروت نیرنگ ساخت [۱]

(تمہید داستان بیژن)

شیعہ ہونے کی حیثیت سے فردوسی اس تلمیح کا استعمال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہاروت و ماروت کا قصہ شیعوں میں غیر مسلم ہے ۔

---

۱ - ۸۵۵ھ کے ایک مخطوطے میں پچھلا مصرعہ یوں ہے ۔

تو گفتی کہ ہاروت با او نواخت

(حاشیۂ مصنف)

(۴) سکندر کے حالات جو فردوسی نے شاہ نامے میں دیے ہیں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر سنی ماخذ سے لیے گئے ہیں کیونکہ اہم واقعات میں اس کے بیانات ثعالبی اور نظامی کے بیانات سے مطابق ہیں جبکہ تاریخ طبری اور روضۃالصفا سے موافق نہیں۔

(۵) اسی طرح صوفیوں کے متعلق اس کی رائے اہل سنت والجماعت کے مطابق ہے ۔ وہ ان کا ذکر موقر الفاظ میں کرتا ہے ۔ سکندر کی داستان میں کہتا ہے :

غریبان که بر شهر ما بگزرند
چمانند‌ه پای و لبان نا چرند
دل از عیب صافی و صوفی بنام
به درویشی اندر شده شاد کام
ز خواهندگان نام شان بر کنید
شمار اندر آغاز دفتر کنید

(صفحہ ۶۰ ، جلد سوم)

واضح رہے کہ شیعہ جماعت میں ابتدا ہی سے اہل تصوف کی نسبت معاندانہ رائے قائم کر لی گئی تھی حتیٰ کہ ان کو مجوسی اور نصاریٰ کے ساتھ تشبیہہ دی جاتی تھی ۔

جناب امام علی نقی کا قول ہے :

"الصوفیه کلهم مخالفونا و طریقهم مغایرة لطریقنا و انهم نصاریٰ اومجوس هذه الامة ۔"

فرقۂ صوفی یہ سب ہمارے مخالف ہیں ان کا طریقہ ہمارے طریقے سے جدا ہے اور وہ اس امت کے نصاریٰ اور مجوس ہیں ۔

امام جعفر صادق کی رائے بھی ملاحظہ ہو :

"قال رجل للصادق خرج فی هذالزمان قوم یقال لهم الصوفیه فما تقول فیهم فقال انهم اعداءنا فمن مال الیهم فهو منهم و یحشر معهم و سیکون اقوام یدعون حبنا و یمیلون الیهم و یتشبهون بهم و

یلقبون انفسهم بلقبهم و یاولون اقوالهم الا فمن مال الیهم فلیس منا و انا منہ براء و من انکرهم و رد علیهم کان کمن جاهد الکفار مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ"

ترجمہ : امام صادق سے ایک شخص نے پوچھا کہ اس زمانے میں ایک فرقہ مبعوث ہوا ہے جس کو صوفی کہا جاتا ہے ، آپ کی ان کی بابت کیا رائے ہے ۔ آپ نے جواب دیا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں ؛ جو ان کی طرف مائل ہوا وہ انھی میں سے ہے اور انھی کے ساتھ محشور ہوگا۔ اور عنقریب ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہماری محبت کا دعویٰ کریں گے اور ان کی طرف میل کریں گے ، ان کے ساتھ مشابہت کریں گے ، ان کے القابات سے اپنے آپ کو ملقب کریں گے اور ان کے اقوال کی تاویلیں کریں گے ۔ لیکن جو شخص ان کا مائل ہوا وہ ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتا اور ہم اس سے بری ہیں اور جس نے ان سے انکار کیا اور ان کی تردید کی اس کا رتبہ ایسا ہے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو کر کفار کے ساتھ جہاد کیا ۔

ابوالہاشم کوفی صوفی کے متعلق جو بقول جامی سب سے پیشتر صوفی کے لفظ کو رواج دیتے ہیں ، بروایت امام حسن عسکری امام جعفر الصادق کی رائے حسب ذیل ہے :

"قال سئل الصادق عن حال ابی الهاشم الکوفی الصوفی
قال انہ فاسدالعقیدة جداً ۔"

امام جعفر الصادق سے ابوالہاشم کوفی صوفی کے متعلق استفسار کیا گیا آپ نے فرمایا کہ وہ سخت بد عقیدہ ہے ۔

ان محترم ہستیوں کے اس قسم کے صریح اعلانات کے برخلاف شیعہ حلقوں میں تصوف کے لیے کسی سرسبزی کی امید رکھنا ناممکن تھا ۔ ایک مدت دراز تک یہی حالت قائم رہی لیکن پچھلے چند قرون میں سیاسی اسباب کے زیر اثر متصوفین کے لیے احترام کے آثار صفویہ

کے زمانے سے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ اس خاندان کے اجداد شیخ صدر الدین موسیٰ اور شیخ صفی الدین اسحاق بن جبرئیل خود صوفی تھے۔

(٦) یہاں ایک اور غیر متعلقہ امر کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب ہوں گے۔ کتاب یوسف و زلیخا بقول جمہور فردوسی کی تصنیف ہے۔ اگرچہ اس اعتقاد میں میں شریک نہیں، تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ فردوسی کی تصنیف ہے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے ذرائع وہی روایات ہیں جو اصحاب سنت و جماعت کے ہاں شائع ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کا مصنف سنی ہے نہ شیعہ۔ میں ان متعدد دلائل سے جو مصنف کتاب کے سنی ہونے کے نظریے کے حق میں پیش کی جا سکتی ہیں بخوف طوالت صرف ایک روایت پر اکتفا کرتا ہوں۔

مثلاً وہ موقع جہاں زلیخا عشرت‌خانہ تیار کروا کر حضرت یوسف کو بلواتی ہے اور طالب وصال ہوتی ہے، اس موقعے پر حضرت یوسف کے مائل ہونے اور ازار بند کی ساتوں گرہیں کھولنے وغیرہ کے جو تفصیلی حالات اس تصنیف میں ملتے ہیں ان کا ناقل کوئی شیعہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ تمام روایت اہل تشیع کے ہاں مردود ہے۔ جہاں شیعہ اصحاب نے سنیوں کے خلاف اور اعتراض کیے ہیں وہاں یہ اعتراض بھی کیا ہے۔ میں ان کی تصنیف "تبصرۃالعوام" سے ذیل کی عبارت نقل کرتا ہوں جہاں مولف نے سنیوں کے بیانات دے کر ان پر جرح کی ہے۔

> "روایت کنند کہ چون زلیخا قصد یوسف کرد و درخانہ بہ بست یوسف نیز قصد فجور کرد۔ ناگاہ یعقوب را دید انگشت بدندان گرفتہ و گفت یا یوسف ترا از انبیا می شمارند و تو قصد فجور میکنی۔ و ازسفیان بن عتبہ روایت کنند کہ گفت یوسف قصد فجور کرد با زلیخا و در

موضعے نشست کہ مردان با زنان بہ قصد مجامعت نشینند و بہ روایت دیگر چنان در قدم های زن نشست کہ مرد در حال مجامعت با حلال خود نشیند ۔ این حکایت جملہ (سنیان) در تفاسیر خود یاد کردہ اند و این فواحش از تاویلات آیات قرآن استنباط کنند و بر انبیا ورسل بندند و گویند مذہب اہل سنت و جماعت است و ہر کہ خلاف این گوید او را رافضی و مبتدع گویند ۔"

میں یہاں مثنوی یوسف و زلیخا کے وہ اشعار بھی درج کرتا ہوں :

چنان آتشی بر دلش برفروخت
کہ مر شرم اورا سراسر بسوخت
چو دل بر ہوا جستنش میل کرد
سہ بند از گرہ زود بکشاد مرد
پس از کنج خانہ یکی دست دید
کشیدہ بہ کردار سیم سپید
ہمی برکف او نوشتہ عیان
کہ بیند ہمی کردگار جہان
فروخواند یوسف و لیکن ہواش
نہ کرد از گرہ بر کشادن جداش
دو بند دگر بر کشاد از میان
بہ فرمان اہریمن تیرہ جان
ز کنجی دگر باز دستی بدید
ہنر مند یوسف درو بنگرید
بران بد نوشتہ کہ این کار زشت
امیدت بہ برد ز حور بہشت
فرو خواند یوسف ولیکن نداشت
بدان کز ہوا گام بیرون گزاشت

دل از کام جستن همی بر نتافت
سوی بند دیگر کشادن شتافت
بہ بخشود بر وی جہان آفرین
فرستاد در وقت روح الامین
بہ صورت چو یعقوب پرہیزگار
ہم از کنج خانہ شدش آشکار
بہ یوسف چنین گفت کای گنج ہوش
ز دوزخ تن خویشتن دار گوش
ز یعقوب آزردہ بشنو سخن
بدینسان گنہ زرد رویم مکن
بدین گر شود چہرہ زردم ز تو
بہ یزدان کہ بیزار گردم ز تو
چو یوسف رخ و چشم یعقوب دید
بدانسان سخن گفتن از وی شنید
چنان لرزش افتاد در دست و پای
کہ در تن نماندش دل رہنمای[1]

(صفحہ ۱۲۷ ، دارالطباعہ خاصہ مدرسہ مبارکہ دارالفنون طہران)

۱ - اس کے علاوہ جب ہم امام احمد غزالی طوسی (برادر امام غزالی) ، شیخ عطار اور نظامی گنجوی کے بیانات پر غور کرتے ہیں تو قرائن سے فردوسی کا اہل تسنن سے تعلق رکھنے کا استدلال صاف مترشح ہے - یہ تینوں بزرگ اہل سنت و الجماعت کے ہاں اپنے اپنے مرکز میں بہ لحاظ شہرت و تقدس نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں - ان میں سے ہر ایک کا مذہب کے ساتھ بہت قریبی تعلق رہا ہے - فردوسی کا ذکر یہ بزرگوار عزت کے ساتھ کرتے ہیں جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ فردوسی ان کے نزدیک اہل تسنن سے تھا - امام احمد غزالی کا بیان اور عطار کا حوالہ اسی مضمون کے ایک حاشیہ میں گزر چکا ہے - نظامی کے بیانات 'اقبال نامہ' ، 'شرف نامہ' اور 'بہرام نامہ' میں ملتے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفے پر)

ان بعض مسائل میں جو اتفاقیہ شاہ نامے میں آ گئے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی بالکل اہل تسنن کے ہمرائے ہے اس لیے ان کے اثرات میں میں اس کو سنی عقیدے کا ماننا ہوں ۔

فردوسی کے اور عقائد کے متعلق جو شہادت شاہ نامے سے مل سکتی ہے ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے ۔ اگرچہ شاہنامہ بہ لحاظِ مضمون ایسی کتاب نہیں جس میں مصنف کو اپنے عقائد کے اظہار کا زیادہ موقعہ ملتا تاہم اس قدر یقینی ہے کہ اس کے معتقدات وہی تھے جو عام مسلمانوں کے ہوتے ہیں ۔ وہ دین اسلام کو سب سے بہتر مذہب مانتا ہے اور نور ایمان سے اپنے دل کو روشن کرنا چاہتا ہے :

به گیتی درآن کوش چون بگزری
سرانجام اسلام با خود بری
دل از نور ایمان گر آگندهٔ
ترا خامشی به که گویندهٔ

خدائے پاک کی ستایش اور اس کی توحید کی اشاعت فردوسی کا پہلا اور آخری سبق ہے جس کی تکرار سے وہ کبھی تھکتا نظر نہیں آتا ۔ توحیدی مضامین کی کثرت سے اگر کسی نے شاہ نامے کو قرآن العجم کہا ہے تو غیر موزوں نہیں کہا ۔ فارسی میں مشکل سے کوئی ایسی کتاب ہو گی جس میں توحیدی مضامین اس کثرت سے پائے جائیں ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

ہیں ۔ 'راحۃ الصدور'، 'جہان کشائے جوینی' اور 'مرزبان نامہ' وغیرہ میں شاہ نامے کے اشعار کا کثرت کے ساتھ نقل کیا جانا اسی عقیدے کے تحت کا ایک اور قرینہ ہے ۔

(حاشیۂ مصنف)

جب کہ فلاسفہ کی زبان میں فردوسی خدا کو روح اور عقل کا خالق مانتا ہے جس نے مکان اور زمان خلق کیے ، جو خورشید ، قمر ، زحل اور زہرہ کا مالک ہے ۔ آسمانوں اور جہانوں کا خدا ہے ۔ خاک ، آب ، آتش اور ہوا جس کی ہستی پر شہادت دیتے ہیں ۔ فقہا کے ہم زبان بن کر گویا ہے کہ اس نے ایک کن سے دونوں جہانوں کی تخلیق کی اور لوح و قلم پیدا کیے ۔ وہ بے نیاز ، دانا اور توانا ، بے سہیم و شریک اور بے مانند ہے ۔ اس کے احکام میں چون و چرا نہیں کی جا سکتی ۔ ہم اس کے مجبور بندے ہیں ۔ ہمارا فرض اس کی عبادت اور اس کے احکام کی تعمیل ہے ۔ خدا کی جناب میں اظہارِ عجز و نیاز کی تاکید وہ بار بار کرتا ہے ۔ فردوسی کہتا ہے :

وہ قادر مطلق ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ۔ نہ اس کے یار ہے ، نہ جفت ہے ۔ وہ کبھی بہار پیدا کرتا ہے کبھی خزاں ۔ درخت انگور کو وہی میوہ دیتا ہے ، کبھی اس کو بھاری کرتا ہے کبھی زرد رو ۔ تمام عناصر اس کی ہستی کی گواہی دیتے ہیں ۔ دستور گنجور ، تاج و تخت ، کمی بیشی ، خوش اقبالی اور بد اقبالی سے بے نیاز ہے ۔ خشکی میں پیل اور آب میں نہنگ اس کے فرمان سے سرتابی نہیں کر سکتے ۔ بدی اور نیکی سب اس کی طرف سے ہے ۔ شمس و قمر اور زحل کا مصور ، تخت و تاج کو رونق بخشنے والا ، خاشاک سے شیر و پیل تک اور پائے مور کی گرد سے رود نیل تک اگر زمین سے آسمان تک پہنچ جائیں سب اسی کے حکم میں ہیں ۔ نہ اس کے حکم کی انتہا ہے اور نہ اس کی بادشاہی کو زوال ہے ۔ دنیا کی چھوٹی بڑی چیز کا صانع ، خاشاک سے عرش تک ہر ایک چیز اس کی ہستی کی شہادت دیتی ہے ۔ چیونٹی سے شیر کو سزا دلواتا ہے ۔ پیل زبردست ہر پشہ کو غالب کراتا ہے ۔ وہ کیوان و بہرام و خورشید کا خداوند جس سے ہم کو امید و بیم ہے ، اگرچہ میں اپنی جان تفکر میں گھلا دوں تب بھی میں اس کی حمد سرائی سے عہدہ

برآ نہیں ہو سکتا ۔ جیسا اس کا حق ستائش ہے ویسے کوئی اس کی ثنا نہیں کر سکتا اس لیے ہم کو اس کی بندگی کے لیے کمر بستہ رہنا چاہیے ۔ اس کی ہستی کا معترف ہوکر اس کی عبادت میں مصروف ہونا، اس کے فرمانوں کی تعمیل کرنا اور اس کی بخشش کی امید رکھ کر گناہ سے خائف رہنا چاہیے اور اس کے پیغمبر پر درود بھیجنا چاہیے ۔

یہاں شاہ نامے سے بعض امثال پر قناعت کی جاتی ہے :

(۱) بنام خداوند خورشید و ماه
که دل را بنامش خرد داد راه
خداوند هستی و هم راستی
نه خواهد ز تو کژی و کاستی
خداولد کیوان و بهرام و شید
کزویست امید و بیم و نوید
ستودن من او را ندانم همی
از اندیشه جان برفشانم همی
ازویست پیدا زمان و مکان
پی مور بر هستی او نشان
ز گردنده خورشید تا تیره خاک
همان باد و آب آتش تابناک
به هستی یزدان گواهی دهند
روان ترا آشنائی دهند
سوی آفرینندهٔ بی‌نیاز
بباید که باشی همی در گداز
ز دستور و گنجور وز تاج و تخت
ز کمی و بیشی و ناکام و بخت
هم او بی نیاز است ما بنده ایم
به فرمان و رایش سر افگنده ایم

چوجان وخرد بی گمان کرده است
سپهر و ستاره برآورده است
جز او را مدان کردگار بلند
کزو شادمانی وزو مستمند
شب و روز وگردان سپهر آفرید
خور وخواب وتندی و مهرآفرید

(۲) نگارندهٔ هور و کیوان و ماه
فروزندهٔ فرد دیهیم و گاه
ز خاشاک ناچیز تا شیر و پیل
زگرد پی پیل تا رود نیل
گر از خاک بر چرخ گردان روند
همه زیر فرمان یزدان روند
نه فرمان او را کرانه پدید
نه زو پادشاهی بخواهد برید

(۳) خداوندکیوان و خورشید و ماه
کزویست پیروزی و دستگاه
خداوند هستی و هم راستی
ازویست بیشی و هم کاستی
خداوند بخشنده و کار ساز
خداوند روزی ده بی‌نیاز
خداوند گیتی خداوند مهر
خداوند ناهید و گردان سپهر
جز از رای و فرمان او راه نیست
خور و ماه ازین دانش آگاه نیست

(صفحه ۱۳۸ ، جلد اول)

(۴) ستودن نداند کس او را چو هست
میان بندگی را ببایدت بست
بدین آلت و رای وجان و روان
ستود آفریننده را کی توان
بهستیش باید که خستو شوی
ز گفتار بی کار یکسو شوی
پرستنده باشی و جوینده راه
به فرمان ها ژرف کردن نگاه

فردوسی سرائے جاودانی کا معتقد ہے اور کئی موقعوں پر اس کی نسبت تلمیح کرتا ہے:

چنین گفت ما را سخن رہنمای
جز اینست جاوید ما را سرای دیگر
همین بگزرد بر تو ایام تو
سرای جز این باشد آرام تو دیگر
ز رفتن مگر بهتر آیدت جای
چو آرام گیری بدیگر سرای

سرائے جاودانی سرائے فانی سے بہتر ہے:

رها کن ز چنگ این سپنجی سرای
که پرمایه تر زین ترا هست جای

اس دنیا میں ہمارے نیک اعمال کا ثمرہ اس دنیا میں ملے گا:

تو تا زندهٔ سوی نیکی گرای
مگر کام یابی بدیگر سرای

(صفحہ ۸۴، جلد سوم)

جب ہم اس دنیا سے رحلت کریں گے، خدا نے ہمارا سروکار

ہوگا ، ہمارے اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے :

چو رفتی سروکار با ایزدست
اگر نیک باشدت کار ار بد است

دیگر

که رفتن آمد بدیگر سرای
مگر نزد یزدان به آیدت جای

وہ بہشت اور دوزخ کا معتقد ہے :

اگر ماند ایدر ز تو نام زشت
نیابی عفا الله خرم بہشت

دیگر

نه چون من شده خوار و برگشته بخت
به دوزخ فرستاده ناکام رخت

رضوان مالک بہشت کا نام ان ابیات میں آتا ہے :

بنان بہشتند گوئی درست
به گلنار شان روی رضوان بشست

(صفحہ ٦٥)

توبہ پر بھی اعتقاد کامل رکھتا ہے :

تو ای پیر فرتوت بی توبه مرد
در توبه بگزین و راه خرد

ابلیس کا ذکر بھی کرتا ہے :

چنان بد که ابلیس روزی پگاه
یکی انجمن کرد پنہان ز شاه

خانۂ کعبہ کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ خان حرم وہی ہے جس کو خدا بیت الحرام کہتا ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بانی ہیں ۔ خدا نے اس کو بیت اللہ کہا ہے ۔ یہ اس مقام پاک کی حرمت کی بنا پر ہے ورنہ خدا کو

کھانے پینے یا آرام کرنے کے لیے کسی گھر کی ضرورت نہیں ۔ جب سے یہ پرستش گاہ تعمیر ہوئی ہے اس میں ہمیشہ خدا کی عبادت ہوتی آئی ہے :

خداوند خواندیش بیت الحرام
بدو شد ترا راہِ یزدان تمام
ز پاکی ورا خانۂ خویش خواند
نیایش کنان را بدان پیش خواند
خدای جہان را نیاید نیاز
بجای و خور و کام و آرام و ناز
پرستش گہی بود تا بود جای
بدو اندرون یاد کرد خدای

شاہ نامے میں بیت المقدس کا بھی ذکر آتا ہے :

بہ خشکی رسیدند سر جنگ جوی
بہ بیت المقدس نہادند روی

(صفحہ ۲۲ ، جلد اول ، سنہ ۱۲۶۲ ہجری)

ظلمات میں سکندر کے جانے کے وقت وہ مسلمانی تکبیر اللہ اکبر کا بھی ذکر کرتا ہے :

چو لشکر سوی آبِ حیوان گزشت
خروش آمد اللہ اکبر ز دشت

خضر علیہ السلام کو سکندر کا رہبر مانتا ہے :

ورا اندرین خضر بد رای زن
سر نامداران آن انجمن
سکندر بیامد بہ فرمان اوی
دل و جان سپردہ بہ پیمان اوی

ظلمات سے واپسی کے وقت حضرت اسرافیل سے سکندر کی ملاقات کا بھی ذکر کرتا ہے :

سرافیل را دید صوری بدست
برافراختہ سر ز جای نشست
پر از باد لب دیدگان پر ز نم
کہ فرمان کی آید ز یزدان کہ دم
چو بر کوہ روی سکندر بدید
چو رعد خروشان فغان بر کشید
کہ ای بندۂ آز چندین مکوش
کہ روزی بگوش آیدت یک خروش
تو چندین مرنج از پی تاج و تخت
بہ رفتن بیارا و بر بند رخت

کید ہندی کے خواب میں وہ دین اسلام کی ترویج کی پیشین گوئی بیان کرتا ہے :

چہارم ز تازی یکی دین پاک
سر ہوش مندان بر آرد بخاک

اور اسی خواب میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی بشارت دیتا ہے :

ازین پس بیاید یکی نامدار
ز دشت سواران نیزہ گزار
یکی مرد پاکیزۂ نیک خوی
بدو دین یزدان شود چار سوی

وہ عبرانی تاریخ کو ایرانی تاریخ کے ساتھ ، جیسا کہ بعض خوش عقیدہ مؤرخین کا دستور ہے ، تطبیق دینے کی کوشش بھی کرتا ہے ۔ اس عقیدے کا کہ حضرت ابراہیم اور زردشت ایک ہی شخص ہیں وہ بھی معتقد ہے :

ہم دین زردشت پیشین بدوی
براہیم پیغمبر راست گوی

لیکن حضرت ابراہیم کے تقدم کا حضرت موسیٰ پر لحاظ نہ رکھ‌کر منوچہر کی زبان سے حضرت موسیٰ کی آمد کی بشارت نوذر کو ان ابیات میں دیتا ہے :

نگر تا نتابی ز دین خدای
که دین خدا آورد پاک رای
کنون نو شود در جهان داوری
که موسیٰ بیاید به پیغمبری
پدید آید آن کس ز خاور زمین
نگر تا نباشی ابا او بکین
بد و بگرو آن دین یزدان بود
نگه کن ز سر تا چه پیمان بود

تاریخ طبری میں منوچہر کو حضرت موسیٰ کا ہم عصر مانا گیا ہے۔

حضرت اسماعیل کا ذکر بھی ادب کے ساتھ کیا ہے :

نبیره سماعیل پیغمبر است
که پور براهیم نیک اختر است

فردوسی کا بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ پیغمبر تھے اور مصلوب نہیں ہوئے۔ چناں‌چہ ان کی نسبت کہتا ہے :

پدر دیر او بود و مادر کنشت
نگهبان و جوینده خوب و زشت
چو روشن روان گشت و دانش پذیر
سخن گوی و داننده و یادگیر
به پیغمبری نیز هنگام یافت
به برنای از زیرکی کام یافت
تو گوئی که فرزند یزدان بد او
بدان دار برگشته خندان بد او

بہ خندہ برین بر خرد مند مرد
تو گر باهشی گرد یزدان بگرد
کہ هست او بفرزند و زن بی نیاز
بہ نزدیک او آشکار است راز

نوشیروان اپنی وفات کے قریب ایک خواب دیکھتا ہے جس کی تعبیر رسول مقبول کی ولادت اور ترویج دین اسلام ہے ۔ یہ بھی فردوسی کے مسلہنی معتقدات کی دلیل ہے ۔ نوشیروان کے خواب کی روایت اکثر تاریخوں میں ملتی ہے مگر فردوسی نے کسی قدر ضمنی اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ تاریخ طبری میں عبدالمسیح آ کر سطیح سے اس خواب کی تعبیر دریافت کرتا ہے ۔ شاہ نامے میں گزارندۂ خواب حکیم بوزرجمہر ہے[1] ۔

جنگ میں دشمنوں کے خلاف مارے جانے کے وقت متوفی کے لیے فردوسی کا بھی اعتقاد ہے کہ شہید ہوتا ہے :

کسی کو بود کشتہ زین رزمگاہ
بہشتی شود گشتہ پاک از گناہ
(صفحہ ۲۳ ، جلد اول ، بمبئی سنہ ۱۲۷۵ھ)

پردے کا بھی شاہ نامے میں مذکور آتا ہے :

پس پردۂ او یکی دختر است
کہ رویش زخورشید روشن تر است

- نوشیروان کے خواب کی روایت تمام بایسنغری نسخوں میں ملتی ہے لیکن اس عہد سے قبل کے بعض شاہ ناموں میں جو میری نظر سے گزرے ہیں یہ خواب مذکور نہیں ۔ چنانچہ سنہ ۷۵۲ ہجری کے مخطوطے نیز ایک اور نسخے نوشتۂ سنہ ۸۵۵ ہجری میں نوشیروان کا یہ خواب درج نہیں ۔

(حاشیۂ مصنف)

دیگر

کرا در پس پردہ دختر بود
اگر تاجدارد بد اختر بود

فردوسی مانتا ہے کہ ایک امر کن سے خدا نے دو جہان کو پیدا کیا :

دوگیتی پدید آرد از کاف و نون
چرا نہ بفرمان او در نہ چون

اس کے ہاں لوح و قلم کا بھی ذکر موجود ہے :

بہ آنگہ کہ لوح آفرید و قلم
بزد بر ہمہ بودنیہا رقم

خواب کے وجود میں عام مسلمانوں کی طرح اس کا بھی اعتقاد ہے ۔ وہ اس کو دانش پیغمبری کہتا ہے :

نگر خواب را بیہدہ نشمری
یکی بہرہ دانش ز پیغمبری
روان ہای بیدار بیند بخواب
ہمہ بودنیہا چو آتش برآب

عربوں سے باوصف محبت ایران اس کو کوئی قومی عناد نہیں ۔ اگرچہ استیلاے عرب بر عجم کے بیان میں بدقسمتی سے اس نے ایسی روایات سے کام لیا ہے جن میں عربوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے[1] ۔ تاہم جہاں عربوں کی تعریف کی ہے وہاں فردوسی

۱ - بایسنغری ایڈیشن سے قبل کے بعض شاہناموں میں داستان یزد جرد سے ایسے ابیات جو صریحاً عربوں کے خلاف معاندانہ جوش کا اظہار کرتے ہیں خصوصیت کے ساتھ غیر حاضر ہیں جس سے شک گزرتا ہے کہ شاید اس قسم کے اشعار بعد میں اضافہ کر دیے گئے ہیں ۔ ایک نسخہ نوشتۂ سنہ ۷۵۲ ہجری میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

نے اس قوم کے مخصوصی خط و خال ، ان کی حریت پرستی ، رجز خوانی ، فوری اشتعال ، نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے اوصاف کو فراموش نہیں کیا ہے ۔ چنانچہ :

اگر شد فریدون چنین شہریار
نہ ما بندگانیم با گوشوار
سخن گفتن و رنجش آئین ماست
عنان و سنان باختن دین ماست
بخنجر زمین را میستان کنیم
بہ نیزہ ھوا را نیستان کنیم

عربی ضرب لاامثال ، محاورات اور مقولوں کو جو اس کے عہد تک عام مسلمانی گفتگو میں رائج ہو چکے ہوں گے فردوسی اپنی زبان میں کامیابی کے ساتھ تبدیل کر دیتا ہے اور اس ترجمے میں ضرور کچھ نہ کچھ جدت بھی اضافہ کرتا دیکھا جاتا ہے ۔

عربی امثال	فردوسی کا ترجمہ
اذا جاء القضا عمی البصر	
	قضا چون ز گردون فرو هشت پر همہ زیرکان کو گر ردند و کر
خیرالامور اوسطها	
	بکار زمانہ میانہ گزین چو خواھی کہ یابی همی آفرین

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

رستم سپہسالار یزدجرد کے درمیان جنگ کے واقعات کی تفصیل بایسنغری نسخوں اور مطبوعہ شاہ ناموں سے کئی امور میں مختلف ہے ۔ خود اس داستان کی موجودہ ابتر حالت شاہد ہے کہ اس میں تصرفات کیے گئے ہیں ۔

(حاشیہٴ مصنف)

طلب البعیر قرنین فضاع الاذنین

کہ خرشد کہ خواهد ز گاوان سرو
بہ یکبار گم کرد گوش از دو سو

الدنیا مزرعة الآخرة

یکی مزرع آن جہانست این
نظر برکشای و حقیقت بہ بین

من حفر بئراً لاخیہ فقد وقع فیہ

کسی قدر تبدیلی کے ساتھ کہا ہے:

کسی کو برہ برکند ژرف چاہ
سزد گر کند خویشتن را نگاہ

سید القوم خادمهم

چہ گفت آن سخن گوی باترس و هوش
چو خسرو شدی بندگی را بکوش

الحق مُرّ

نگر تا چہ گوید سخن گوی بلخ
کہ باشد سخن گفتن راست تلخ
کہ گفتار تلخ ست باراستی
بہ بندد بہ تلخی در کاستی

من عاش بعد عدوہ
یوماً فلقد بلغ المنا
وان حیواة المرء بعد عدوہ
وان کان یوماً واحداً لکثیر

دم آب خوردن پس بد سگال
بہ از عمر ہفتاد و ہشتاد سال

العجلة من الشیطان

شتاب و بدی کار اهریمن است
پشیمانی و رنج جان و تن است

(صفحہ ۱۲۷ ، جلد اول)

جوّع کلبک یتبعک سمّن کلبک یا کلک

سگ آن بہ کہ خواهندهٔ نان بود
چو سیرش کنی دشمن جان بود

(صفحہ ۱۱۳ ، جلد چہارم)

داستان آذر نوش میں ایک حدیث نبوی جس کے اصل الفاظ مجھ کو نہ مل سکے فردوسی یوں بیان کرتا ہے :

چہ خوش گفت دین آور تازیان
کہ خشم پدر جانت آرد زیان

کسی اور عرب سردار کا قول فردوسی یوں نقل کرتا ہے :

سپہ دار تازی سر راستان
برین بر بہ گوید یکی داستان
کہ تا زندہ ام چرمہ جفت منست
خم چرخ گردون نہفت منست
عروسم نباید کہ رعنا شوم
بہ نزد خردمند رسوا شوم

(صفحہ ۳۱ ، جلد اول)

اس قدر مطالعے کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ نامے میں اسلامی مذہبیت کا عنصر کم پایا جاتا ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ فردوسی کا مضمون ایک عجمی تاریخ تھی جس میں ان جذبات کے اظہار کا بہت کم موقع مل سکتا ہے ۔ ساتھ ہی میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ فردوسی کی حیثیت زیادہ تر ایک دنیا دار مسلمان سے ملتی جلتی ہے جس کو مذہب کا شغف نہ ہو ۔ وہ کوئی متقی

اور دین دار مسلمان نہیں تھا اور نہ فقیہہ اور عالم ۔ مذہبی رنگ اس پر کبھی نہیں کھلا اور نہ اس میں انہاک رہا ۔

وہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق ، جیسا کہ ہم اس عہد میں عام طور پر دیکھتے ہیں ، شراب خوری کا عادی تھا ۔ ناصر خسرو نے جب کہ چالیسویں سال اور امیر کیکاؤس نے اپنی عمر کے پچاسویں سال مے نوشی سے توبہ کر لی تھی ۔ فردوسی نہ اس عہد میں اور نہ اس عمر میں ، جیسا کہ شاہنامے سے معلوم ہوتا ہے ، توبہ کرتا دیکھا جاتا ہے بلکہ پیری اس نشاط سے لطف اٹھانے کے لیے اور بہانہ ہو گئی تھی :

چو پیری درآید ز ناگہ بہ مرد
جوانش کند بادۂ سال خورد
کرا کوز شد پشت و بالاش پست
بکیوان برد سر چو شد نیم مست

اس نے اپنی عمر کے تریسٹھویں سال تک توبہ نہیں کی تھی ۔ چنانچہ :

می لعل پیش آور ای روز بہ
چو شد سال گوینده برشصت وسہ

اکثر داستانوں کے اختتام یا آغاز میں فردوسی کو شراب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ شاید نظامی نے دانائے طوس کی تقلید میں سکندر نامے میں یہی شیوہ اختیار کیا ہے اگرچہ بہ تحقیق معلوم ہے کہ نظامی دخت رز کے گرفتاروں میں نہ تھے ۔

مگر فردوسی کی شراب نوشی حافظ اور خیام کی طرح رندانہ اور مستانہ نہیں ہے بلکہ وہ اس سے حظ حاصل کرکے نیم مستی پر ہی قناعت کرتا ہے ۔

گرت ہست جامی مَی زرد خواہ
بدل خرمی را مدار از گناہ

نشاط و طرب جوی و مستی مکن
گزافه مپندار مغز سخن

دیگر

ز می نیز تو شادمانی گزین
که مست از کسی نشنود آفرین
(صفحه ۱۶ ، جلد چهارم)

فردوسی موت کے ذکر کے ساتھ شراب بھی یاد رکھتا ہے :

اگر مرگ دارد چنین طبع گرگ
پراز می یکی جام خواهم بزرگ

اپنے کسی ہاشمی دوست سے جو غالباً حسین قتیب ہے ، ایک موقعے پر شراب طلب کر رہا ہے :

می لعل پیش آور ای هاشمی
ز خمی که بیشی ندارد کمی

بہار کی آمد اس کے دل میں شراب کا ولولہ پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ داستان رستم و اسفندیار کی تمہید میں دیکھا جاتا ہے :

کنون خورد باید می خوشگوار
که می بوی مشک آید از کوهسار
هوا پر خروش و زمین پرزجوش
خنک آنکه دل شاد دارد بنوش
درم دارد و نقل و نان و نبید
سری گوسفندی تواند برید

عمر کے اکسٹھویں سال (؟) شراب سے تائب ہونے کا عزم مصمم کر رہا ہے :

چو سالت شد ای پیر بر شصت ویک
می و جام و آرام شد بی نمک

بگاہ پسیجیدن مرگ می
چو پیراهن شعر باشد بدی
فسرده تن اندر میان گناه
روان سوی فردوس گم کرده راه
زیاران بسی ماند و بس درگزشت
تو با جام همواره بوده بدست
بآغاز اگر کار خود ننگری
بفرجام ناچار کیفر بری

اس شصت و یک کا نسخہ هفتاد و یک ہے جو میرے خیال میں یہاں زیادہ مناسب ہے ۔

اسی زمانے کے قریب ایک اور مقام پر توبہ کے لیے تصمیم عزم کرتا پایا جاتا ہے :

تو ای پیر فرتوت بی توبہ مرد
خرد گیر وز بزم شادی بگرد
جہان تازہ شد چون قدح یافتی
روان از در توبہ برتافتی
اگر بخردی سوی توبہ گرای
همیشہ بود پاک دین پاک رای
پس از پیریت روزگاران نماند
تموز و خریف و بہاران نماند

اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس موقعے پر شاعر نے توبہ نصوح کر لی ہے ۔

فردوسی کی طبیعت کا رنگ دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مذہب کے ماسوا جس چیز نے اس کے قلب پر اپنا سکہ جمایا تھا وہ حکمت و فلسفہ ہے ۔ اس طرح اگر اس کا شمار حکماے اسلام میں کیا جائے تو غیرموزوں نہیں ہوگا ۔ بعض مصنفین نے اس کو حکیم لکھا

ہے ، ان کا ایسا لکھنا صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

فقیہانہ طریق سخن میں خدا ارحم الراحمین اور قہار و جبار ہے لیکن فلسفی طبع فردوسی شاہ نامے کے پہلے صفحے کیا بلکہ پہلے شعر میں خدا کو خداے جان و خرد کہتا ہے جو نام و مقام سے برتر ہے اور جس تک پیک تخیل کو رسائی نہیں ۔ حمد کے بعد دیباچے کا دوسرا زینہ ستایش خرد ہے ۔ "اول ما خلق اللہ العقل" اگرچہ حدیث نبوی بتائی گئی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ فلاسفہ کا ایک مسئلہ ہے ۔ فردوسی کے نزدیک عقل آفرینش کا پہلا گوہر ہے ۔ ع :

نخست آفرینش خرد را شناس

اس خیال میں مولانا نظامی گنجوی بھی فردوسی کے ہم زبان ہیں ۔ چناں‌چہ سکندر نامۂ بحری میں کہتے ہیں :

نخستین خرد را پدیدار کرد
ز نور خودش دیدہ بیدار کرد

خرد ، فردوسی کا قول ہے ، ایک بہترین خلعت ہے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے ۔ اس سے کونین میں انسان کی آبرو ہے ۔ خرد کے بعد فردوسی روح کے ذکر میں مشغول ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عقل کلی اور نفس کلی فلاسفہ میں بحث و جدال کے وقیع مضمون رہے ہیں ۔ بواطنہ کے ہاں بھی یہ مسائل ان کے فلسفے کے اصل الاصول ہیں ۔

آفرینش کا بیان جو فردوسی دیتا ہے وہ حکماے یونان کے خیالات سے ملتا جلتا ہے ۔ ابتدا میں کچھ نہیں تھا ۔ نیستی سے ہستی کی تخلیق کی ۔ آغاز میں ایک جنبش ہوئی جس سے آتش پیدا ہوئی ۔ حرارت سے خشکی ظاہر ہوئی ۔ سکون سے سردی نے ظہور پایا اور سردی سے تری کی تولید ہوئی ۔ ان سے عناصر کی ولادت ہوئی ۔ ایک آتش بلند ہوئی جس نے آسمانوں کو تو بر تو اور متحرک قائم کیا ۔

بارہ برجوں اور سبعہ سیاروں کو افلاک پر جگہ ملی ۔ آگ بلند ہوئی باد و آب نے درمیان میں اور خاک نے سب سے نشیب میں مقام پایا ۔ زمین ایک تاریک اور سیاہ مرکز تھی ۔ آفتاب اس کے گرد گھومنے لگا ۔ پہاڑ نمودار ہوئے ۔ پانی کے چشمے ابلے ۔ دریا و کوہ ، دشت و راغ سے زمین روشن چراغ کی طرح معلوم ہونے لگی ۔ جمادات کے بعد نباتات نے بروز کیا ۔ گیاہ اور مختلف نوع کے درختوں نے بالیدگی شروع کی ۔ ان کا سر نشیب میں ہے اور متحرک نہیں ہیں اور نہ بالیدگی کے سوائے کوئی اور وصف ان میں موجود ہے ۔ اب جنبش کرنے والا یعنی حیوان سطح پر نمودار ہوا جو عالم نباتات پر متصرف ہوا ۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ درخت کی طرح اس کا سر زمین میں نہیں ہے ۔ اس کو کھانے ، سونے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے ۔ نہ خدا اس سے عبادت چاہتا ۔ لیکن آفرینش کا سب سے قیمتی اور آخری رکن انسان ہے ۔ اس کا قد راست ہے ۔ نطق اور عقل دونوں اس کو عطا ہوئے ۔ دد و دام اس کے مطیع ہیں ۔ تخلیق انسان کی غایت کے سوال کو فردوسی خود چھیڑتا ہے اور کہتا ہے :

مگر مردمی خیرہ دانی ھمی
جز این را نشانی ندانی ھمی
ترا از دو گیتی برآوردہ‌اند
بہ چندین میانجی بہ پروردہ اند
نخستین فطرت پسین شمار
توئی خویشتن را بہ بازی مدار

کیا بشریت ایک بے کار شے ہے اور بس ؟ نہیں اے انسان دونوں جہان میں تجھ کو شرف دیا گیا ہے اور متعدد وسائل سے تیری پرورش ہوئی ہے ۔ آفرینش کی سب سے اول مگر شمار میں سب سے آخری مخلوق اے انسان تو ہے ! تو اپنے آپ کو مہملات میں

ضائع مت کر ۔

چوں کہ بعض فلسفیانہ معتقدات کی رو سے انسانی مقدرات کی عنان مدبران فلکی کے سپرد کی گئی ہے اس لیے تخلیق انسان کے بعد فردوسی کو ہم افلاک کے ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں ۔ حکیم طوس ان معتقدات کو دہراتے ہوئے گویا ہے "اس تیز گھومنے والے گنبد کو دیکھو جس سے سب کو درد و درمان ، تکلیف اور آسائش ملتی ہے ۔ کسی وقت گردش سے اسے قرار نہیں ، نہ ہماری طرح تباہی پذیر ہے ۔ ہماری مقدرات کے خیر و شر سے وہ با خبر ہے ۔"

نگہ کن برین گنبد تیز گرد
کہ درمان ازویست وزویست درد
نہ از گردش آرام گیرد همی
نہ چون ما تباهی پذیرد همی
ازو دان فزونی ازو دان شمار
بد و نیک نزدیک او آشکار

ان معتقدات کی ، معلوم ایسا ہوتا ہے ، کسی معترض نے تردید کی ہے ۔ اعتراض غالباً نظم میں اور حاشیے پر ہوگا ۔ اس میں سے صرف ایک شعر جو غلطی سے متن میں داخل کر لیا گیا ہے اب تک موجود ہے ۔ جو یہ ہے :

ز یاقوت سرخ است چرخ کبود
نہ از آتش و آب و نز باد و دود

یاد رہے یہ شعر اسلامی نقطۂ نگاہ سے ہے لیکن فردوسی کے لیے کسی ایسے اعتراض کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ خود ان عقائد کی شاہ نامے کے دوران میں ایک سے زیادہ موقعے پر تردید و تکذیب کرتا دیکھا جاتا ہے ۔

آسمان کی دورنگی ، دنیا کی بے مہری اور زمانے کی بے وفائی ،

جس طرح اور شعرا میں ، فردوسی کے ہاں بھی ایک مقبولہ موضوع رہا ہے جس کو وہ اپنی تصنیف کے دوران میں کہیں فراموش نہیں کرتا ۔ ہم اپنی بد اعمالیوں کا الزام شیطان کے سر تھوپتے ہیں ۔ اسی طرح وہ ناگوار واقعات جو ہماری دسترس سے باہر ہیں اور ہم پر گزرتے ہیں تقدیر کے حوالے کیے جاتے ہیں ۔ فردوسی جس نے ہماری طرح شخصی سلطنتوں کی آب و ہوا اور استبداد کے سائے میں پرورش پائی تھی سلطنت کی تعدی ، اکابر کے مظالم اور اسی قسم کے دیگر واقعات کو آسمانی تعدی سے تعبیر کرتا ہے ۔ مزید براں اجرام فلکی کی عالم سفلی پر تاثیرات کا عام عقیدہ اور تنجیم کی مشرق ممالک میں عالم گیر مقبولیت اور ایسے اسباب ہوگئے تھے جنھوں نے اس فلسفے کی بنیاد ڈالی تھی جس میں آسمان مختار کل اور فاعل مطلق تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ واقعات خیر و شر ، کمال و نقصان ، عشرت و آرام ، درد و درمان سب افلاک کے علم اور ان کے قبضۂ قدرت میں مان لیے گئے تھے ۔

یہ عقیدہ قدیم ہے ۔ فارسی نظم میں اس کے جراثیم کی سراغ رسی رودکی کے عہد تک کی جا سکتی ہے ۔ اس عقیدے کی رو سے آسمان نہ تباہی پذیر ہے اور نہ توالی حرکت سے خستگی محسوس کرتا ہے نہ مرور ایام سے فرسودہ ہوتا ہے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں اسی قسم کے اور اعتقادات اس میں منضم ہوگئے ہیں جن میں دنیا یا زمانہ فاعل کل اور مختار مطلق مانے گئے تھے ۔ فردوسی کے ہاں یہ سب اعتقاد مخلوط شکل میں ملتے ہیں ۔ ان تمام کی علیحدہ علیحدہ مثالیں دینا مضمون کو طوالت دینا ہے ۔ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں :

اگر با تو گردون نشیند براز
نیابی هم از گردش او جواز

هم او تاج و تخت بلندی دهد
هم او تیرگی و نژندی دهد
بدشمن همی ماند و هم بدوست
گہی مغز یابی ازو گاہ پوست
سرت گر بساید بابر سیاہ
سر انجام خاکست ازو جایگاہ
(صفحہ ۵۲)

دیگر

جہان را ز کردار بد شرم نیست
کسی را بہ نزدیکش آزرم نیست
ہمیشہ بہر نیک و بد دسترس
و لیکن نہ جوید خود آرام کس

یہ عقائد شاہ نامے میں بالعموم ہر مقام پر پائے جاتے ہیں اور اس کے اتباع میں تمام ایرانی شعرا میں یہ بدعت مقبول ہوگئی ہے۔ لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ متعدد مقامات پر فردوسی ان اعتقادات کی بطلان و تکذیب میں سرگرم ہے۔ اس کے اسلامی معتقدات ، ظن غالب ہے اس امر کے محرک ہوئے ہوں گے۔ چناںچہ کیکاؤس کے ذکر میں کہتا ہے:

گمانش چنان بد کہ گردان سپہر
بہ گیتی مر او را نمود است چہر
ندانست کین چرخ را پایہ نیست
ستارہ فراوان و ایزد یکیست
ہمہ زیر فرمانش بیچارہ اند
چہ با سعد و نحس اند و سیارہ اند

اسی قسم کی تکذیب ایک اور موقع پر مشاہدے میں آتی ہے جہاں شاعر کہتا ہے:

یکی دائرہ آمدہ چنبری
فراوان در آن دائرہ داوری
اگر چرخ را ہست ازین آ گہی
ہمانا کہ گشتست مغزش تہی
چناندان کزین دانش آگاہ نیست
بچون و چرا سوی او راہ نیست

یزدجرد خاتم تاجداران عجم کے قتل کے وقت فردوسی گویا ہے :

ز خاک آمد و خاک شد یزد جرد
چہ گوئی تو زین بر شدہ ہفت گرد
چو از گردش او نیابی رہا
پرستیدن او نیارد بہا
بہ یزدان گرای و بدوکن پناہ
خداوند گردون و خورشید و ماہ

کسی اور مقام پر شاعر آسمان کو خطاب کرکے شکایت میں گرم سخن ہے :

الا ای برآوردہ چرخ بلند
چہ داری بہ پیری مرا مستمند
چو بودم جوان برترم داشتی
بہ پیری مرا خوار بگزاشتی
بہ کردار مادر بدی تا کنون
ہمی ریخت باید برنج تو خون
وفا و خرد نیست نزدیک تو
پر از رنجم از رای تاریک تو
مرا کاش ہرگز نہ پروردۂ
چو پروردہ بودی نیازردۂ

هر آنگه کزین تیرگی بگزرم
به گویم جفای تو یاد آورم
بنالم ز تو پیش یزدان پاک
خروشان بسر بر پراگنده خاک
چنین داد پاسخ سپهر بلند
که ای مرد گویندهٔ بیگزند
چرا بینی از من همی نیک و بد
چنین ناله از دانشی کی سزد
تو از من بهر بارهٔ بهتری
روان را بدانش همی پروری
خوروخواب‌ورای‌نشستن تراست
به‌نیک و به بد راه جستن تراست
برین هرچه گفتی مرا راه نیست
خور و ماه زین دانش آگاه نیست
من از آفرینش یکی بنده ام
پرستندهٔ آفریننده ام
نه گردم همی جز به فرمان اوی
نه تابم همی سر ز پیمان اوی
ازان خواه راحت که این آفرید
شب و روز و آئین و دین آفرید
چه‌گوید بباش آنچه خواهد بداست
کسی‌کوجزین‌داند‌او بیهوده‌است
یکی آنکه هستیش را راز نیست
به‌کاریش فرجام و آغاز نیست
جز او را مخوان کردگار سپهر
فروزندهٔ ماه و ناهید و مهر

به یزدان گرای و به یزدان پناه
بر اندازه رو هر چه خواهی بخواه
وزو بر روان محمدؐ درود
بیارانش بر هر یکی بر فزود

یہ اشعار فردوسی کے فلسفے اور اس کے مذہب کے لب لباب ہیں ۔ فلسفے سے ذوق فردوسی کو اگرچہ بے حد ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ کسی وقت بھی اس کو پوری تسلی اور اطمینان نہیں دے سکا ۔

جب ہم شاہ نامہ کھولتے ہیں اور تمہید میں ایسے بیانات مثلاً ستایش خرد ، ستایش روح ، بیان آفرینش ، جمادات ، نباتات ، حیوانات ، انسان ، افلاک ، آفتاب و ماہتاب پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون اور ارسطو کا شاگرد جو یونانی دبستان کی تمام روایات سے بخوبی ماہر ہے حکمت و فلسفے کے نکات کی فارسی زبان میں ترجمانی کر رہا ہے ۔ لیکن جوں جوں شاہ نامے کی منازل قطع ہونی شروع ہوتی ہیں یونانی فلسفی برف کے تودے کی طرح تابش آفتاب سے پگھل کر غائب ہو جاتا ہے اور اس کے بجائے حقیقی فردوسی نمودار ہوتا ہے جو یاس و قنوط اور الم پرستی کے اثرات میں بالآخر حکمت سے اعتزال کر کے مذہب کے آغوش میں اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے۔

حکمت سے فردوسی کی رو گردانی کے دو بڑے وجوہ معلوم ہوتے ہیں ۔ اول ہستی واجب‌الوجود جس میں اکثر فلاسفہ کو کلام رہا ہے ۔ شاعر کسی فلسفی کو خطاب کر کے کہتا ہے :

کہ تم جو ہر شے پر عقل کی عینک چڑھا کر نظر ڈالتے ہو یہ سلوک واجب الوجود کے ساتھ مناسب نہیں ۔ گفتگو اور بحث تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی لیکن اگر تم معقول پسند ہو تو راہ راست پر چلو اور مانو کہ ہماری دانش بیچارگی ہے اور خدا کی ذات ہمارے ادراک

سے ماورا ہے - بس اسی قدر جاننا کافی ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے - تم اپنی ذات کو بہت دور کھینچتے ہو لیکن یاد رہے کہ طرفۃالعین میں روح اور جسم میں مفارقت ہو جاتی ہے - زمانہ فانی ہے اور تمھارا اصلی ٹھکانا کوئی اور مقام ہے - سب سے مقدم خدا کی یاد کرو اور اس کی پرستش کرتے رہو جس سے افلاک قائم ہیں اور جو نیکی کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے :

ایا فلسفہ دان بسیار گوی
نپویم براهی کہ گوئی بپوی
ترا هرچہ برچشم بر بگزرد
بہ گنجد همی در دلت با خرد
چناندان کہ یزدان نیکی دهش
جز آنست و زین بر مگردان منش
تو گر سختۂ راہ سنجیدہ پوی
نیاید بہ بن هرگز این گفتگوی
همہ دانش ما بہ بیچارگی است
بہ بیچارگان بر بباید گریست
همیدان‌تواو را کہ هست‌ویکیست
روان و خرد را جزین راہ نیست
بہ یکدم زدن رستی از جان و تن
همی بس بزرگ آیدت خویشتن
همی بگزرد بر تو ایام تو
سرای جز این باشد آرام تو
نخست از جهان آفرین یاد کن
پرستش برین یاد بنیاد کن
کزویست گردون گردان بپای
هم اویست . بر نیکوئی رهنمای

کسی اور موقع پر فردوسی پھر یہی گفتگو دہرا رہا ہے اور کہتا ہے کہ واجب الوجود کی ہستی میں نزاع کرنا اگر سوچو گے تو بے کار ہے - تمھارا پروردگار خدا ہے اور تم اس کے بندے ہو - نہ وہ کھاتا ہے نہ وہ سوتا ہے - کور دل اور بے خرد ہی اس کی ہستی کے معترف نہ ہوں تو نہ ہوں مگر دانا ان کو انسان نہیں مانیں گے - تم اپنی دانش کے اعتماد پر اپنے آپ کو ضلالت کے گڑھے میں نہ ڈالو کیونکہ اس کی ہستی کی علامات اور آیات آب و خاک اور ہر شے سے ہویدا ہیں - وہ دانا ، توانا اور دارندہ ہے - عقل اور نفس کا نقش بند وہی ہے - جہان مکان و زمان اس کی مخلوق ہیں - وہی پیل و پشہ کا خالق اور خورشید و ماہ کا خداوند ہے جو ظفر اور قدرت عطا کرنے والا ہے - راستی اور ہستی کا مالک ، کمی اور افزونی کا ظہور پیرا ، کامیاب بنانے والا ، مہربان جو ہم کو رزق دیتا ہے درآں حالیکہ ہم سے بے نیاز ہے - عالم اور آفتاب ، زہرہ اور آسمانوں کا خداوند جس کی رائے اور حکم کے سوا ہمارے لیے کوئی اور راستہ نہیں :

کنون ای خردمند بیدار دل
مشو در گمان پای درکش ز گل
چو گردن باندیشہ زیر آوری
ز هستی مکن پرسش و داوری
ترا کردگاریست پروردگار
توئی بندہای کردۂ کردگار
نشاید بخوروخواب با او نشست
کہ خستو نباشد بہ یزدان کہ هست
دلش کور باشد زبان بی خرد
خردمندش از مردمان نشمرد

زهستی نشانست بر آب و خاک
ز دانش مکن خویشتن در مغاک
توانا و دانا و دارنده اوست
خرد را و جانرا نگارنده اوست
جهان آفرید و مکان و زمان
پی پشهٔ خورد و پیل ژیان
خداوند کیوان و خورشید و ماه
کزویست پیروزی و دستگاه
خداوند هستی و هم راستی
ازویست بیشی و هم کاستی
خداوند بخشندهٔ کارساز
خداوند روزی ده بی نیاز
خداوند گیتی خداوند مہر
خداوند ناهید و گردان سپہر
جز از رای و فرمان او راه‌نیست
خورو ماه ازین دانش آگاه نیست

کشیدگی کا دوسرا باعث یہ ہے کہ فردوسی زندگی کے روزمرہ کے واقعات ، نیکی بدی ، راحت و آرام ، بد بختی و نیک بختی ، داد و بیداد الغرض ہر سوال کا جواب فلسفے سے مانگتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ فلسفہ ہر شے اور ہر واقعے کا علت و معلول بتا دے ۔ مثلاً فردوسی یزدگرد آخری تاجدار ایران کے قتل کے خونیں واقعات لکھ کر ایک گہری فکر میں مستغرق دیکھا جاتا ہے ۔ وہ سوچ رہا ہے کہ یزد جرد کے مارے جانے کو داد کہا جائے یا ستم ، حق کہا جائے یا ناحق ۔ اب فلسفہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتا ۔ اگر دیتا ہے تو مبہم جس سے اطمینان نہیں ہوتا اور مشکل حل نہیں ہوتی ۔ وہ کہتا ہے :

چنین داد خوانیم بر یزدجرد
وگر کینہ خوانیم زین هفت گرد
وگر خود نداند همی کین و داد
مرا فیلسوف ایچ پاسخ نداد
وگرگفت مارا سخن بستہ گفت
بہ ماند همی پاسخ اندر نہفت

ایسے موقعوں پر دانائے طوس مذہب کے دامن میں پناہ لیتا ہے ۔ مثلاً داستان سہراب کی تمہید میں حسب معمول ہمارا شاعر فلسفیانہ خیالات میں مستغرق نظر آتا ہے ۔ اس گہری فکر کے بانی نوجوان سہراب کا قتل اور اس کی موت کے بعد کے واقعات ہیں ۔ ان پر وہ اس پیرائے میں استدلال کرتا ہے کہ اگر باد صرصر ترنج خام کسی درخت سے گرا دے تو باد کے اس فعل کو داد کہا جائے یا بیداد ، اچھا کہا جائے یا برا ۔ اگر موت داد ہے تو بیداد کس چیز کا نام ہے اور جب داد مانتے ہو تو داد کے خلاف یہ واویلا کیسا ۔ اب شاعر کہتا ہے کہ یہ خدائی راز ہے جس سے ہم کو لاعلمی میں رکھا گیا ہے ۔ انسان بالطبع حریص ہے اس لیے یہ راز اس پر نہیں کھولا گیا ۔ ممکن ہے کہ جب ہم یہاں سے رخصت ہوں اور سرائے جاودانی ہماری منزل گاہ بنے ، ہماری حالت اس لحاظ سے بہتر ہو جائے :

اگر تند بادی بر آید ز کنج
بخاک افگند نارسیده ترنج
ستمگاره خوانمش ار دادگر
هنرمند گویمش ار بی‌هنر
اگر مرگ دادست بیداد چیست
زداد این همہ داد و فریاد چیست

ازین راز جان تو آگاہ نیست
بدین پردہ اندر ترا راہ نیست
ہمہ تا در آز رفتہ فراز
بکس وا نشد این در راز باز
برفتن مگر بہتر آیدت جای
چو آرام گیری بدیگر سرای

حکمت کے اس مقولے کو کہ اگر موت نہ ہوتی اور توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہتا تو زمین پر رہنے بسنے کو تو کیا انسان کو کھڑے رہنے کو بھی جگہ میسر نہ آتی ۔ فردوسی آغاز ہی میں تسلیم کر لیتا ہے ۔ چنانچہ :

اگر مرگ کس را نیو بار دی
ز پیر و جوان خاک بسیاردی

شاعر اپنے استدلال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے ۔ آگ کی خاصیت جلانا ہے ۔ جلاتے وقت وہ نئی پرانی شاخ میں کوئی فرق نہیں کرتی ۔ اسی طرح موت بھی جوان اور بوڑھے میں تمیز نہیں کرتی ۔ صرف بڑھاپا موت کا باعث نہیں اس لیے جوان کو خوشی منانے کا موقعہ نہیں ہے ۔ بہرحال اس دار رحلت میں جب موت قضا کے گھوڑے پر سوار آئے تو خوب سمجھ لو کہ اس کی آمد انصاف ہے اور بے انصافی نہیں :

اگر آتشی گاہ افروختن
بسوزد عجب نیست زو سوختن
بسوزد چو در سوزش آید درست
چو شاخ نو از شاخ کہنہ برست
دم مرگ چون آتش ہولناک
ندارد ز برنا و فرتوت باک

جوان را چہ باید بگیتی طرب
که نی مرگ راهست پیری سبب
درین جای رفتن نہ جای درنگ
بر اسب قضا گر کشد مرگ تنگ
چناندان که دادست وبیداد نیست
چوداد آمدش بانگ وفریاد چیست

مرگ اگرچہ انصاف ہے لیکن جوان مرگی بظاہر انصاف نہیں۔ فلسفہ اس کی عقدہ کشائی سے عاجز ہے۔ فردوسی مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے اور مذہب اس کے کان میں کہتا ہے کہ یہ خدائی راز ہے اور فہم انسانی سے باہر۔ اگر ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو ان وساوس کو دل میں جگہ نہ دو۔ دین میں خلل ڈالنا منظور نہ ہو تو جوان اور بوڑھے کی موت میں کوئی فرق نہ کرو۔ خدا کی پرستش کرتے رہو اور اپنے آخری وقت کے لیے تیار رہو اور کوشش کرو کہ خدا تمھارا خاتمہ اسلام پر کرے:

برین کار یزدان ترا راز نیست
اگر دیو با جانت انباز نیست
جوانی و پیری بہ نزد اجل
یکی دان چو در دین نخواهی خلل
دل از نور ایمان گر آگندهٔ
ترا خامشی بہ که گویندهٔ
پرستش همان پیشہ کن با نیاز
همہ کار روز پسین را بساز
بگیتی دران کوش چون بگزری
سرانجام اسلام با خود بری

یوسف و زلیخائے فردوسی

مثنوی یوسف و زلیخا پر تنقید اور فردوسی سے اس کے انتساب کی تردید میں حافظ صاحب کا یہ معرکہ آرا مضمون رسالہ ''اردو'' کے اپریل ۱۹۲۲ع کے شمارے میں پہلی بار منصۂ شہود پر آیا ۔ ''فردوسی پر چار مقالے'' کے سلسلے کا یہ آخری مضمون تھا ۔

حافظ صاحب مرحوم نے سب سے پہلے اس موضوع پر نہایت مدلل اور مفصل انداز سے بحث کی اور اس نسبت کو ناقابل تسلیم قرار دیا ۔ ان کے علاوہ بعض مستشرقین نے بھی ، جن میں میکن ، ایتھے ، نلدیکی اور براؤن جیسی شخصیتیں شامل نہ تھیں ، اس انتساب پر شک کا اظہار کیا ؛
حافظ صاحب کا مضمون تو اردو میں ہونے کے سبب ایرانی محققین کی دسترس سے باہر تھا البتہ ان بے گناہ مستشرقین کے اس 'سوء ظن' کی ، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقعے پر مشہور ایرانی نقاد ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے ، تردید کی اور فرمایا :

''......اکنون من عقیدہ دارم کہ نسبت 'یوسف و زلیخا' بفردوسی صحیح است و دلائل من بروجہ ذیل است''...

اس کے بعد جو دلائل انھوں نے بیان فرمائے وہ کچھ اس قسم کے تھے کہ شاہنامے اور یوسف زلیخا کی بحر ایک ہے ، دونوں میں زبان کا اختلاف ضرور ہے لیکن یہ کوئی مشکوک چیز نہیں ۔ یوسف زلیخا بعض موقعوں پر شاہنامے سے بڑی متأثر نظرآتی ہے وغیرہ ۔
لیکن حقیقت تا دیر پوشیدہ نہ رہ سکی اور فردوسی کی کلاہ کے اس ناموزوں پر کو ایرانی محققین جلد ہی نوچ پھینکنے پر مجبور

ہو گئے ۔ ڈاکٹر شفق کے حولہ بالہ بیان کے چند سال بعد ہی ان کی ''فرہنگ شاہنامہ'' (۱۳۲۰ ھجری شمسی) اور ''تاریخ ادبیات در ایران'' (۱۳۲۱ ھ ش) شائع ہوئیں جن میں انھوں نے دبی زبان سے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا ۔ تاریخ ادبیات سے ایک حوالہ ملاحظہ ہو :

''بعضی از دانشمندان نہ تنہا در صحت خبر این مسافرت فردوسی بہ بغداد تردید دارند بلکہ در انتساب مثنوی یوسف و زلیخا بوی هم شبہۂ قوی ابراز میکنند ۔ در این اواخر یکی از دانشمندان نسخہ ای خطی از یوسف و زلیخا بدست آوردہ کہ بموجب اشعاری در مقدمہ آن گویندۂ این مثنوی فردوسی نبودہ بلکہ مثنوی نامبردہ در زمان سلطان ملکشاہ سلجوق (۴۶۵ - ۴۸۵) بنام برادر وی طغانشاہ بن الپ ارسلان بنظم کشیدہ شدہ ۔''

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے اپنی ''تاریخ ادبیات در ایران'' (جلد اول ، صفحہ ۴۸۹-۴۹۰) میں اس غلطی کی کھلے لفظوں سے صراحت کی ہے ۔ چنانچہ :

''در آغاز و انجام نسخ معمول یوسف و زلیخا ببحر متقارب معمولا نساخ آنرا بفردوسی نسبت دادہ اند و بہمین سبب هم محققان اروپایی و بسیاری از محققان ایرانی در نہایت اشتباہ برین عقیدہ رفتہ و خواستہ اند ثابت کنند کہ منظومۂ یوسف و زلیخا از فردوسی میباشد و از همین طریق قسمتی از تاریخ حیات فردوسی یعنی رفتن او ببغداد و وصول بحضور موفق و بہاالدولہ و ماموریت بنظم قصۂ یوسف و زلیخا جعل شدہ است ۔'' (مرتب)

اس کتاب کا سب سے پہلا حوالہ شرف الدین یزدی کے ظفر نامہ تصنیف سنہ ۸۲۸ھ میں ملتا ہے ۔ قرشی کی فتح کے ذکر میں جو تیمور کے عجیب و غریب کارناموں میں مانی جاتی ہے ، شرف الدین لکھتا ہے :

"و این حکایتی است واقعی که صحتش بتواتر پیوسته و در مجلس تحریر بعض ازان مردم که برای العین این احوال مشاهده کرده اند بی مداهنت تقریر می کنند نه از قبیل لاف و گزاف که فردوسی در شاه نامه برای سخنوری و فصاحت گستری بر بعضی مردم بسته و در نظم قصهٔ یوسف علی نبینا و علیه الصلواة و السلام خود معترف شده و انصاف داده که نظم :

ز هر گونهٔ نظم آراستم
بگفتم دران هرچه خود خواستم
اگرچه دلم بود زان بامزه
همی کاشتم تخم و بیخ و بزه
ازان تخم کشتن پشیمان شدم
زبان را و دل را گره بر زدم
که آن داستانها دروغ است پاک
دوصدزان نیرزد بیک مشت خاک
برین می‌سزد گر بخندد خرد
زمن خود کجا کی پسندد خرد
که یک نیمه از عمر خود گم کنم
جهانی پر از نام رستم کنم
چه باشد سخنهای برساخته
شب و روز اندیشه پرداخته

والحق این معذرت و انصاف ازان بدیع مقال بی همال هم از دلائل وفور فضل و کمال اوست ۔"

(ظفر نامہ ، صفحہ ۱۳۷ ، طبع سوسائٹی ، سنہ ۱۸۸۷ ع)

اس کے بعد دیباچۂ بایسنغری میں ، جو سنہ ۸۲۹ھ میں تالیف ہوتا ہے ، متاخرین اس دیباچے کے ذریعے سے اس کتاب سے واقف ہوئے ہیں ۔

دیباچہ نگار بایسنغرخانی اور اس کی تقلید میں دیگر تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ فردوسی نے اہالیِ بغداد کی خوشنودی کے لیے اپنے قیام بغداد کے دوران میں مثنوی یوسف و زلیخا تصنیف کی ۔ یہ کتاب (طبع دارالطباعہ خاصۂ مدرسۂ مبارکہ دارالفنون طہران ، سنہ ۱۲۹۹ھ) اس وقت ہمارے پیش نظر ہے ۔ اس میں کوئی ایسی تصریح یا تلمیح موجود نہیں جس سے ظاہر ہو کہ وہ بغداد میں یا بغداد والوں کے لیے لکھی گئی تھی ۔ نہ اس کو کسی خلیفہ یا پادشاہ کی طرف منسوب ہونے کا دعویٰ ہے ۔

مغربی مستشرقین میں ٹرنر میکن مرتب شاہ نامہ (کلکتہ) قابل ذکر ہے جس کا بیان ہے کہ فردوسی نے یہ کتاب والیِ عراق کے لیے تصنیف کی تھی ۔ ڈاکٹر ایتھے جس نے یورپ میں اس مثنوی کا سب سے پہلا منتقدانہ ایڈیشن شائع کیا ہے ، نیز پروفیسر براؤن کا عقیدہ ہے کہ یہ مثنوی فردوسی نے مجدالدولہ ابوطالب رستم کے لیے لکھی تھی ۔

لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ یوسف زلیخا جب کہ متاخرین میں مشہور ہے ، متقدمین میں اس کی شہرت جلوہ افروز طاق نسیاں رہی ہے اور نویں صدی ہجری سے قبل کی ایک سند بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کتاب کا ذکر یا اس کا علاقہ فردوسی سے تسلیم کر سکے ؛ اگرچہ فردوسی اور اس کے شاہ نامے کا ذکر متقدمین کے ہاں اکثر ملتا ہے اور یہ قضیہ ہمیں اس سوال پر آمادہ کرتا ہے کہ آیا موجودہ یوسف زلیخا فردوسی کی تصنیف کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں ، کیوں کہ ہمارے پاس بعض ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس مسلمہ عقیدے کو شبہے کی نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے ۔

بعض حلقوں میں یوسف زلیخا پر اعتراض ہوا ہے کہ اس کی زبان بہت کمزور ہے لیکن ساتھ ہی دفع اعتراض میں کہا گیا ہے

کہ فردوسی بزم نگاری میں استاد نہیں بلکہ میدان جنگ اور رزمیہ کارنامے بیان کرنے میں اس کی طبیعت کا قدرتی رجحان تھا ۔

کتاب یوسف زلیخا اگرچہ ایک ایسے مضمون پر لکھی گئی ہے جو اسلام میں مقبول رہا ہے اور کلام پاک میں حضرت یوسفؑ کے قصے کا ذکر آنے سے اس کی ہردلعزیزی کو اور بھی فروغ مل گیا ہے لیکن صاحب قرآن العجم کی یوسف زلیخا کی جو قدر فارسی خواں دنیا نے کی ہے ، چنداں محتاج بیان نہیں ۔ لوگ مشکل سے اس سے واقف ہیں ۔ برخلاف اس کے یوسف زلیخاے جامی اس قدر مشہور ہے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک سب اس کو جانتے ہیں ، حالانکہ تاریخی حیثیت سے دیکھتے ہوئے ، خواہ باعتبار قدامت خواہ بہ لحاظ روایت ، قصہ یوسف زلیخاے فردوسی نہایت مستند اور یوسف زلیخاے جامی اس کے مقابلے میں بالکل بے وقر ہے ۔ 'سحبان العجم' کی تصنیف کے نامقبول اور ناپسند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ وہ آگ جس کے لیے فردوسی مشہور ہے ، اس مثنوی میں بالکل خاموش ہے ، نہ شاہ نامے کی متانت ، برجستگی اور جدت کا اس میں سراغ چلتا ہے ۔

شاہ نامے اور یوسف زلیخا کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم معلوم کرتے ہیں کہ دونوں کتابیں اگرچہ قریب العصر اور ایک شخص کی تصنیف ہونے کی مدعی ہیں لیکن طرز بیان اور زبان میں مختلف ہیں ۔ شاہ نامہ جن باتوں کو عموماً اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے ، مثلاً تعریف حسن ، یوسف زلیخا ان کو شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے ۔ شاہ نامے سے فردوسی کی خوبو ، مزاج ، پسند ناپسند ، اخلاق نصب العین اور سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے ۔ لیکن زلیخا میں شاعر نے اپنی شخصیت کو اس حد تک چھپانے کی کوشش کی ہے کہ باوجود تمام کتاب پڑھ چکنے کے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔

یہ ایک مسلّمہ عقیدہ ہے کہ فردوسی نے عربی الفاظ سے احتراز کر کے شاہ نامے کو خالص دری زبان میں لکھا ہے ۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں ۔ شاہ نامے میں سینکڑوں عربی الفاظ موجود ہیں ۔ فردوسی نے اس باب میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا بلکہ جس تناسب سے عربی الفاظ رودکی ، دقیقی اور دیگر معاصرین میں پائے جاتے ہیں اور جو زبانِ وقت میں رائج تھے اسی تناسب سے فردوسی کے ہاں بھی ملتے ہیں اس لیے اس بارے میں فردوسی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا ہے بلکہ قاعدہ اس کے برعکس یوسف زلیخا میں عربی لغات کا استعمال ایک بڑی حد تک افراط کے ساتھ دیکھا جاتا ہے ۔ اگر واقعی فردوسی اس نظم کا مالک ہے تو دشوار معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس طرزِ رائج الوقت کو ، جو ساٹھ ستر ہزار ابیات لکھنے کے بعد اس کی طبیعت میں بہ منزلۂ طبیعت ثانیہ جاگزیں ہو چکی ہوگی ، نغمۂ خارج از آہنگ سمجھ کر جدید روش اختیار کرتا جو کسی صورت میں نقش اول سے مستوجب ترجیح نہیں ، بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو ناقص ، کمزور اور غیر مستقل ہے ۔

فردوسی کے ہاں برخلاف دیگر اساتذہ کے اظہار کے مطالب میں تنوع ، بوقلمونی اور رنگا رنگی نہایت محدود پیمانے پر ملتی ہے ۔ جب کوئی خاص خیال اس کو بار بار ادا کرنا ہوتا ہے تو دو چار مرتبہ مختلف پیرایوں میں اظہار کے بعد اس کی قوت معنی آفرینی ختم ہو جاتی ہے ، اور آیندہ اس خیال کے ادا کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہی پرانا پیرایہ کسی قدر تبدل اور تغیر کے ساتھ یا بعینہ اسی شکل میں اختیار کر لے ۔ اس لیے تکرار شاہ نامے کے دل کش چہرے کا نہایت بد نما خال ہے ۔ یہ نقص زیادہ تر اس عصر کی زبان کی ناداری اور افلاس کی بنا پر ہے لیکن مثنوی یوسف زلیخا میں یہی خامی ایک بڑی حد تک غیر حاضر ہے ۔

یوسف زلیخا کے مقدمے میں فردوسی گویا ہے کہ میں نے

اکثر داستانیں اور پرانے قصے نظم کیے ہیں جن میں رزم بزم ، دوستی عداوت ، بلندی اور پستی سے بحث کی گئی ہے ۔ عشاق کے حالات لکھے ، معشوقوں کا تذکرہ کیا ، قصہ مختصر ہر قسم کی نظم لکھی ۔ ان مشغلوں سے اگرچہ دل کو فرحت حاصل ہوئی لیکن واقعے میں میں نے تکلیف اور گناہ کی کشت کاری کی جس سے پشیمان ہوں ۔ دل اور زبان پر سکوت کی گرہ دیتا ہوں ۔ آیندہ جھوٹے افسانے لکھ کر رنج اور معصیت کی تخم ریزی نہیں کروں گا ۔ اس لیے کہ میرے بال سفید ہو چکے ۔ فریدوں سے سیر ہوں مجھ کو کیا نفع اگر ضحاک تازی کا تخت اس نے چھینا ۔ کیقباد اور اس کی مملکت سے دل گیر ہوں اور تخت کیکاؤسی برباد ہوچکا ہے ۔ کیخسرو اور افراسیاب کی داستانیں لکھنے سے عذاب کے سوا اور کوئی پاداش نہیں مل سکتی ۔ میری اس حماقت پر جس میں نصف عمر کھو کر رستم کا نام زندہ کیا ، اگر عقلاء ہنسیں تو درست ہے ۔ سہراب اور اسفندیار سے دل خستہ ہوں کیوں کہ میرے شمشاد نما قد پر اب سوسن زار کھل آیا ہے ۔ زمانے نے میرے چہرے سے مشک چرا کر اس کے بجائے کافور خشک چھڑک دیا ہے ۔ باز سفید نے یکایک آ کر میرے کووں کو جان سے مایوس کر دیا ہے ۔ یہ باز میرے باغ میں اول ادھر اُدھر اڑتا پھرا ، پھر زاغ کی نشست گاہ کو اس نے اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا ۔ وہ کچھ ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ کبھی نہیں اڑے گا ۔ میرا خیال تھا کہ باز زاغ کی خاطر آیا لیکن میں کیوں اپنے آپ کو شبہے میں رکھوں ۔ اس کا صید زاغ نہیں بلکہ میں خود ہوں ۔ اب مجھ کو دنیا کے اشغال سے دل اٹھا کر اپنی تدبیر کرنا چاہیے ۔ دیوانوں اور نادانوں کا رویہ ترک کر کے عقل مندوں کا شعار اختیار کرتا ہوں اور بقیۃالعمر بجز نیکی اور راہ‌راست پر گام زن ہونے کے کسی اور راستے پر قدم فرسائی نہیں کروں گا ۔ داستان ملوک لکھنے سے توبہ کرتا ہوں ۔ ان کے دربار

سے سیر ہو چکا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آیندہ لغو اور فضول داستانیں ہرگز نہیں لکھوں گا ، کیوں کہ وہ قطعی غلط ہیں ۔ مستقبل میں انبیاے کرام کے قصص لکھوں گا اس لیے کہ ان کی اصل صدق پر مبنی ہے ۔ (صفحہ ۱۴ - ۱۵)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ فردوسی تائب ہو کر زندگی کا ایک نیا ورق لوٹا ہے ۔ وہ اپنے اس حصۂ عمر سے جو شاہ نامہ کی خدمت میں صرف کیا پشیمان ہے ۔ آستان ملوک اور دنیا کے اشغال سے بیزار ہو چکا ہے ۔ چناں چہ اشعار :

کنون چارهٔ بایدم ساختن
دل از کار گیتی به پرداختن
گرفتن یکی راه فرزانگان
نه رفتن به آئین دیوانگان
سر از راه واژونه برتافتم
که گم شد زمن عمر و غم یافتم
کنون گر مرا روز چندی بقاست
دگر نسپرم جز همه راه راست
نه گویم دگر داستان ملوک
دلم سیر شد ز آستان ملوک

(صفحہ ۱۵)

آخری شعر سے کم سے کم اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی کسی والی ، امیر یا پادشاہ کے واسطے نہیں لکھی ہے بلکہ مذہبی اثرات سے اثر پذیر ہو کر شاعر نے ایک دینی خدمت انجام دینے کی غرض سے لکھی ہے :

نه گویم سخن های بیهوده هیچ
به بیهوده گفتن نه گیرم پسیچ

چہ باشد سخن ہای برساختہ
شب و روز ز اندیشہ پرداختہ
ز پیغمبران گفت باید سخن
کہ جز راستی شان نبد بیخ و بن
(صفحہ ۱۵)

لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ان بیانات کی صحت کا امتحان کیا جائے ۔

فردوسی بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا جب اس نے زلیخا میں لکھا :

برین می‌سزد گر بخندد خرد
ز من خود کجا کی پسندد خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود گم کنم
جہانی پُر از نام رستم کنم
(صفحہ ۱۴)

پور زال سے فردوسی کی بغاوت کے قصے پر ہمارے کان مشکل سے یقین کر سکتے ہیں ۔ اسی رستم کے لیے شاہ نامے میں کہتا ہے :

جہان آفرین تا جہان آفرید
سواری چو رستم نیامد پدید

کسی دوسرے مقام پر گویا ہے :

کسی را کہ رستم بود پہلوان
سزد گر بماند ہمیشہ جوان

شاہ نامے کی نظم کے وقت فردوسی ان داستانوں کے لیے گویا ہے کہ تم ان کو دروغ اور افسانہ مت جانو اور واقعات کی رفتار کو اپنے زمانے کے معیار کے مطابق قیاس نہ کرو ۔ جو باتیں قرین عقل ہیں ان کو باور کرو ، باقی کی ترجمانی رمز اور ایما کے ساتھ کی جا سکتی ہے ۔

شاہ نامہ :

تو این را دروغ و فسانہ مدان
به یکسان روش در زمانہ مدان
ازو ہرچہ اندر خورد با خرد
دگر بر رہ رمز و معنی برد

اساطیر عجمیہ کی نسبت شاعر کا یہ نقطۂ نظر معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن زلیخا میں غیر ضروری سختی کے ساتھ قائل ہے :

کہ آن داستانہا دروغست پاک
دو صد شان نیرزد بیک مشت خاک
چہ باشد سخن ہای برساختہ
شب و روز ز اندیشہ پرداختہ

(صفحہ ۱۵)

یہ عام تکذیب و تردید پہلے نقطۂ نظر کے مقابلے میں نہ صرف غیرمنصفانہ بلکہ معاندانہ ہے کیونکہ شاہ نامے کا وہ حصہ جو ساسانی بادشاہوں کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے ، حقیقت میں صحیح تاریخ ہے نہ افسانہ ۔ اس کو "دروغ پاک" یا "سخن ہای برساختہ" جو محض تخیل کی امداد سے بنا لیے گئے ہوں ، کہنا صریح زبردستی اور ظلم ہے ۔

فردوسی کو شاہ نامے میں اپنی تصنیف پر ایک غیر معمولی فخر اور غرور تھا ۔ تمثیلاً سلطان محمود کو خطاب کر کے فخریہ لہجے میں یہ غیر فانی ابیات لکھتا ہے :

یکی بندگی کردم ای شہریار
کہ ماند ز من در جہان یادگار
بناہای آباد گردد خراب
ز باران و از تابش آفتاب

بنا کردم از نظم کاخ بلند
که از باد و باران نیابد گزند
(جلد دوم ، صفحہ ۲۴۵)

کسی اور موقع پر یہی جوش مفاخرت یوں ادا ہوا ہے :

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم گرم کردم بدین پارسی
(خاتمۂ شاہ نامہ قلمی ، سنہ ۷۵۲ھ)

لیکن جب توبۂ نصوح سے ذوق یاب ہو چکا ہے ، خیالات میں ایک انقلاب عظیم مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ زلیخا ، ابیات :

ازان تخم کشتن پشیمان شدم
زبان را و دل را گره بر زدم
نہ گویم کنون نامہای دروغ
سخن را ز گفتار ندهم فروغ
(صفحہ ۱۴)

ہم ان دعاوی پر صدق دل سے ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ عمر بھر عجم اور صنادید عجم کی پرستاری میں مصروف رہ کر آخری ایام میں فردوسی کے لیے زندگی کا ایک نیا ورق انبیا کی خدمت گزاری کے لیے لوٹنا تمام واقعات اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے ۔ بقول شاعر :

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

لیکن ذیل کے اشعار ہیں جو زیادہ تر ہم کو محوِ حیرت و استعجاب کرتے ہیں :

نکارم کنون تخم رنج و گناه
که آمد سپیدی بجای سیاه
(زلیخا ، صفحہ ۱۴)

دیگر

ز من دست گیتی بدزدید مشک
بجایش پراگنده کافور خشک
بر آمد ز ناگاه باز سفید
گسستند زاغانم از جان امید
زمانی همی گشت ز افراز باغ
سرانجام بنشست بر جای زاغ
نه بنشستنی کش پریدن بود
نه پیوستنی کش بریدن بود

(زلیخا ، صفحہ ۴۱)

دیگر

پر از خاک شمشاد بود از نخست
کنون بر کران سوسن تازه رست

(زلیخا ، صفحہ ۴۱)

ان اشعار کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ ہمارا شاعر بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کے بال سفید ہو گئے ہیں ۔ شاعر کے طرز بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر میں یہ انقلاب یعنی پیری کی آمد اور بالوں کا سفید ہونا ایک تازہ واقعہ ہے جو مصرع :

کنون بر کران سوسن تازہ رست

سے صاف ظاہر ہے ۔

ہم شاہ نامے میں بھی فردوسی کو بعض اوقات اپنی پیری کی شکایت میں مصروف دیکھتے ہیں ؛ مثلاً ذیل کے اشعار :

من از شصت و شش سست گشتم چو مست
بجای عنانم عصا شد بدست
رخ لاله گون گشت برسان کاه
چو کافور شد رنگ ریش سیاه

ز پیری خم آورد بالای راست
هم از نرگسان روشنائی بکاست
(جلد دوم ، صفحه ۲۴۴)

دیگر

دوگوش و دو پای من آهو گرفت
تهیدستی و سال نیرو گرفت
(جلد سوم ، صفحه ۴۵)

دیگر

دو تای شد آن سرو تازه بباغ
همان تیره‌گشت آن فروزان چراغ
پر از برف شد کوهسار سیاه
همی لشکر از شاه بیند گناه
(جلد سوم ، صفحه ۷۸)

دیگر

چو شصت و سه سالم شدوگوش کر
ز گیتی چرا جویم آئین و فر
(جلد سوم ، صفحه ۱۰۳)

دیگر

مرا در خوش آب سستی گرفت
همان سرو آزاد پستی گرفت
خروشان شد این نرگسان دژم
همی گردد از سستی و رنج نم
چل و هشت بد عهد نوشیروان
تو بر شصت رفتی نمانی جوان
(خاتمهٔ جلد سوم ، صفحه ۱۴۵ ، طبع بمبئی ، سنه ۱۲۷۵ھ)

ان متفرق اشعار سے جو اوپر منقول ہیں اور شاعر نے اپنے ساٹھ

اور چھیاسٹھ سال کی عمر کے درمیان میں لکھے ہیں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر شاہ نامے کے دوران تصنیف میں ہی بالکل ضعیف اور بوڑھا ہو چکا تھا ۔ نہ صرف اس کے بال سفید ہو چکے ہیں جو منازلِ پیری میں اولین منزل ہے بلکہ بصارت بالکل ضعیف ہو چکی ہے ۔ پیری سے قد خم ہو گیا اور کمر جھک گئی ۔ دست و پا میں رعشہ نمودار ہے اور عصا کی مساعدت کے بغیر نقل و حرکت دشوار ہے ۔ دانت گر چکے اور کانوں سے اپنی عمر کے تریسٹھویں سال ہی سے بہرا ہو گیا ہے ۔ جب شاہ نامہ ختم ہو چکا ہے ، وہ قریباً اسی سال کا ہو چکا تھا ۔ مصرع :

کنون عمر نزدیک هشتاد شد

وہ خود معترف ہے ۔

اگر مثنوی زلیخا فردوسی نے لکھی ہے تو ظاہر ہے کہ اس عمر کے بعد لکھی ہو گی اور شاہ نامے کے بعد لکھے جانے کا خود اس تصنیف کو اعتراف ہے ۔ اگر یہ صورت ہے تو یوسف زلیخا میں اس اسی بیاسی سال کے بوڑھے کو استیلائے پیری سے جو شکایت ہے تو اسی قدر ہے کہ مصرع :

کہ آمد سپیدی بجای سیاه

پیری کی اس قسم کی شکایت پچاس پچپن سالہ بوڑھے کی زبان پر بھلی معلوم ہوتی ہے ، نہ اسی پچاسی برس کے پیر فرتوت کے منہ پر ۔ تعجب ہے کہ یہ پیر ضعیف یوسف زلیخا میں پیری کی موجودگی سے اپنے میں یہی انقلاب دیکھتا ہے کہ اس کے بال سفید ہوگئے ۔ اسی مطلب کو شاعرانہ پیرائے میں ادا کیا تو کہا کہ مشک کافور بن گیا اور جدت دکھانا چاہی تو کہا کہ سیاہ زاغ کی بجائے سفید باز نمودار ہوگیا ۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا ۔

اس موقع پر ہم اصول تنقید سے کہتے ہیں کہ یہ الفاظ فردوسی کے نہیں بلکہ کسی اجنبی کے ، جو فردوسی سے بالکل مختلف ہے اور

جسے ہم نے غلطی سے فردوسی سمجھ لیا ہے ۔ ان کی عمروں کا فرق اور شاہ نامے کی داستانوں سے متعلق ان کے متناقض نظریے (جن میں ایک انھیں راست کہتا ہے ، دوسرا دروغ پاک) اسی عقیدے کی طرف ہاری رہنمائی کرتے ہیں ۔

شہادت کلام

یہ اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ واقعاتی شہادت کی رو سے کتاب یوسف زلیخا فردوسی کی تسلیم نہیں کی جا سکتی ۔ یہاں اسی مقصد کے لیے کسی اور پہلو سے بحث کی جاتی ہے ۔ اس سے ہارا مقصد شہادتِ کلام ہے ۔ شہادت کلام ہارے پاس ایک ایسا زبردست آلہ ہے جس کی رہنمائی میں ہم ایک یقینی اور قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں ۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امتداد زمانہ اور انقضاے ایام کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تغیرات واقع ہوتے ہیں ۔ سیاسی انقلاب جس طرح قوموں کی مستقبل کی تاریخ بدل دیتے ہیں اسی طرح زبان کا مستقبل بھی تغیرات سے محفوظ نہیں رہتا ۔ ہر وقت اور ہر عصر کی زبان میں مختلف نوعیت کی خصوصیت مشاہدہ کی جاتی ہے جو اس کو دوسرے ازمنہ کی زبان سے ممیز کرتی ہے ۔ جوں جوں ایک قوم تمدن اور معاشرت کے مدارج میں ارتقا حاصل کرتی ہے اس کو نئی ضروریات قدم قدم پر لاحق ہوتی ہیں ۔ نئی ضروریات ، نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات ایجاد کرتی ہیں اور جس طرح ہم پرانا لباس بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اسی طرح مندرس اور پارینہ الفاظ ایک فرسودہ سکے کی طرح ٹکسال سے خارج کر دیے جاتے ہیں ۔ زبان کی نبض شناسی کے لیے لازم ہے کہ ہم اس کے تدریجی تغیر و تبدل کی تاریخ اور الفاظ کی حقائق زیست و ممات سے بالکلیہ واقف ہوں ۔

ایک اور اصول ہے جس کا علم ہر محقق کے لیے ضروری ہے ۔

انسان جس طرح شکل ، صورت ، رنگ و لون ، اخلاق و طبائع اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اظہار خیالات اور ادائے مطالب میں ایک دوسرے سے منفرد ہیں ۔ تمثیلاً اگر ایک عہد کے دو انشا پرداز لیے جائیں جو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں ادائے مضمون ، انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں نمایاں تفاوت ہوگا ۔ باوجود اس اختلاف کے دونوں معاصروں کی تحریر میں ایک مماثلت قریبہ بھی مشاہدہ کی جائے گی جو بوجہ معاصرت دونوں میں عام ہے ، کیوں کہ ہر چیز پر خواہ وہ مصنوعات دماغی سے تعلق رکھے یا مصنوعات دستی سے ، زمانہ اپنا داغ ضرور چھوڑتا ہے ۔ اور وہ خاتم جس کو ایام نے کسی چیز پر ثبت کیا ہے اس کے نقوش نگیں کو کوئی ہاتھ نہیں مٹا سکتا ۔ اس خصوصیت کو اسالیب ایامی کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے ۔

علیٰ ہذا بعض خصوصیات اس قسم کی ہیں جو کسی خطۂ ملک میں رائج ہیں ۔ اگر مصنف اسی حصۂ ملک کا باشندہ ہے تو یہ مقامی خصوصیت اس کے کلام میں بھی پائی جائے گی ؛ مثلاً ہم شاہ نامے میں دیکھتے ہیں کہ فردوسی نان بائی کو نانوا ، ساربان کو ساروان اور برزیگر کو ورزیگر اور پیش باز کو پیش واز لکھتا ہے ۔ اس سے ہم یہ قیاس مرتب کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ فردوسی اور اس کے ہم وطنوں میں یہ الفاظ بائے ابجد کو واو ہوز سے بدل کر تلفظ کیے جاتے تھے ۔ اس خصوصیت کا نام اسالیبِ مقامی رکھا جا سکتا ہے ۔

ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ ہر مصنف ، خواہ وہ کسی پایہ کا کیوں نہ ہو ، الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے ۔ اس ذخیرے میں بعض الفاظ ، تراکیب ، محاورات ، کنایات ، تشبیہات ، صفات اور استعارات اس

قسم کے ہوں گے جو مصنف کے نزدیک زیادہ مقبول اور مطبوع ہوں گے ۔ اس بنا پر ان کا استعمال بالارادہ یا بلا ارادہ تحریر میں زیادہ کرے گا کیوں کہ وہ اس کے روزمرہ میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ سرمایہ اس کی تحریر کا اسلوبِ خصوصی ہے ۔

جس طرح ایک مصور کسی شخص کی تصویر میں اس کی ظاہری شکل و صورت اور خط و خال رنگوں کے ذریعے سے دکھا سکتا ہے ، اسی طرح ایک منتقد کسی مصنف کی ان تمام خصائص کی جو اس کی تصنیف کے مخصوصی خط و خال ہیں ، سراغ رسانی کر سکتا ہے اور اس سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیے ۔ کسی شاعر کا قول ہے :

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فرد دفتر احوال صاحب خانۂ

جب صاحب بصیرت کے نزدیک ایک خشت دفتر احوال کی ایک فرد ہے تو ایک کتاب جو مصنف کے دل و دماغ کا عکس ، خیالات ، معلومات اور مقولات کا آئینہ ہے اور جس میں اس نے اپنی شخصیت کی تمثال کو الفاظ کے جامے میں یادگار چھوڑا ہے ، نظر امعان میں اس صاحب تصنیف کی ہستی کو مشخص اور اس کے وجود کو دوسرے افراد سے جداگانہ شخصیت تسلیم کروانے کے لیے کیا قابل اعتبار شہادت نہیں بن سکتی جس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرہ حقیقت میں بجائے خود ایک تاریخ ہے ؟

جب ایک ماہر آثار قدیمہ کسی شکستہ و ریختہ عمارت پر نظر ڈال کر اس کی عمومی وضع ، محرابوں کی ہیئت ، گنبدوں کی ساخت ، ستونوں کی نقاشی و نقاری ، چھت اور دیواروں کی گل کاری اور نقش و نگار سے اس کی تعمیر کا صحیح زمانہ قائم کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک محقق کسی کتاب کے مقالات ، کنایات اور محاورات کو دیکھ کر اس کے عہد تصنیف کا سراغ نہ لگا سکے ۔

قصہ مختصر شہادت کلام سے استفادے کی خاطر ہم کو اس نظر سے یوسف زلیخا کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کا مختصر خاکہ اوپر درج ہے۔ سب سے مقدم زلیخا کے خصوصی خط و خال دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور حتی‌الامکان شاہ نامے سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

اس مضمون کے دوران میں یوسف زلیخا اور شاہ نامے کے جن نسخوں سے میں نے کام لیا ہے وہ ذیل کے مطابع سے تعلق رکھتے ہیں:

(۱) یوسف زلیخائے حکیم فردوسی مصور۔ طبع ایران۔ دارالطباعہ خاصہ مدرسہ مبارکہ دارالفنون طہران سنہ ۱۲۹۹ ھ۔

(۲) شاہ نامہ فردوسی۔ طبع میرزا محمد باقر۔ بمبئی۔ سنہ ۱۲۷۵ھ۔

اسالیب خصوصی

گوش داشتن بمعنی گوش کردن و متوجہ شدن و کنایہ از نگہ داشت و حفاظت۔ شاہ نامے میں پہلے معنوں میں عام طور پر رائج ہے۔

ذیل میں چند امثال مرقوم ہیں۔ شاہ نامہ:

(۱) بگشتاسپ گفت ای پسر گوش دار
که تندی نه خوب آید از شهریار
(جلد دوم، صفحہ ۲۷۹)

(۲) که ای مادر مهربان گوش دار
که ما بی‌گناهیم زین کار زار
(جلد چہارم، صفحہ ۳۳)

(۳) بدین گفت من گوش دارید پاک
روانرا نخواهید جای مغاک
(جلد سوم، صفحہ ۶۰)

(۴) بگودرز من سر بسر گوش دار
پذیرنده باش و بدل هوش دار
(جلد سوم ، صفحہ ۵۸)

ان امثال میں نگہ داشت کے معنی دیتا ہے :

(۵) سلاح سواران جنگی بپوش
بجان و تن خویشتن دار گوش
(جلد اول ، صفحہ ۵٦)

(٦) بشد با بنہ اشکش تیز هوش
کہ دارد سپہ را بهر جای گوش
(جلد دوم ، صفحہ ۲۱۷)

لیکن اس شعر میں منتظر رہنے کے معنوں میں آیا ہے :

(۷) نباید کہ جوید کسی جنگ و جوش
برهام گودرز دارید گوش
(جلد دوم ، صفحہ ۲۵۰)

گزشتہ دو امثال کے سوا گوش داشتن شاہ نامے میں حفاظت کے معنی نہیں دیتا ۔ زلیخا میں وہ کنایہ بن کر عام طور پر حفاظت اور نگہداشت کے معنی دیتا ہے ۔ زلیخا ۔ امثال :

(۱) نباید ورا چون شها گوش دار
کہ خود گوش دارد ورا کردگار
(صفحہ ۱۷۰)

(۲) کہ او را بجان گوش داریم پاک
بجان و دل و دیده داریم پاک
(صفحہ ۴۸)

(۳) گر ایزد بدین نوبہ یاری کند
ترا و مرا گوش داری کند
(صفحہ ۷۸)

(۴) من این پیرهن گوش دارم کنون
نشویم زوی هرگز این تیره خون
(صفحہ ٦٦)

نظامی :

بزرگان در آن حال دارند گوش
وگرنہ دل پایدار و نہ گوش
(سکندر نامۂ بحری ، صفحہ ۵۸ ، مطبع نول کشور)

سعدی :

ہمہ سنگہا گوش دار ای پسر
کہ لعل از میانش نباشد بدر
(بوستان ، صفحہ ۱٦۰ ، مطبع رفاہ عام)

مرزبان نامہ : "گفت ای ھد ھد این جا کہ نشستۂ گوش بخود دار و متیقظ باش کہ این جا کمین گاہ یغمائیان قضاست ـ"
(صفحہ ۱۱۱ ، مطبوعہ بریل ، سنہ ۱۹۰۹ع)

اس مطالعے سے ہم کو اس قدر علم ہوا کہ فردوسی جب کہ اس کنائے کا عادی نہیں ہے ، صاحب زلیخا کے ہاں وہ روزمرہ بن کر بالعموم مستعمل ہے ـ گوش داشتن کوئی ایسا کنایہ معلوم نہیں ہوتا جو اساتذہ کے ہاں مقبول ہو ـ سنائی کے ہاں جب کہ حدیقہ میں مطلق غیر حاضر ہے ، نظامی اور سعدی کے ہاں صرف ایک ایک مثال میں ملتا ہے ـ

گرہ برزدن : یہ محاورہ شاہ نامے میں اس کے لغوی معنوں میں ملتا ہے ـ شعر :

دو دست از پس پشت بستش چوسنگ
گرہ زد بکردنش بر پالهنگ
(جلد سوم ، صفحہ ۱۸)

اسدی : بر آهیخت خرطوم پیل از زره
به پیچیده چون زشته برزد گره
(صفحه ۳۳ ،گرشاسپ نامه ، طبع آقا محمد شیرازی ، سنه ۱۳۰۷ھ)
یوسف زلیخا میں وہ کنایہ بن کر خاموش ہونے کے معنی دیتا ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) ازان تخم کشتن پشیمان شدم
زبان را و دل را گره برزدم
(صفحہ ۱۴)

(۲) چو شمعون به پرداخت این داستان
زبان را گره زد هم اندر زمان
(صفحہ ۱۶۵)

(۳) ولیکن تو گفتی به عمدا کسی
همی بر زبانم گره زد بسی
(صفحہ ۱۴۴)

گمان زدن : بمعنی گمان کردن ۔ یہ زلیخا کی شان خصوصیت ہے کہ اس میں گمان زدن ملتا ہے ۔ فردوسی شاہ نامے میں اس سے ناواقف ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) تو گفتی همی زد دلش را گمان
که آید بلا ها زمان تا زمان
(صفحہ ۴۸)

(۲) گمان زد دلم ای شه کامیاب
که بنویسی آن نامه ام را جواب
(صفحہ ۱۹۷)

(۳) گمش دل بدان سان همی زد گمان
که وی را بکشتند جای نهان
(صفحہ ۶۸)

(۴) گمان زد دل پاک وی کین پسر
ز نیکان شایستہ دارد گہر
(صفحہ ۹۵)

فردوسی ایسے موقعوں پر گمان کردن اور گمان بردن لاتا ہے جو زلیخا میں بھی آتے ہیں۔

دل برگماردن : شاہنامے میں غیر مستعمل ہے اور زلیخا سے امثال ذیل :

(۱) ایا مادر مہربان زینہار
یکی گوش و دل را بمن برگمار
(صفحہ ۸۳)

(۲) کنون گوش بر حال یعقوب دار
زمانی دل و ہوش دل برگمار
(صفحہ ۶۴)

(۳) بدو گفت کای پر ہنر شہریار
دمی دل برین داستان برگمار
(صفحہ ۱۵۴)

(۴) ایا ای پدر دل برین برگمار
تامل کن اندر نہان و آشکار
(صفحہ ۱۹۱)

فردوسی ایسے موقعوں پر نگہ کن ، بژرفی نگہ کن ، گوش دار یا پہن بکشای گوش لاتا ہے۔

آئین بستن : زلیخا میں رائج ہے۔ امثال :

(۱) بہ‌بستند آئین بازار ہا
ہمہ شہر شد ہم چو گلزار ہا
(صفحہ ۲۱۰)

(۲) چو آئین ها بستہ شد در سرای
نکم بد سرا از ِشت خدای
(صفحہ ۲۲۲)

شاہ نامے میں اس کے بجائے 'آذین بستن' کا رواج زیادہ دیکھا جاتا ہے ۔ شاہ نامہ :

(۱) چو نزدیک شہر اندر آمد سپاہ
بہ‌بستند آذین بہ بیراہ و راہ
(جلد دوم ، صفحہ ۲٦۳)

(۲) بہ بستند آذین بہ شہر و براہ
ہمہ برزن و کوی و بازارگاہ
(جلد دوم ، صفحہ ۲٦٦)

(۳) بہ بستند آذین بہ شہر اندرون
پر از خندہ لبہا و دل پر ز خون
(جلد سوم ، صفحہ ٦۱)

(۴) بہ بستند آذین بہ شہر و براہ
کہ شاہ آمد از دشت نخچیرگاہ
(جلد چہارم ، صفحہ ۱۰۴)

(۵) بہ بستند آذین بہ شہر و براہ
درم ریختند از بر دخت شاہ
(جلد چہارم ، صفحہ ۲۳)

گرمی نمودن : گرم جوشی کا اظہار کرنا ۔ شاہ‌نامے سے یہ محاورہ مفقود ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) بشد مرد بسیار گرمی نمود
بجا آورید آنچہ فرمودہ بود
(صفحہ ۱٦۱)

(۲) هزاران لطف کرد و گرمی نمود
ابر مہر دوشین فراوان فزود
(صفحہ ۲۶)

(۳) فراوان بہ پرسید و گرمی نمود
دلش را بدو مہربانی فزود
(صفحہ ۲۱۸)

صورت بستن : شاہ نامے میں نہیں ملتا ۔ زلیخا سے یہ امثال :

(۱) خریدنش را بست صورت عزیز
بہ چندان کہ بودش ز ہر نوع چیز
(صفحہ ۹۴)

(۲) مکن ای پدر صورت بد مبند
ز ما بر برادر نیاید گزند
(صفحہ ۱۷۱)

(۳) کہ صورت ہمی بندم اندر میان
کہ هست آن دلارام من درجهان
(صفحہ ۱۹۸)

قابوس نامہ : ''و لیکن من چندان کہ صورت بندد بگویم و سامان هر یک بتو نمایم ۔''
(باب سی و یکم در طالب علمی و فقیہی ، صفحہ ۱۴۲ ، طبع ایران)
مرزبان نامہ : ''و بوقت گزشتن ازین منزل انقطاع و جدائی او صورت نہ بندد ۔''
(باب سوم داستان ملک اردشیر و دانای مهران بہ ، صفحہ ۲۷)

تخت زدن : زلیخا میں عموماً مستعمل ہے اور تمام شاہ نامے میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) میان جای میدان زدہ تخت زر
عزیز از سر تخت با تاج زر
(صفحہ ۹۲)

(۲) زدندی یکی تخت زرین بدان ،
نشستی بر آن یوسف کامران
(صفحہ ۱٦۰)

(۳) یکی تخت زرین میانش زدہ ،
سرو پای آن تخت بر مہ زدہ
(صفحہ ۱٦۸)

(۴) زدہ تخت زرین گوہر فگند
قدمہاش چون قدر شاہان بلند
(صفحہ ۱۷۴)

شاہ نامہ :

میان سراپردہ تختی زدہ
ستادہ غلامان بہ پیشین ردہ
(جلد اول ، صفحہ ۴۹)

اسدی :

یکی تخت پیروزہ ہم رنگ نیل
زدہ پیش تخت ایستادہ دو پیل
(گرشاسپ نامہ ، صفحہ ۳۰ ، طبع آقا محمد شیرازی ، سنہ ۱۳۷۰ھ)

کلہ[1] زدن : باثانی مشدد ، سقف و پردہ زدن ۔ شاہ نامے میں

---

۱ ۔ ''کلہ بمعنی خانہ ای کہ از پارچۂ نازک سازند مانند پشہ بند ۔ ہم بمعنی چادر و خیمہ ۔ از سعدی :

''تو کہ بشنوی نالۂ داد خواہ
بکیوان زدہ کلہ و بارگاہ

از خاقانی :

صبح دم چون کلہ بندد آہ دود آسای من
چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من''

(فرہنگ شاہنامہ ، از ڈاکٹر رضا زادہ شفق ، صفحہ ۲۲۲) (مرتب)

نہیں ملتا اور زلیخا میں ملتا ہے - امثال از زلیخا :

(۱) زدہ کلہ و تاج گوہر نگار
بر آئین در آویختہ شاہوار
(صفحہ ۱۷۶)

(۲) زدہ کلہ بالای شاہانہ تخت
نشستہ برو یوسف نیک بخت
(صفحہ ۲۲۲)

اگرچہ شاہنامہ اس محاورے سے نابلد ہے ، اسدی کے ہاں ملتا ہے - چناں چہ :

رسیدلد زی آبگیری فراز
زدہ کلہ زربفت ازوی فراز
(گرشاسپ نامہ ، صفحہ ۴۱)

دیگر

(۲) زدہ کلہ بر کشتہ کرگس ز ابر
طمع کردہ روبہ بخون هزبر
(صفحہ ۶۴)

مسعود سعد سلمان :

بدر و گوهر آراستہ پدید آمد
چونوعروسی درکلہ از میان حجاب

حکیم سنائی غزنوی :

دست انصاف تا تو بکشادی
این جهان بست کلۂ شادی
(حدیقۂ سنائی ، صفحہ ۶۹۷ ، مطبع نول کشور)

عتاب برداشتن : شاہ نامے سے غیر حاضر ہے - زلیخا سے دو امثال :

(۱) چنین گفت یوسف علیه السلام
که برداشتیم آن عتاب و کلام
(صفحه ۲۰۲)

(۲) شنیدم که یوسف سبک خواست خوان
چو برداشت او آن عتاب از میان
(صفحه ۲۰۳)

غریویدن : لغات میں شور و غوغا نیز فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ زلیخا میں مطاق رونے کے معنوں میں آتا ہے ۔
امثال از زلیخا :

(۱) بمہر دلش تنگ در بر گرفت
وزان بس غریویدن اندر گرفت
(صفحہ ۵۰)

(۲) زمانی غریوید و بارید خون
بر آن چهره پر چین دینار گون
(صفحه ۲۱۸)

(۳) پس آمد غریوان به بنگاه باز
دلش بی شکیب و تنش در گداز
(صفحه ۵۲)

(۴) غریویدن آن فروزان چراغ
همی کرد یعقوب را دل بداغ
(صفحه ۳۷)

(۵) فراوان غریوید و نالید زار
ازان خواب واژونهٔ نابکار
(صفحه ۴۳)

(٦) غریویدن و زاری اندر گرفت
ز ہرگونہ نوحہا بر گرفت
(صفحہ ۵۸)

(۷) غریوید یوسف دگر بارہ زار
بغلطید بر خاک رہ زار و خوار
(صفحہ ۵۹)

یاد رہے کہ صاحب یوسف زلیخا اس لفظ کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہے اور اسی لیے اس کا استعمال کثرت کے ساتھ کرتا ہے ۔ شاہ نامے میں وہ اول تو قلت کے ساتھ ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو محض شور ، للکار یا فریاد کے معنی دیتا ہے ۔ امثال شاہ نامہ :

(۱) غریویدن مرد و غرندہ کوس
ہمی کرد بر رعد غران فسوس
(صفحہ ٦۰ ، جلد اول)

(۲) غریویدن آمد ز توران سپاہ
ز سر برگرفتند گردان کلاہ
(صفحہ ۲۲۷ ، جلد دوم)

(۳) وزان پس زہم روی برکاشتند
غریویدن و بانگ برداشتند
(صفحہ ۲۳٦ ، جلد دوم)

(۴) سبک دشتبان گوشہا بر گرفت
غریوان ازو ماند اندر شگفت
(صفحہ ٦۸ ، جلد اول)

افعال متعدی بیک مفعول :

زلیخا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض افعال جو عموماً متعدی بیک مفعول لائے جاتے ہیں ، متعدی بدو مفعول باندھے

گئے ہیں - بعض تمثیلیں یہاں درج ہیں -

پوشیدن : بمعنی پوشانیدن - زلیخا سے امثال :

(۱) بہ پوشید آن جامہ فرزند را
بشانہ زد آن موی دل بند را
(صفحہ ۵۱)

(۲) درو جامہ پوشید دیبای روم
کہ چون نقش مانی بدش نقش بوم
(صفحہ ۸۷)

لیکن شاہ نامے میں تن ڈھانکنے کے معنوں میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے :

تنش را یکی پہلوانی قبا
بہ پوشید و از کوہ بگزارد پای
(صفحہ ۲۹ ، جلد اول)

پرهیزیدن : بجائے پرهیزانیدن - زلیخا امثال :

(۱) کہ این بندہ را اندرین قعر چاہ
بہ پرهیز و از آب دارش نگاہ
(صفحہ ۶۲)

(۲) مکن یاوہ نام و نشان مرا
بہ پرهیز جان و روان مرا
(صفحہ ۱۱۵)

(۳) بہ پرهیز از اهرمن بیرهم
همی داردست از بدی کوتهم
(صفحہ ۲۲۴)

شاہ نامے میں یہ صورت نامعلوم ہے -

شنیدن : بجائے شنوانیدن - زلیخا :

بہ شک بود یعقوب فرخ سیر

سرانجام پرسید زان پرهنر

کہ یوسف چو بشنید پیغام خویش

نشانیت بنمود ز اندام خویش

(صفحہ ۱۰۶)

شاہ نامے میں یہ صورت نہیں ملتی -

اسالیب مقامی :

خرید و فروش : بجائے خرید و فروخت - زلیخا - شعر :

بدینسان خرید و فروش اوفتاد

ستد یوسف و آن درمہا بداد

(صفحہ ۷۶)

فردوسی خرید و فروخت لاتا ہے - شاہ نامہ :

(۱) همی بود چندی خریدو فروخت

بیابان ز لشکر همی بر فروخت

(صفحہ ۲۲ ، جلد سوم)

(۲) پرازخوردودادو خریدوفروخت

توگفتی‌زمان‌چشم ایشان بدوخت

(صفحہ ٦۲ ، جلد دوم)

قابوس نامہ :"بندہ کہ بہرکاری فروخت خواهد و از خرید و فروخت خویش عیب نہ دارد دل بروی منہ کہ از وی فلاح نیاید -"

(باب بست وسیم در بندہ خریدن ، صفحہ ۱۰۹)

سعدی : بریدند ازان جا خرید و فروخت

زراعت نیامد رعیت بسوخت

(بوستان ، صفحہ ۷۲ ، مطبع رفاہ عام)

پرس بجائے پرسش - زلیخا :

چو یعقوب فرخ بہ پرس و درود
ابا ابن یامین سخن گفتہ بود
(صفحہ ۲۰۹)

طلحہ مروزی : چون صبر رسیدہ شد پیام تو چہ سود
جان رفت ز پرسش و سلام تو چہ سود

شاہ نامے میں پرسش اگرچہ رائج ہے لیکن موجودہ صورت قطعی غیر حاضر ہے ۔

بند و کشای : بجائے بندوکشاد یا بست و کشاد ۔ شاہ نامے میں ان تینوں صورتوں میں سے ایک بھی نہیں ملی ۔ پہلی صورت زلیخا میں ملتی ہے ۔ امثال :

(۱) ز سختی و سستی و بند و کشای
کہ دیدند پیغمبران خدای
(صفحہ ۱۵)

(۲) تن و جان سپردم بحکم خدای
بہ سخت و بہ سست و بہ بند و کشای
(صفحہ ۷۸)

(۳) چنین تا بہ تقدیر حکم خدای
کہ بی حکم او نیست بند و کشای
(صفحہ ۲۲۲)

بند و کشاد کی مثال میں انوری کا شعر دیا جاتا ہے :
زمانہ ملکی کز مہر خاتمش در ملک
ہزار بند و کشاد و ہزار برگ و نواست

مثال بست و کشاد ۔ مرزبان نامہ :

''کاہلی و خامی را خورسندی مخوان کہ نقش عالم حدوث در کارگاہ جبر و قدر چنین بستہ اند کہ تا تو در بست و کشاد کارہا میان جہد نہ بندی ترا ہیچ کار نہ کشاید ۔''

داد خواہ : بمعنی داد پسند ، اے خدائے تعالیٰ - ان معنوں میں شاہ نامے میں نہیں ملتا - زلیخا سے امثال ذیل :

(۱) من اول خطا کردم ای دادخواہ
مقرم بدان کار زشت و گناہ
(صفحہ ۲۱۶)

(۲) بدان پایگاہ و بدین دست گاہ
سپردی بمن بازش ای دادخواہ
(صفحہ ۲۱۶)

(۳) ہمی ترسم از داور دادخواہ
کہ ہرگز نیاسزدم زین گناہ
(صفحہ ۱۲۶)

شاہ نامے میں فریادی کے معنی دیتا ہے - امثال :

(۱) ہمی راہ جویند نزدیک شاہ
ز راہ دراز آمدہ دادخواہ
(صفحہ ۲۰۵ ، جلد دوم)

(۲) ز خویشان کاموس چندین سپاہ
بہ نزدیک خاقان شدہ داد خواہ
(صفحہ ۱۸۹)

خواربار[۱] : لغات[۲] میں اس کے معنی 'خوراک اندک' دیے ہیں - شاہ‌نامے میں اس لفظ کی تلاش بے سود ثابت ہوئی - اس سے ظاہر ہے

۱ - ''خوار بار یا خواروبار بمعنی ارزاق و مواد غذائی - درکتابہای قدیم مانند سفرنامہ ناصر خسرو استعمال شدہ و فرہنگستان ایران آن را احیاء کردہ -''
(فرہنگ شاہنامہ ، ڈاکٹر رضا زادہ شفق ، صفحہ ۱۲۱)
(مرتب)

۲ - برہان قاطع - (حاشیہ مصنف)

کہ فردوسی اس سے نا واقف تھا ۔ عطا بن یعقوب الکاتب ، جو قرن پنجم کے منتصف دوم کا شاعر اور سلطان ابراہیم غزنوی کا مادح ہے ، لکھتا ہے :

آن کہ نامش خوار بار و زیر بارش خلق خوار
خورد چون دندان مار و کردہ شہری چون سلیم

(لباب الالباب محمد عوفی ، باب ششم ، صفحہ ۷۵ ، طبع بریل)

برہان الاسلام تاج الدین عمر بن مسعود مقتول سنہ ۶۰۵ ہجری:

من خود عزیز بارایم خوار بارگیر
آخر نہ گاؤ بہ بود از خوار بار دور

(لباب ، باب ہفتم صفحہ ۱۷۵ ، حصہ اول)

زلیخا میں یہ لفظ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) دہم خواربار و کنم نیکوی
نہ گردم بہ گرد در بدخوی
(صفحہ ۱۹۹)

(۲) دہم تان ازین بیشتر خواربار
گل سرخ تان بشگفانم ز نار
(صفحہ ۱۶۶)

(۳) ز کنعان کشیدیم لختی جہاز
کزین خوار بارست مارا نیاز
(صفحہ ۱۶۱)

(۴) یکی دانہ تان ندہم از خوار بار
کنم تان برون از در مصر خوار
(صفحہ ۱۶۹)

(۵) خبر یافتیم از تو ای شہر یار
کہ داری بمصراندرون خوار بار
(صفحہ ۱۶۴)

اسالیب ایامی

ملکت : بمعنی مملکت فی زماننا متروک ہے ۔ شاہ نامے میں غیر رائج ہے ، اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ سلجوق دور میں اس کا رواج پھیلا ۔ اس عہد کے شعرا منوچہری ، معزی ، عثمان مختاری ، حکیم سنائی اور عمعق بخاری وغیرہ وغیرہ کے ہاں ملتا ہے ۔ بعض امثال حوالۂ قلم ہیں :

منوچہری :

آفتاب ملکت سلطان کہ دست جود او
خواهد او را کز میان خلق بی‌همتا کند

امیر معزی ۔ مصرع :

مویدی کہ موید بدوست ملکت شاہ

حکیم سنائی :

شاہ عادل ، نکونیت دستور
ملکت آباد دست ظالم دور
(حدیقہ ، صفحہ ۷۷۸ ، طبع نول کشور)

حدیقہ میں یہ لفظ کثرت سے ملتا ہے ۔ استاد عمعق بخاری :

کنون شد این مثل ای پادشا مرا معلوم
بامتی کہ هلاک ست و ملکتی کہ هباست
(لباب ، حصہ دوم ، باب دهم ، صفحہ ۱۸۵)

مثنوی یوسف زلیخا سے یہ مثال پیش ہے :

گرفتم دل از ملکت کیقباد
همان تخت طاؤس کے برد باد
(مقدمۂ زلیخا ، صفحہ ۴۱)

غریو و غرنگ[1] : یا بالعکس بمعنی گریہ و زاری ـ شاہنامے میں اس کا سراغ نہیں چلتا ـ

اسدی :

بہ گفت این و شد با غریو و غرنگ
بہ لالہ ز لولو همی شست رنگ

(ملحقات شاہ نامہ ، صفحہ ۸ ، طبع بمبئی ، سنہ ۱۲۷۵ھ)

ازرق :

موافق تو کند در صعود و ناز طرب
مخالف تو کند در غمان غریو و غرنگ

(لباب الالباب ، حصہ دوم ، باب دهم ، صفحہ ۹۹)

زلیخا میں کئی مقام پر ملتا ہے ـ امثال از زلیخا :

(۱) نہ شد کور آدم بہ چندان درنگ
کہ بد سال و مہ با غریو و غرنگ
(صفحہ ۴۲)

(۲) شتابان شتر در بیابان چو دیو
دل یوسف اندر غرنگ و غریو
(صفحہ ۸۱)

---

۱ ـ "از همان ریشہ غرو غریو است بمعنی صدا و نالہ ـ
از ظهیر فاریابی :

بہ پیش خسرو روی زمین بر آرم بانگ
چنانچہ در دل گردون فتد غریو و غرنگ

غریدن ، غران ، غرغر ، غریو از همان اصل است ـ از عنصری :

تیز شد عشق و در دلش پیچید
جز غریو و غرنگ نسپچید"

(از فرهنگ شاهنامہ تالیف ڈاکٹر رضا زاده شفق ، صفحہ ۲۰۰)
(مرتب)

(۳) ورا دید جفت غریو و غرنگ
نہ در دل شکیب و نہ در چہرہ رنگ
(صفحہ ۱۲۰)

(۴) کہ این نالہ و زاری از بہر چیست
غریو و غرنگ تو از بہر کیست
(صفحہ ۱۲۰)

(۵) ہمہ روز بد با غریو و غرنگ
دلش تنگ و عالم بدو گشتہ تنگ
(صفحہ ۱۱۶)

'از بہر چیزی یا کسی را' ایک اور صورت ہے جس سے ہم شاہ نامے میں روشناس نہیں ہوتے اور زلیخا میں دو چار ہوتے ہیں -

امثال از زلیخا :

(۱) تو بپذیر ازو یوسف خوب را
ہمی دارش از بہر یعقوب را
(صفحہ ۳۷)

(۲) من ای روشنائی ز بہر چرا
بہ باید ہمی آزمودن ترا
(صفحہ ۱۱۴)

قابوس نامہ :

"دو دانگ ذخیرہ کن از بہر روز ضرورت را و پشت بر وی کن و بہر خللی از وی یاد میار -"
(باب بست و یکم در جمع کردن مال ، صفحہ ۹۶)

حکیم سنائی :

یا رب این خربطان عالم را
کم کن از بہر عز آدم را
(حدیقہ ، صفحہ ۱۴۹)

سنائی کے ہاں یہ محاورہ بہت مقبول ہے ۔
عبدالواسع جبلی :

هر روز بامداد ز بهر مرا نهی
از مشک سوده برسمن تازه خالها
(لباب ، باب دہم ، صفحہ ۱۰۸ ، حصہ دوم)

'لطف' بہ تحریک اول و ثانی بقاعدۂ تفریس درست ہے : چناں‌چہ منو چہری : ع

از لطف هر چه کند با تو سزای تو کند

اور ادیب صابر :

قطب فضل و فلک دولت و مجموع علوم
قبلۂ همت و حلم و لطف و جود و کرم

مثال از زلیخا :

فراوان لطف کرد و گرمی نمود
ابر مهر دوشین فراوان فزود
(صفحہ ۲۶)

'عفو' بروے تفریس بفتح اول و ضم ثانی ۔ یوسف زلیخا دونوں تلفظ سے واقف ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) وگر راست گوئید با من سخن
عفو تان کنم کردهای کهن
(صفحہ ۱۴۷)

(۲) صلاح جهان را ازو خواستی
تن خویشتن را عفو خواستی
(صفحہ ۱۵۲)

(۳) عفو کردمت زان گناه عظیم
بحاجت بخواهم ز رب عظیم
(صفحہ ۲۰۷)

(۴) ایا داد فرهنگ با بیخ و بن
عفو کن مرا زین برهنه سخن
(صفحه ۱۱۶)

سعدی :

عفو کردم از وی عمل‌های زشت
در آرم ز فضل خودش در بهشت

فردوسی اول تو شاہ نامے میں اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو قاعدۂ تفریس سے نابلد ہے اور صحیح تلفظ سے لکھتا ہے ۔ شاہ نامہ :

بکن عفو یا رب گناه ورا
بیفزای در حشر جاه ورا
(دیباچہ ، صفحہ ۳)

'عمداً' بسکون ذوم ۔ استاد عمعق بخاری :
اے صنوبر قد ندانی تو چگونہ فتنہ'
یا همی‌دانی بعمداً خویشتن نادان کنی
(لباب ، حصہ دوم ، باب دهم ، صفحہ ۱۹۰)
حکیم ضیاءالدین محمود الکابلی ۔ شعر :
بگاه حلم عمداً از نهیب ضربت عدلت
بریزد زهر از مار و بیفتد نیش از کژدم
(لباب ، حصہ دوم ، باب یازدهم ، صفحہ ۲۱۴)
زلیخا میں ایک مقبولہ روزمرہ بن گیا ہے ۔ زلیخا :
(۱) بعمداً همی تاختندش براه
باندک زمان پای وی شد تباه
(صفحہ ۵۳)

(۲) بعمداً سوی سقف کردش نگاه
همان سیم تن دید چون مہروماہ
(صفحہ ۱۲۵)

(۳) و لیکن تو گفتی بعمداً کسی
همی بر زبانم گره زد بسی
(صفحہ ۱۴۴)

شاہ نامہ نہ صحیح اور نہ مفرس لاتا ہے ۔

'عماری' زلیخا اگرچہ صحیح تلفظ سے باخبر ہے حرف دوم کو مشدد بھی باندھا ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) یکی کاروان ساخت چون نو بہار
ز بس مہد و عماریِ زرنگار
(صفحہ ۲۰۸)

(۲) زنان شان بعماری اندر همہ
عماری بزر و بزیور همہ
(صفحہ ۲۰۹)

(۳) کہ از مہد و عماری زرنگار
شود خیره چشم و دل روزگار
(صفحہ ۲۰۷)

شاہ نامے میں عماری کا ذکر اگرچہ پچاسوں مقام پر آیا ہے لیکن مشدد کی ایک مثال بھی دستیاب نہیں ہوئی ۔ شاہ نامہ :

(۱) عماری پسیچید و دیبا جلیل
کنیزک بہبردند چینی و خیل
(صفحہ ۲۶ ، جلد سوم)

(۲) عماری چہل جملہ از سیم و زر
بدو اندرون لعبت سیم بر
(صفحہ ۲۰۶ ، جلد دوم)

(۳) عماری بسیچید و رفتن براہ
سر آن خفتہ را اندرون جایگاہ
(صفحہ ۲۰۷ ، جلد دوم)

(۴) عماری بماہ نو آراستہ
پس پشت او اندرون خواستہ
(صفحہ ۷۶ ، جلد اول)

(۵) عماری بسیچید و آمدہ براہ
نشستہ بدو اندرون جفت شاہ
(صفحہ ۱۴۳ ، جلد سوم)

زلیخا کے دوران میں عماری کا نیا تلفظ فردوسی کے لیے سیکھنا قابل استعجاب ہے۔

'مشاطہ' بلا تشدید دوم ۔ شاہ نامے میں فردوسی اس لفظ سے واقف نہیں ۔ امثال از زلیخا :

(۱) زیعقوب وزھر کس اندر نہفت
مشاطہ بلیبا فرستاد و گفت
(صفحہ ۲۵)

(۲) مشاطہ شد آراست آن ماہ را
ھمان مہربان دخت دل خواہ را
(صفحہ ۲۵)

اسدی :

همیدون تموز و دیش چاکرست
بهارش مشاطہ خزان زرگرست
(صفحہ ۶ ، گرشاسپ نامہ)

مسعود سعد سلمان :

مگر مشاطۂ بستان شدہ است باد و سحاب
کہ این بہ بستش پیرایہ وان کشاد نقاب

حکیم سنائی :

خرد آمد مشاطهٔ جانت　　خرد آمد چراغ ایمانت

(حدیقه ، صفحه ۳۴۶)

'میشوم' بمعنی شوم ، مشئوم کی بگڑی شکل ہے ۔ شاہ نامے میں نا معلوم ہے اور زلیخا سے امثال ذیل :

(۱) ازان روز میشوم کان بد خبر

شنیدم بگوش دل و هوش سر

(صفحه ۱۷۳)

(۲) ازان روز میشوم و تاریک وبد

که مهجور شد یوسف با خرد

(صفحه ۱۷۳)

قابوس نامه :

"و باشد که نه چنین بود ولیکن میشوم بود و صاحب کش بود"

(باب بست و پنجم در چهار پای خریدن ، صفحه ۱۱۳ ، طبع طهران)

سنائی غزنوی :

کان که گوید منم شده معصوم

اوست بر نفس خویشتن میشوم

(حدیقه ، صفحه ۴۴۴، نول کشور)

'نکوئی' بمعنی حسن و جمال ۔ ان معنوں میں شاہ نامے میں یہ لفظ غیر مستعمل ہے اور زلیخا میں بالعموم ملتا ہے ۔ امثال زلیخا :

(۱) ترا هست چندان جمال و کمال

نکوئی و کشی و غنج و دلال

(صفحه ۱۱۶)

(۲) نکوئی سپاهست و شاهش توئی
زمین آسمان ست و ماهش توئی
(صفحہ ۱۱۷)

(۳) دو صد بار زان‌خوب‌ترگشته‌بود
نکوئیش ز اندازه بگزشته بود
(صفحہ ۹۷)

سنائی غزنوی :
رفت وقتی زن نکو در راه
شده از کارهای مرد آگاه
(حدیقہ ، صفحہ ۳۷۹)

'کاریگران' زلیخا میں ملازمین اور چاکروں کے معنوں میں آتا ہے۔

زلیخا :

(۱) ازان شادمانی هم اندر زمان
بفرمود پنهان به کاریگران
(صفحہ ۱۶۷)

(۲) چو اسباط بیرون شدند از سرای
بفرمود فرخ شه نیک رای
بکاریگران تا به‌بندند بار
تمامی صد اشتر همه خوار بار
بکردند آن چاکران کار خویش
بفرمان شاه جهان‌دار خویش
(صفحہ ۱۸۱)

شاہ نامے میں یہ لفظ معمار اور دیوار گر کے معنی دیتا ہے۔

امثال از شاه نامه :

(۱) دگر گفت کاریگران آورید
گچ و سنگ و خشت‌گران آورید

(۲) چہل روز تا کار نشنیدم
ز کاریگران شاہ لگزیندم
(۳) بدانست کاریگر راست گوی
کہ عیب آورد مرد دانا بدوی
(۴) برفتند کاریگران سہ ہزار
ز ہر کشوری ہر کہ بد نام‌دار
(ساختن خسرو شہر مدائن را ، صفحہ ۲۰۷ ، جلد چہارم، شاہ نامہ ، طبع بمبئی ، سنہ ۱۲۷۵ھ)

زلیخا میں آ کر اس لفظ کو نئے معنوں میں استعمال کرنا فردوسی سے بعید معلوم ہوتا ہے -

'جلدی' بمعنی چالاکی و زودی شاہ نامے میں غیر رائج ہے - زلیخا سے یہ مثالیں پیش ہیں :

(۱) بجلدی زن چابک پیش دست
کیانی کمر برمیانش بدبست
(صفحہ ۳۹)

(۲) بدانست کان بد ز حکم خدای
نہ از روی جلدی بدو جہد ورای
(صفحہ ۲۰)

(۳) ز جلدی دگر بارہ فریاد زد
چنین گفت کای ناخردمند مرد
(صفحہ ۱۲۹)

حکیم سنائی غزنوی :
سگ اگر جلد بودی و فربہ
یک شکاری نماندی اندر دہ
(حدیقہ ، صفحہ ۳۴۶)

'قضا را' شاہ نامے میں اس کا رواج نہیں - اگرچہ ذیل کی

مثال میرے دعوے کے خلاف ہے - شاہ نامہ :

که ایرج برو مهر بسیار داشت
قضا را کنیزک ازو بار داشت
(جلد اول ، صفحہ ۲۰)

تمام شاہ نامے میں صرف ایک نظیر ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فردوسی اس محاورے کا عادی تھا - ممکن ہے کہ بعد کی ترمیم ہو - زلیخا میں البتہ یہ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے - زلیخا :

(۱) قضا را شبی دید روشن بخواب
که ده گرگ باخشم و کین و عتاب
(صفحہ ۴۳)

(۲) قضا را یکی روز یوسف پگاه
برون شد بامید یک لخت راه
(صفحہ ۱۰۳)

(۳) قضا را یکی دایهٔ سال خورد
بناگه بدان سیم تن باز خورد
(صفحہ ۱۲۰)

(۴) همین بود غمگین دل شهریار
قضا را فراز آمد آن آبدار
(صفحہ ۱۴۳)

اسدی طوسی :

قضا هر دو برهم رسیدند تنگ
رده بر کشیدند و برخاست جنگ
(ملحقات شاہ نامہ ، صفحہ ۹)

سنائی غزنوی :

از قضا را و بای گاوان خاست
هر که را پنج بود چار بکاست

سعدی :

قضا را من و پیری از فاریاب

رسیدیم در خاک مغرب بآب

'ورج' بفتح اول ، قدر و قیمت و شان و شکوہ اور حد و اندازہ کے معنوں میں آتا ہے ۔ زلیخا میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے اور شاہ نامے میں عنقا ہے ۔ زلیخا :

(۱) ز ورج تو فرزانۂ یک دلہ

ہمہ حجلہ شد ساختہ ہم گلہ

(صفحہ ۲۷)

(۲) ہمی گفت ہر کس کہ از ورج اوست

کہ این بچگان را پلنگ است پوست

(صفحہ ۲۹)

(۳) فروخفت تا از زمین چتر زر

بر آمد بفیروزی و ورج و فر

(صفحہ ۱۱۱)

(۴) بخاصہ جوانی دل از بخت شاد

کہ باشد درو ورج و بخت و مراد

(صفحہ ۱۲۶)

(۵) کہ دادی مرا یوسف پارسا

کزو ملک من یافت ورج و بہا

(صفحہ ۱۵۳)

شاہ نامہ اس کے بجائے ارج لاتا ہے ۔ امثال :

(۱) کنون ای خردمند ارج خرد

درین جای گہ گفتن اندر خورد

(صفحہ ۹ ، جلد اول)

(۲) کہ او ارج زر را ندانند همی

بہر جای زر را فشاند همی

(صفحہ ۱۲۵ ، جلد سوم)

(۳) یکی رامشی نامہ خوانید نیز

کزان جاودان ارج یابید و چیز

(صفحہ ۱۱۲ ، جلد سوم)

(۴) مرا ارج ایران بباید شناخت

بزرگ آن کہ با نامداران بساخت

(صفحہ ۱۲۸ ، جلد سوم)

اگرچہ ارج اور ورج اصل میں ایک ہی لفظ ہیں[1] اور ان کے معنی قدر و قیمت ، شان و شکوہ وغیرہ کے ہیں لیکن زلیخا میں ورج کے معنوں میں اور بھی عمومیت ہے ۔ امثال اول و دوم میں ورج زیادہ تر برکت ، کرامت وغیرہ کے معنوں میں لایا گیا ہے ۔

'همزاد' ۔ اس کے معنی لغت میں ہم سن اور ہم سال ہیں ۔ ایسے رفیق پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو سفر و حضر میں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو ۔ نظامی :

نگہ کرد همزاد او خفتہ بود

همان کرد با او کہ او گفتہ بود

(سکندر نامۂ بحری ، صفحہ ۲۱)

---

۱ ۔ ''ورج ۔ بمعنی قدر و مرتبہ و ارزش نوشتہاند و انجمن آرا این مصراع را آوردہ :

ای بورج و کامرانی ثانی اسفند یار

ازین رو ورج وارج یکی می شود ۔''

(فرهنگ شاہ نامہ ، ڈاکٹر رضا زادہ شفق ، صفحہ ۲۶۰)

(مرتب)

یوسف زلیخا میں عموماً برادر کا مرادف ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) چو همزاد را آن چنان بسته دید
دل خسته از دیده بیرون چکید
(صفحه ۷۹)

(۲) بدیدند همزاد خود را نژند
سراپای گشته گرفتار بند
(صفحه ۷۹)

(۳) توئی آن که همزاد را گرگ خورد
ترا از برادر چنین فرد کرد
(صفحه ۱۷۷)

(۴) منم آن که بر من ستم گرگ کرد
منم آن که همزاد را گرگ خورد
(صفحه ۱۷۸)

زلیخا میں جب کہ وہ بیسیوں مقام پر ملتا ہے اور صاحب زلیخا کا روز مرہ بن گیا ہے ، تمام شاہ نامے میں باوجود تلاش صرف ایک مثال داستان فرود میں ملی :

که پیوند شاهست و همزاد اوی
سواری ست نام آور و جنگجوی
(صفحه ۱۵٦ ، جلد اول)

قابوس نامه :

"که ملک ترا از برادر مشفق همزاد و دوست تر است ۔"
(باب چهل و دویم اندر شرط اسفهسالاری ، صفحه ۲۱۱)

استوار[1] داشتن یا بودن اعتماد رکھنے کے معنوں میں زلیخا میں

---

۱ ۔ "استوار ۔ بمعنی محکم و قویم (از ریشه ستا یعنی ایستادنی و پایدار)
(بقیه حاشیه اگلے صفحے پر)

بالعموم رائج ہے ۔ امثال :

(۱) ز بیم استوارش نبودی بکس
خود او را نگہ دار بودی و بس
(صفحہ ۳۳)

(۲) بیا یوسف خویش را گوش دار
مدارش بہیچ آدمی استوار
(صفحہ ۳۶)

(۳) ہمی داردش روز و شب درکنار
ندارد بہر کس ورا استوار
(صفحہ ۳۷)

(۴) بکس یک زمان استوارش نبود
بجز خود شب و روز یارش نبود
(صفحہ ۹۹)

(۵) بہیچ آدمی استوارش نبود
شب و روز بی او قرارش نبود
(صفحہ ۱۶۵)

ان معنوں میں شاہ نامے میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے ۔
شاہ نامہ :

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
استوار و استبرو ستبر از ہمان ریشہ است (یعنی محکم و اعتماد کردنی) ۔
از کمال اسماعیل :
ہر آن فریب کہ از عشوہ ایست در کارم
مرا ز سادہ دلی استوار می‌آید“
(فرہنگ شاہ نامہ ، رضا زادہ شفق ، صفحہ ۲۲)

(مر۳ب)

پرستنده با وی بیامد چهار
کہ خاقان بدیشان بدی استوار
(صفحہ ۲۳ ، جلد چہارم)

'ساق عرش خدای' شاہ نامے میں یہ ترکیب نامعلوم ہے اور زلیخا میں مقبول ہے۔ امثال :

(۱) ز میدان چو بنہی قدم در سرای
سر قبہ بر ساق عرش خدای
(صفحہ ۱۶۸)

(۲) خروشیدن کوس و زرینہ نای
همی رفت تا ساق عرش خدای
(صفحہ ۲۱۱)

(۳) یکی نور ز اندام آن دلکشای
بہ پیوست تا ساق عرش خدای
(صفحہ ۶۰)

'آہ' اظہار تاسف و حسرت کے وقت زلیخا میں ملتا ہے۔ امثال از زلیخا :

(۱) بنالید و گفت آہ درد و دریغ
کہ خواهد شدن ماہ عمرم بہ میغ
(صفحہ ۳۴)

(۲) همی راند سیل و همی گفت آہ
کہ فالیست این بس سیاہ و تباہ
(صفحہ ۳۶)

(۳) چو یوسف چنین دید بر جایگاہ
دل مہربان بر تنش گفت آہ
(صفحہ ۵۲)

(۴) بسی گفت مسکین بسی گفت آہ
ز تیمار یعقوب ۔ دانش پناہ

(۵) پس آن اشک از دیدھا کرد پاک
بر آورد آہ از دل دردناک
(صفحہ ۱۲۰)

(۶) ھمہ روز من گشت چون شب سیاہ
شبم شیون و زاری و درد و آہ
(صفحہ ۱۷۴)

شاہ نامے میں آہ کا لفظ کل چار پانچ مقام پر ملتا ہے اور ایسے نازک وقت جب کہ انسان کاری زخم کھاتا ہے جس سے جانبری محال ہے ۔ سہراب کی موت ۔

شاہ نامہ :

(۱) بہ پیچید زان پس یکی آہ کرد
ز نیک و بد اندیشہ کوتاہ کرد
(صفحہ ۹۸ ، جلد اول)

شغاد کی موت :

(۲) شغاد از پس زخم او آہ کرد
تہمتن برو دست کوتاہ کرد
(صفحہ ۷۴ ، جلد سوم)

بہرام چوبیں کا قتل :

(۳) چو بہرام گفت آہ مردم ز راہ
برفتند پویان بہ نزدیک شاہ
(صفحہ ۹۶ ، جلد چہارم)

معمولی تحسر اور تاسف کے وقت فردوسی باد سرد لکھتا ہے ۔

شاہ نامہ :

(۱) چو روی پدر دید خسرو بدرد
بر آورد از دل یکی باد سرد
(صفحہ ٦٦ ، جلد چہارم)

(۲) بشد مغز و جان و سرم پر ز درد
بر آورد از دل یکی باد سرد
(صفحہ ۱۸۱ ، جلد دوم)

(۳) بیامد بہ نزدیک خاقان چو گرد
پر از خون دل و لب پر از باد سرد
(صفحہ ۱۸۹ ، جلد دوم)

(۴) کز ایرانیان چند جستم نبرد
نزد پیش من کز جز از باد سرد
(صفحہ ۲۲۴ ، جلد دوم)

گویا قدما کی باد سرد کا قائم مقام متاخرین کے ہاں آہ سرد ہے ۔

'ویزہ' بیاے مجہول و زاے فارسی ، خاصہ و خالص و بیغش ۔ اس صورت میں یہ لفظ دونوں مثنویوں میں ملتا ہے اور دونوں تصنیفات میں روزمرہ کا حکم رکھتا ہے ۔ اس کی جمع ویژگان ہے ۔ اس صورت میں خواص اور ندما کے معنوں میں آتا ہے ۔ شاہ نامے میں بالعموم رائج ہے ۔ امثال از شاہ نامہ :

(۱) خودو ویژگان با هیونان چست
بیامد بہ آسودگی راہ جست
(صفحہ ۱۷ ، جلد سوم)

---

۱ - بمعنی صاف و پاک و خالص (شاید از ویچیزہ و ویچہ باشد کہ گزیدن هم از هان اصلست)

(فرهنگ نامہ شاهنامہ ، شفق ؛ صفحہ ۲۹۲)

(مرتبہ)

(۲) ازان ویژگان پنج تن را ببرد
که بودند با مغز و هشیار وگرد
(صفحه ۲۸۷ ، جلد دوم)

(۳) چو از قلب شاپور لشکر براند
چپ و راستش ویژگان را بخواند
(صفحه ۱۰۰ ، جلد سوم)

(۴) ازان پس خود و ویژگان برنشست
میان کئی تاختن را ببست
(صفحه ۹۶ ، جلد سوم)

(۵) پس لشکر اندر همی رفت شاه
خود و ویژگان تا به نخچیر گاه
(صفحه ۱۲۴ ، جلد سوم)

نظامی : یکی روز با خاصگان سپاه
چو مینو یکی مجلس آراست شاه

ویژگان یوسف زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے ۔ یہ امر قرین حیرت ہے کہ فردوسی ، اگر وہ یوسف زلیخا کا مالک ہے تو ویژدن کے استعمال سے اس مثنوی میں کیوں محترز ہے ۔ اسی سلسلے میں مجھ کو بویژہ[1] کا بھی ذکر کر دینا چاہیے جو تاکید اور تخصیص کے لیے آتا ہے اور شاہ نامے میں علی‌العموم پایا جاتا ہے اور جس کو زلیخا میں قطعاً ترک کر دیا گیا ہے ۔

'بویژہ' مرادف ہے بالخصوص کا ۔ شاہ نامے سے مثالیں اور بھی واضح کر دیں گی :

---

۱ ۔ 'بویژہ' یعنی بخصوص (رجوع شود بکلمہ ویژہ)
(فرہنگ شاہ نامہ ، صفحہ ۶۲)
(مرتب)

(۱) بویژه دلاور سپہدار طوس
که در جنگ بر شیر دارد فسوس
(صفحہ ۴ ، جلد اول)

(۲) همہ راستی خواهم و نیکوئی
بویژه کہ سالار ایران توئی
(صفحہ ۵٦ ، جلد سوم)

(۳) مبادا کہ تنہا بود نام جوی
بویژه کہ دارد سوی جنگ روی
(صفحہ ۳ ے ، جلد چہارم)

(۴) یکی تاج بودی ازان بر سرش
بویژه کہ بیمار شد دخترش
(صفحہ ۹۵ ، جلد چہارم)

(۵) کہ چونین سخن نیست جزکارزن
بویژه زنی کو بود رای زن
(صفحہ ۹۹ ، جلد چہارم)

قرن پنجم میں بویژه کا رواج گرشاسپ نامۂ اسدی سنہ ۴۵۸ھ سے ثابت ہے -

اسدی : بویژه دو کسرا بہ بخشای و بس
مدان خوار و بیچاره ترزان دو کس
(صفحہ ١٧ ، طبع آقا محمد شیرازی ، بمبئی)

کیا یہ حقیقت حیرت بخش نہیں کہ بویژه پر بھی زلیخا میں ویژگان کی طرح خطِ بطلان کھینچ دیا گیا ہے -

مثنوی یوسف و زلیخا ایک بڑی کتاب ہے جو کم و بیش آٹھ نو ہزار ابیات پر مشتمل ہے - اس میں یہ قیاس کرنا کہ بویژه کے لیے کوئی مناسب موقع اور محل نہیں ملا مہمل معلوم ہوتا ہے - دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں اس کے استعمال کا موقع آتا ہے

شاعر اس کا مرادف بخاصہ لاتا ہے ۔ چنانچہ زلیخا :

(۱) بخاصہ کہ یوسف چو او آدمی
نہ دیدہ همی آسمان و زمی
(صفحہ ۳۴)

(۲) بخاصہ یکی بندۂ بی نوا
کہ هجدہ درم باشد او را بہا
(صفحہ ۸۰)

(۳) بخاصہ کہ از روم و چین آورند
نہ زین شہرها وین زمین آورند
(صفحہ ۱۰۹)

(۴) بہ یوسف بر آزار واجب ندید
بخاصہ چنان کان گواهی شنید
(صفحہ ۱۳۰)

(۵) بخاصہ ابر ابن یامین فرد
کہ گرگ از برادر ورا فرد کرد
(صفحہ ۱۶۹)

قابوس نامہ : ''و با مردم نادان صحبت مکن خاصہ با نادانی کہ پندارد داناست ۔''
(باب ششم در فزونی گوهر در آموختن ، صفحہ ۳۵)

حکیم سنائی :

حبذا آن جمال دهر آرای
مرحبا آن سپهر قلعہ کشای
خاصہ وقتی کہ در مصاف بود
پای او بر دماغ قاف بود
(حدیقہ ، صفحہ ۶۵۰)

'ارژنگ' ۔ اس کی اور صورتیں یہ ہیں ۔ ارتنگ ۔ ارثنگ ۔

ارجنگ ۔ ارسنگ ۔ ارغنگ ۔ تنگ ۔ چنگ اور ژنگ ۔ جس قدر اس کی شکل میں اختلاف ہے ، اسی قدر اس کے معنوں میں اختلاف ہے اور اہل قلم نے طرح طرح کی طبع آزمائیاں کی ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ ارژنگ ، مانی کا اصلی نام ہے ۔ ان کا اعتقاد ہے کہ مانی ایک دعائیہ کلمہ تھا جو کثرت استعمال سے بالآخر لقب ہو گیا ۔ بعض کی رائے میں وہ کسی چینی بت خانے کا نام ہے ۔

بعض کا قول ہے کہ وہ اس تختے یا کتاب کا نام ہے جس پر مصور اشکال غریبہ نقش کر کے اپنے سامنے رکھتے ہیں ۔ مصوران روم اس کو تنگ اور نقاشان چین ارتنگ بتاے قرشت (نہ بثاے تخذ ، کیوں کہ فارسی میں یہ حرف نہیں آتا) کہتے ہیں (رشیدی) ۔ گویا یہ اسدی کو اصلاح دی گئی ہے جیسا کہ آیندہ دیکھا جائے گا ۔

بعض کا خیال ہے کہ اس کا اطلاق زبان پر بھی آتا ہے اور تاریخ کے معنی بھی دیتا ہے (جہانگیری) ۔

بعض کی رائے میں وہ کسی نقاش کا نام ہے جو چینی اصل اور مانی سے علیحدہ ہے اور کمال میں مانی کا ہم پایہ ۔ امیر خسرو دہلوی :

که در چین دیده ام ارژنگ پرکار
که کردی دائره بی دور پرکار

وله

به قصر دولتم مانی و ارژنگ
طراز نقش می بستند بر سنگ

امیر خسرو نے شاید یہ معنی نظامی سے لیے ہیں ۔ نظامی :

روان کرد کلک شبه رنگ را
به برد آب مانی و ارژنگ را

مگر قول مقبول یہ ہے کہ وہ مانی کے نگار خانے کا نام ہے ۔

یوسف اسفرنگ :

اگر مانی شود زندہ چو بیند نقش توصیفش
بمیرد باز از شرم نگارستان ارتنگش
(جہانگیری)

استاد عمعق بخاری :

این چون بہار خانۂ چین پر ز نقش چین
وان چون نگارخانۂ مانی پر از بہار
(لباب ، باب دہم ، صفحہ ۱۸۶)

عطا بن یعقوب الکاتب المتوفی سنہ ۴۹۱ھ :

بمانند بت‌خانۂ چین منقش
بکردار ارژنگ مانی مصور
(لباب ، حصہ اول ، باب ششم ، صفحہ ۷۳)

متأخرین کا قریب قریب یہی عقیدہ ہے ۔

لیکن سب سے قدیم اور وقیع عقیدہ جو متقدمین میں عام تھا یہ ہے کہ وہ مانی کی کتابِ اشکال کا نام ہے ۔ چنان‌چہ یہی معنی لغات اسدی میں دیے گئے ہیں ۔ اور مثال میں فرخی کا یہ شعر منقول ہے :

ہزار یک زان کاندر سرشت او ہنرست
نگار و نقش ہانا کہ نیست در ارتنگ

اسدی نے ساتھ ہی یہ بھی تشریح کر دی ہے کہ تائے قرشت کی بجائے زبان دری میں ثائے ثخذ سے لکھا جاتا ہے ۔ وہ محض مرقع نہیں تھا بلکہ مصور کتاب تھی ۔ فرخی کے اس شعر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے :

نامۂ فتح تو ای شاہ بچین باید برد
تا چو آن نامہ بخوانند نخوانند ارتنگ

مسعود سعد نے اس کو اور بھی واضح کر دیا ہے :

دوزخ آرد پرستش ایشان
راست ہستند نامۂ ارژنگ

وله

جہان بزیب و بزینت چو لعبت آزر

زمین بہ نقش و بہ صورت چو نامہ ٔ ارژنگ

تنہا ارژنگ مسعود سعد سلمان کے ہاں یوں آیا ہے :

زان کہ بستان شدہ از حسن بسان مشکوی

زان کہ صحرا شدہ از نقش بسان ارتنگ

سنائی کے ہاں بھی یہی معنی دیتا ہے :

گر نہ ارتنگ مانی است آن خط

از چہ خط ھای مقلہ گشت سقط

وله

چشم بد دور سخت با معنی ست

همچوارتنگ خامہ ٔ(کذا)مانی‌ست

(حدیقہ ٔ سنائی ، صفحہ ۵۱ ۷ - ۵۲ ۷ ، نولکشور ، سنہ ۱۸۸۷ع)

لیکن ابوالمحاسن ازرق کے ہاں گزشتہ معنوں میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتا :

شکفت شاخ سمن گرد بوستان گوئی

همی بر آور در ثمین سر از ارتنگ

(لباب ، باب دهم ، صفحہ ۹۶)

آمدم بر سر قصہ ، یوسف زلیخا تنہا ارژنگ سے واقف نہیں لیکن اضافت کے ساتھ ارژنگ مانی اس میں آتا ہے ۔ زلیخا :

(۱) سر و پای اوچون بت آزری

چو ارژنگ مانی و جان پری

(صفحہ ۱۲۴)

(۲) همہ لشکر و پیل چون نو بہار

چو ارژنگ مانی برنگ و نگار

(صفحہ ۱۷۶)

(۳) سرای ست در پیش آراسته
چو ارژنگ مانی به پیراسته
(صفحه ۱۶۸)

(۴) بماهی درش پای و در ماه سر
چو ارژنگ مانی همه پر صور
(صفحه ۱۵۹)

ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب یوسف زلیخا کے نزدیک ارژنگ خواہ مصور کتاب ہو یا نگارخانہ ، مانی سے علاقہ رکھتا ہے کیونکہ یہ مصنف ارژنگ کو مانی سے منسوب کیے بغیر لکھنا جانتا ہی نہیں ۔ اس اعتقاد میں وہ سنائی ، مسعود سعد سلمان ، عطا بن یعقوب الکاتب ، اسدی اور فرخی کا ہم زبان ہے ۔

فردوسی شاہ نامے میں ارژنگ کو جن معنوں میں لاتا ہے ان سے عموماً نہ ہمارے ادیب اور نہ اہل لغات واقف معلوم ہوتے ہیں ؛ وہ حسب ذیل ہیں ۔

(۱) ارژنگ دیو ماژندرانی اور تورانی پہلوان پسر زرہ کا نام ہونے کے علاوہ جیسا کہ صاحب جہانگیری نے لکھا ہے ایک اور تورانی پہلوان کا نام ہے جو نژاو کی فوج سے علاقہ رکھتا ہے ۔ شاہنامہ :

یلانش بد ارژنگ و مرد وی شیر
کہ ہرگزنہ بودند از جنگ سیر
(گریختن نژاو از بیژن و گرفتاری اسپنوی ، صفحہ ۱۶۰ ، جلد اول طبع بمبئی ، سنہ ۱۲۷۵ھ)

(۲) ایک کنویں کا نام بھی ہے جس میں بیژن بن گیو افراسیاب کے حکم سے قید کیا جاتا ہے ۔ شاہ نامہ :

بہ پیلان گردن کش آن سنگ را
کہ پوشد سر چاہ ارژنگ را
(داستان بیژن ، صفحہ ۲۰۹ ، جلد دوم)

اور فرخی :

نشست گاہ تو بر تخت خسروانی باد

نشست گاہ عدوی تو بر چہ ارژنگ

(۳) وہ طلسم ، جادو اور نیرنگ کے معنی بھی دیتا ہے - جب فریدوں ضحاک کے ساختہ طلسم کو توڑ کر ضحاک کے محل سرا میں داخل ہو جاتا ہے ، اس واقعے کی اطلاع کندرو ضحاک کو جا کر دیتا ہے اور کہتا ہے :

ترا دشمن آمد بگاهت لشست

یکی گرزۂ گاو پیکر بدست

همہ بند و نیرنگ و ارژلگ برد

دلآرام بگرفت و گاهت سپرد

(شاہ نامہ ، جلد اول ، صفحہ ۱۳)

(۴) اور عموماً تصویر کے معنوں میں آتا ہے - یہ یاد رہے کہ فردوسی شاہ نامے میں ارژنگ مانی کی ترکیب سے بالکل نا بلد ہے - شاہ نامے میں یا تو تنہا ارژنگ ملتا ہے جیسے اس شعر میں :

یکی نامہ بنوشت ارژنگ وار

بر او کردہ صدگونہ رنگ و نگار

(نامۂ پشنگ بہ کیقباد و آشتی خواستن ، صفحہ ٦۱ ، جلد اول)

نیز اس شعر میں :

(۲) یکی نامہ بنوشت ارژنگ وار

پر آرایش و رنگ و بوی و نگار

(فرستادن خاقان دختر خود را با نامہ و خواستہ همراہ مهران بہ نزد نوشیروان ، صفحہ ۲۳ ، جلد چهارم)

اور اس شعر میں :

(۳) بہ خاقان یکی نامہ ارژنگ وار
نوشتند پر بوی و رنگ و نگار

(نامۂ بہرام چوبین بخاقان و سکہ بنام خسرو پرویز زدن و فرستادن آن نزد ہرمز ، صفحہ ٦۲ ، جلد چہارم)

یا اضافت کے ساتھ ارژنگ چین ملتا ہے جس کے معنی تصویر لیے گئے ہیں - چنانچہ شاہ نامہ :

(۴) یکی نامہ بنوشت پر آفرین
سخن دان چینی چو ارژنگ چین

(آگاہی یافتن خاقان از رسیدن لشکر نوشیروان بگرگان و نامہ نوشتن او دربارۂ آشتی ، صفحہ ۲۰ ، جلد چہارم)

اور یہ شعر :

(۵) یکی نامہ برسان ارژنگ چین
نبشتند و کردند صد آفرین

(خواندن خسرو گرویہ را بدرگاہ ، صفحہ ۱۰۰ ، جلد چہارم)

ان اشعار میں ارژنگ کا اطلاق تصویر پر ہوا ہے - اس کی تائید نظامی کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے :

(۱) یکی بود پیکر دو ارژنگ را
تفاوت نہ ہم نقش و ہمرنگ را

(۲) کہ چون کردہ اند این دو صورت گزار
دو ارژنگ را در یکی سان نگار

(مناظرۂ رومیان و چینیان در صورت گری ، سکندر نامۂ بری ، صفحہ ۳۱۱ ، مطبع نامی لکھنؤ سنہ ۱۸۹۸ع)

یہ یاد رہے کہ فردوسی نے علی الرغم دیگر اساتذہ ارژنگ کو تصویر کے معنوں میں باندھا ہے جس میں نظامی کے سوا کسی اور نے اس کی تقلید نہیں کی اور نہ یہ معنی کسی کتاب ، لغات یا فرہنگ میں پائے جاتے ہیں - نظامی کے شارحین میں انھی ابیات کی تشریح

میں ، جو یہاں درج ہیں ارژنگ کے معنوں کے متعلق بہت کچھ تذبذب اور پس و پیش ہے ۔ مثلاً پہلے شعر کی نسبت کہا گیا ہے : ''ازیں بیت صاف معلوم می شود کہ ارژنگ نام کارِ مصوران ست نہ نام نقاش نظیر مانی۔'' اور :

در ارژنگ این نقش چینی پرند
قلم بست بر مانی نقش بند

اسکندر نامہ بری صفحہ ۵۴ کی شرح میں کہا ہے (حاشیہ ۷ ، ''بدان کہ ارژنگ از شعر خسرو علیہ الرحمۃ معلوم می شود کہ نام نقاشی است و درین جا این معنی درست نمی شود و مراد از ارژنگ این جا نقاشی ست ای در نقاشی چینی پرند ۔''

دوسرے شارح نے اس قدر اور اضافہ کیا ہے کہ : ''ارژنگ نگار خانۂ مانی باشد'' اور اس شعر کے واسطے :

ز بس جادویهای فرهنگ او
بدو بگرویدند و ارژنگ او

کہا ہے کہ : ''ازین بیت هم ظاهر می شود کہ ارژنگ بمعنی کار مانیست ای فن نقاشی و صنعت آن'' ۔ لیکن شعر ۲ کو جو اوپر لکھ آیا ہوں ، خاموشی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں حضرت شارح کے مفروضہ معنی چسپاں نہیں ہوتے ۔ اصل یہ ہے کہ نظامی نے سکندر نامے میں ارژنگ کو کل دو معنوں میں باندھا ہے ۔ پہلے وہی جو ہم فردوسی کے ہاں دیکھ آئے ہیں یعنی تصویر، دوسرے وہ جو اسدی اور فرخی کے ہاں ملتے ہیں یعنی کتاب مانی ۔

یہ تفاوت آسانی سے مفہوم ہو سکتا ہے کہ زلیخا میں ارژنگ یا نگار نامہ ہے یا نگار خانہ اور شاہ نامے میں تصویر ۔ اب یہ خیال کرنا کہ ایک مصنف نے اپنی دو تصانیف میں ایک لفظ کو دو مختلف معنوں میں باندھا اور جو معنی اور ترکیب ایک تصنیف میں اختیار کی دوسری تصنیف میں ترک کر دی ، کوئی صحیح حجت معلوم

نہیں ہوتی ۔ فردوسی کے نزدیک اس کے معنی یا تصویر تھے یا کتاب ۔ اگر پہلے معنی تھے تو دونوں نظموں میں وہی معنی باندھے جاتے ، اگر دونوں معنی جانتا تھا تو دونوں مثنویوں میں دونوں معنی لاتا ۔ یہ کیا کہ ایک مثنوی میں ایک اور دوسری مثنوی میں دوسرے معنی لائے جائیں اور ترکیبیں بھی بدل دی جائیں ۔ ایک میں کہے ارژنگ چین اور دوسرے میں کہے ارژنگ مانی ۔ شاہ نامے میں فردوسی کو ارژنگ مانی کے فقرے کے استعمال سے ، اگر وہ اس سے واقف تھا ، کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی جس طرح کہ یوسف زلیخا میں ارژنگ چین کے استعمال سے ۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان مثنویوں کے ناظم دو مختلف شخص ہیں جن کی معلومات مختلف ہے ۔ فردوسی کی شخصیت کو صاحب زلیخا کی شخصیت سے امتیاز کرنے کے لیے ہمارے واسطے اسی قدر کافی ہے کہ وہ ارژنگ کو ایسے معنوں میں باندھتا ہے جو نہ صرف صاحب زلیخا بلکہ عام طور پر دیگر اساتذہ کو بھی معلوم نہیں ۔

فرخی اور اسدی اگرچہ ارتنگ یا ارژنگ کو مانی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن فردوسی جو بہ حیثیت زمانہ ان دونوں شاعروں سے مقدم ہے نیز بہ حیثیت مورخ ایران مانی کے حالات سے مذکور الصدر شعرا کے مقابلے میں زیادہ با خبر ہونا چاہیے ، ارژنگ کا مانی سے کوئی علاقہ تسلیم نہیں کرتا اگرچہ وہ مانی کی صورت گری کا معتقد ہے ۔ چناں چہ شاہ نامہ :

بیامد یکی مرد گویا ز چین
که چون او مصور نه بیند زمین

بدان چرب دستی رسیده بکام
یکی پر منش مرد مانی بنام

به صورت گری گفت پیغمبرم

ز دین آوران جہان برترم

(آمدن مانی مصور نزد شاپور به دعوای پیغمبری و کشته شدن او ، صفحه ۱۰۱ ، جلد سوم)

اور نظامی :

شنیدم که مانی بصورت گری

ز ری سوی چین شد به پیغمبری

(سکندر نامه بری ، صفحه ۳۱۲)

مانی کی نسبت یہ عقیدہ عرب مورخین کے بیانات پر اعتبار کرتے ہوئے غلط معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن نہ فردوسی اور نہ مانی کے عرب مورخ مانی کی مشہورکتاب ارژنگ، یا ارتنگ، کا ذکر کرتے ہیں ، اور فردوسی نہ شاہ نامے میں اور نہ مانی کے حالات میں کسی مقام پر بھی اس عام عقیدے کا معتقد اور پابند نظر آتا ہے جس میں فرخی ، اسدی ، عطا بن یعقوب ، مسعود سعد سلمان اور حکیم سنائی اعتقاد رکھتے ہیں ۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یوسف زلیخا فردوسی کے قلم سے نکلتی تو مانی کے متعلق یہ ایک غیر تاریخی بیان جو ارژنگ مانی کے فقرے میں مرموز ہے فردوسی کے قلم سے ادا نہ ہوتا ۔

'نامہ' ۔ اس لفظ کے استعمال سے زلیخا میں کئی کنایے حاصل کیے گئے ہیں ۔ شاہ نامے میں یہ صورت نظر نہیں آتی ۔

زلیخا ۔ امثال :

(۱) و گر نه شود جانت جفت هلاک

شود اسمت از نامهٔ عمر پاک

(صفحه ۳۰)

(۲) عزیز اندران داوری خیره ماند
دلش نامہ و راہ اندیشہ خواند
(صفحہ ۳۰)

(۳) بہفت آسمان در فرشتہ نماند
کہ او نامۂ دردیوسف نخواند
(صفحہ ۸۴)

(۴) تو ای بانو این نامہ را در نورد
بگرد سخن‌های بیرہ مگرد
(صفحہ ۱۱۵)

(۵) دو رہ بر من این داستان خواندۂ
ہمین نامہ بر من دو رہ خواندۂ
(صفحہ ۱۱۸)

ادائے مطالب

شاہ نامۂ عظیم کا مصنف فردوسی ، ہمارا خیال تھا کہ ادائے مطالب میں غیر محدود الفاظ ، گونا گوں بندش اور ترکیب کے ذخیرے کا مالک ہوگا اور جس طرح اور جس پہلو چاہتا ہوگا اپنا مطلب ادا کر دیتا ہوگا ۔ اس بارے میں وہ ہم کو بالکل مایوس کرتا ہے ۔ جب کوئی خیال شاہ نامے کے دوران میں اس کو کئی مقام پر ادا کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے اظہار میں زیادہ تنوع ، رنگا رنگی اور اختلاف سے کام نہیں لیتا بلکہ قریب قریب ان ہی الفاظ میں اس کو دہراتا ہے ۔ جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ خیالات کی تکرار کے ساتھ ساتھ الفاظ اور جملوں کی تکرار شاہ نامے میں اکثر مقامات پر مشاہدہ کی جاتی ہے ۔ تمثیلاً میں ادائے سجدہ کے خیال کو لیتا ہوں ۔ فردوسی اس مقصد کو ان صورتوں میں ادا کرتا ہے :

(۱) نماز بردن (۲) روی بر زمین مالیدن (۳) رخ بر خاک نهادن (۴) روی بر خاک مالیدن (۵) رخ بر تیره خاک مالیدن (۶) رخ بر زمین مالیدن (۷) رخ بخاک مالیدن (۸) رخسارگان بر زمین مالیدن ۔

زلیخا ، شاہ نامے کے مقابلے میں اگرچہ ایک مختصر نظم ہے لیکن اس مثنوی میں یہی مقصد ذیل کی شکلوں میں اظہار ہوا ہے :

(۱) نماز بردن (۲) روی زمین برخ ستردن (۳) روی زمین بچہرہ ستردن (۴) روی بر خاک تاری نہادن (۵) چہرہ بر خاک تاری بسودن (۶) رخ بر خاک تیرہ بسودن (۷) رخ بر روی زمین نہادن (۸) رخ بر زمین نہادن (۹) چہرہ بر خاک تاریک مالیدن (۱۰) رو بخاک سیہ مالیدن (۱۱) زمین بچہرہ رفتن (۱۲) خاک زمین را بروفتن (۱۳) روی بر خاک مالیدن (۱۴) رخ بر تیرہ خاک نہادن (۱۵) رخسار بر تیرہ گل مالیدن (۱۶) دورخ بر زمین نہادن (۱۷) چہرہ بر خاک مالیدن ۔

اسی طرح گستردن کا حال ہم دیکھتے ہیں ۔ شاہ نامے میں عموماً اس فعل کے ساتھ یہ اسما آتے ہیں :

(۱) فرش گستردن (۲) دام گستردن (۳) کام گستردن (۴) مہر گستردن (۵) پر گستردن (۶) آفرین گستردن (۷) داد گستردن (۸) کین گستردن (۹) بساط گستردن ۔

زلیخا میں اس کے ساتھ مرقومۂ ذیل اسما آتے ہیں :

(۱) سخن گستردن (۲) آگہی گستردن (۳) بلا گستردن (۴) داستان گستردن (۵) قصہ گستردن (۶) خردمندی گستردن (۷) گفتار گستردن (۸) دین گستردن (۹) فرمان گستردن (۱۰) نعمت گستردن (۱۱) دعا گستردن (۱۲) راز گستردن (۱۳) نامہ گستردن (۱۴) عاشقی گستردن (۱۵) تخم گستردن (۱۶) لابہ گستردن (۱۷) دام گستردن (۱۸) فرش گستردن (۱۹) بساط گستردن

(۲۰) داد گستردن ۔

ان امثلہ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ صاحب زلیخا کے ہاں جو رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے فردوسی میں اس کا نصف بھی نہیں ۔ اس سے فردوسی پر کوئی حرف‌گیری نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ ماننا ہوگا کہ زلیخا کے زمانے میں فارسی زبان فردوسی کے عصر کے مقابلے میں بدرجہا ترقی کر چکی تھی ۔ جب کہ صاحب زلیخا کو ادائے مطالب کے لیے ایک بے حد وسعت اور گنجائش مل گئی ہے فردوسی ایک محصور تنگنا میں سلسلہ برپا ہے ۔

کسی اور موقعے پر دونوں استاد اسی ایک مقصد کے اظہار میں ایک ہی پیرائے کو دہرا رہے ہیں ۔ ذیل کی امثال سے روشن ہوگا کہ دونوں استاد کس قدر مغائر اور اپنی اپنی طرز میں مصر ہیں ۔ دونوں اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں عہد سے فلاں عہد تک ۔ امثال :

از آدم درون تا بدین روزگار
نہان را بدو کردہ ایم آشکار
(یوسف زلیخا)

ز گاہ منوچہر تا کیقباد
ازان نامداران کہ داریم یاد
(شاہ نامہ ، صفحہ ۲۷۳ ، جلد ۲)

از آدم درون تا بہ محشر گناہ
بہ بخشی بیک‌رحمت ای دادخواہ
(یوسف زلیخا ، صفحہ ۱۵۷)

ز گاہ منوچہر تا کیقباد
ز کاؤس تا شاہ فرخ نژاد
(شاہ نامہ ، صفحہ ۲۷۶ ، جلد ۲)

از آدم درون تا بروز شمار
ازین خوب تر کس ندیدست کار
(یوسف زلیخا ، صفحہ ۲۷)

ز گاہ منوچہر تا کیقباد
کسی دین یزدان نیاورد یاد
(شاہ نامہ ، صفحہ ۳۷ ، جلد ۳)

از آدم درون تا بدین روزگار
کہ او بود پیغمبر روزگار
(یوسف زلیخا ، صفحہ ۱۵)

ز گاہ کیومرث تا یزدگرد
بہ نظم من آید پراگندہ گرد
(شاہ نامہ ، صفحہ ۴۴ ، جلد ۴)

فردوسی جب کہ معمولی اور صاف الفاظ میں اپنا مطلب ظاہر کر رہا ہے صاحب زلیخا اسی مقصد کو محاورے کے ذریعے ادا کرتا ہے یعنی از آدم درون تا الخ ۔ یہ ایک ایسی نادر صورت ہے جس سے فردوسی شاہ نامے میں قطعاً نابلد ہے البتہ گرشاسپ نامے میں ہم اس سے دو چار ہوتے ہیں ۔ اسدی :

ز نور اندرون تا کہ گرشاسپ خاست
گزر کردہ بد چار صد سال راست
(گرشاسپ نامہ ، صفحہ ۲۳)

علی ہذا خواب دیکھنے کے مقصد کو فردوسی عموماً در حرف ظرف یا بائے ظرف کے ساتھ ادا کرتا ہے مثلاً در خواب دیدن یا بخواب دیدن ۔ خال خال صورتوں میں حرف ظرف ترک بھی کردیے گئے ہیں لیکن اس قدر قلت کے ساتھ کہ کل شاہنامے میں شاید دو تین مثالیں اس قسم کی ملیں ۔ صاحب زلیخا اس مطلب کو بالعموم بلا وصل حرف ظرف خواب دیدن لکھتا ہے اگرچہ بعض

اشکال میں وہ حرف ظرف بھی لاتا ہے ۔ امثال از زلیخا :

(۱) یکی خواب دیدم من ای شہریار
که هرگز ندیده کسی در دیار
(صفحہ ۴۴)

(۲) و گر خواب دیدی کسی سخت و سست
پسندیده تعبیر کردی درست
(صفحہ ۱۳۹)

(۳) دلم دوش دیده است خوابی شگفت
ندانم چه اندازه باید گرفت
(صفحہ ۱۳۹)

(۴) دگر گفت من خواب دیدم چنان
که بر سر کشیدم همی بار نان
(صفحہ ۱۴۰)

چند مثالیں شاہ نامے سے بھی نقل کی جاتی ہیں :

(۱) چنین دید در خواب کز کوه هند
درفشی بر افراختندی بلند
(صفحہ ۲۹ ، جلد اول)

(۲) بپرسید ازو دخت افراسیاب
که فرزانه شاها چه دیدی بخواب
(صفحہ ۱۲۵ ، جلد اول)

(۳) چنان دید روشن روانش بخواب
که رخشنده شمعی بر آمد ز آب
(صفحہ ۱۷۸ ، جلد دوم)

(۴) چنان دید گوینده یک شب بخواب
که یک جام می داشتی چون گلاب
(صفحہ ۲۰ ، جلد سوم)

اسی طرح ہاتھیوں کے پاؤں میں روندے جانے کے خیال کو استادوں نے باندھا ہے۔ فردوسی کہتا ہے :

و گر هیچ کژی گمانی برم
بزیر پی پیل تان بسپرم
(صفحہ ۳۳ ، جلد اول)

زلیخا میں آتا ہے :

بزیر پی پیل تان افگنم
بن و بیخ تان از جہان بر کنم
(صفحہ ۱۶۳)

ظاہر ہے مقابل فقروں میں افعال سپردن اور افکندن میں فرق ہے اور سپردن ، افگندن کے مقابلے میں زیادہ فرسودہ اور پارینہ معلوم ہوتا ہے۔

کسی اور مثال میں دونوں استادوں کے خیالات ایک ہی سمت سفر کر رہے ہیں - فردوسی کہتا ہے :

و دیگر کہ از تو مگر کردگار
نشاند یکی کودکم در کنار
(صفحہ ۸۶ ، جلد اول)

صاحب زلیخا یہی مطلب یوں قلم بند کرتا ہے :

دعا کن مگر ایزد کردگار
نشاند مرا کودکی در کنار
(صفحہ ۱۰۷)

مقابلہ دونوں آخری مصرعوں میں ہے اور فرق اس قدر ہے کہ فردوسی کے ہاں ترکیب ذرا پرانی ہے اور زلیخا میں مقابلۃً جدید ۔

کنایات و محاورات

ذیل کے محاورات جو زلیخا سے منقول ہیں شاہ نامے میں نظر

نہیں آتے ۔

(۱) خلیده جگر زیر دندان مار بودن
(۲) بر آوردن درخت مراد از بن
(۳) داروی مہر کسی خوردن
(۴) چہرۂ بخت را طپانچہ زدن
(۵) نامۂ چیزی درنوردن
(٦) در عاشقی فرو کوفتن
(۷) گل دولت از باغ شادی چیدن
(۸) ارزیز برچشم بخت ریختن

ان کی بندش کہہ رہی ہے کہ وہ ایسے وقت کی یادگار ہیں جب زبان میں ایک معتدبہ حصے تک رنگینی اور حلاوت کی چاشنی پیدا ہو چکی تھی جو بات فردوسی کے عہد میں قلت کے ساتھ معلوم تھی ۔

برخلاف اس کے شاہ نامے میں ایسے محاورات اور کنایات آتے ہیں :

(۱) گلیم اندر آب افگندن
(۲) گوز بر گنبد افشاندن
(۳) آب در زیر کاه بودن
(۴) طبل بزیر گلیم کوفتن
(۵) گاؤ پیسہ بچرم اندر بودن
(٦) ماهی بہ خشکی بردن
(۷) کار امروز را بفردا ماندن
(۸) آب از تارک برتر گزشتن

شاہ نامے میں ایک کنایہ 'خشت خام در آب افگندن' (کنایہ از کار بے سود کردن) آتا ہے ۔ شاہ نامہ :

چو کردار با ناسپاسان کنی
همی خشت خام اندر آب افکنی

زلیخا میں اس کے قریب قریب یوں آتا ہے ۔ شعر :

هر آن گه که افتاد در آب خشت

مرا پاک نبود ز باران چو کشت

لیکن صاحب زلیخا کا مطلب بالکل مختلف ہے جس کو شاہ نامے میں 'کشتی به آب انداختن' کے ذریعے سے ادا کیا گیا ہے :

تو کشتی بآب اندر انداختی

ز رستم همی چاکری خواستی

(صفحہ ۳۰۰ ، جلد سوم)

لا اعلم ۔ مصرع :

هر چه بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

فردوسی کے ہاں ایک اور کنایہ 'خورشید را چون توان نهفتن' آتا ہے ۔ شاہ نامہ :

یکایک بمرد گران مایه گفت

که خورشید را چون توانی نهفت

(صفحہ ۲۱ ، جلد اول)

یوسف زلیخا میں اس کی شکل 'شمس اندوده داشتن بگل' میں تبدیل کر لی گئی ہے ۔ زلیخا :

که اولاد او فانیند (کذا) و خجل

همی شمس اندوده دارد بگل

(صفحہ ۷۰)

اسدی طوسی :

چنین داد پاسخ بت دل گسل

که خورشید پوشید نتوان بگل

(گرشاسپ‌نامہ ، صفحہ ۱۸)

مولانا نظامی گنجوی :

بر آشفت نوشابہ زان شیر دل

کہ پوشید خورشید را زیر گل

ولہ

کہ بامن چہ سود ست کو شیدنت

بگل روی خورشید پوشیدنت

(سکندر نامہ بری،صفحہ ۲۱۶، مطبع نامی لکھنؤ سنہ ۱۸۹۸ع)

بہاالدین محمد بن الموید بغدادی ۔ شعر :

چو آفتاب یقینت شود کہ بی جرمم

گر آفتاب بگل بیش ازین نیندائی

(لباب ، باب ششم ، صفحہ ۱۴۱)

قاضی امام مجدالدین النسوی :

چو ماہ عمر تو اندر محاق پیری شد

تو آفتاب حقیقت بگل چہ الدائی

(لباب ، فصل دوم ، باب ہفتم ، صفحہ ۲۴۵)

اس کنایے کی آخری شکل یہ قرار پائی :

"فضل فضل او اثبات کردن آب دریا بغربیل پیمودن بودو چشمہ آفتاب را بگل اندودن ۔"

(محمد عوفی ، لباب الالباب ، فصل دوم از باب ہفتم ، صفحہ ۲۲۹)

سعدی :

بگفت آنچہ دانست پاکیزہ گفت

بگل چشمہ خور نشاید نہفت

(بوستان)

امثال بالا سے ہم کو اس قدر علم ہوگیا کہ فردوسی اور اس کا متبع اسدی طوسی 'آفتاب بگل اندودن' کے کنایے سے واقف نہ تھے ۔

یعنی اس کی یہ شکل ان ایام میں رائج نہ تھی ۔ برخلاف اس کے صاحب زلیخا اس محاورے سے واقف معلوم ہوتا ہے جس کو بہ ضرورت شعر "شمس بگل اندودن" لکھتا ہے ۔

توصیفات

زلیخا میں اسماے صفات ذیل کی صورتوں میں پائے جاتے ہیں :

(۱) سپہر وفا آفتاب ہنر ۔
(۲) کہ ای گلشن حسن و خورشید چاہ ۔
(۳) خردمند لاوی چراغ بصر ۔
(۴) چراغ جہان یوسف ژرف یاب ۔
(۵) ہنر مند یوسف چراغ زمن ۔
(۶) سرافراز راحیل پاکیزہ کیش ۔
(۷) بہ لیبای پر مہر فرہنگ یاب ۔
(۸) زلیخای مہ پیکر پیش بین ۔
(۹) نکو نام یعقوب فرخ خصال ۔
(۱۰) رخ روشنش کیمیای جلال ۔
(۱۱) ہوای زلیخا بت سنگ دل ۔

ان میں اکثر مرکبات توصیفی اس قسم کے ہیں جن کو تشبیہی اضافات نے ترکیب دیا ہے ۔ شاہ نامے میں تشبیہی اضافات کا قلت کے ساتھ رواج دیکھا جاتا ہے اور ایسے مرکبات مثلاً کیمیای جلال ، گلشن حسن، چراغ بصر، چراغ جہان ، چراغ زمن، چراغ دل اور فرہنگ یاب بالکل نامعلوم ہیں ۔ چراغ کی تشبیہہ زلیخا میں بالخصوص بہت عام ہے ۔ شاہ نامے میں اس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملی ۔

علاوہ ازیں زلیخا میں دیکھا جاتا ہے کہ اسماے صفات کے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہیں لیا جاتا ۔ بعض مثالیں پیش ہیں ۔

زلیخا :

بنزدیکی خوان بدانش نشست

کشیدش سوی خوان فرہنگ دست

(صفحہ ۱۸۰)

یہ شعر اس وقت آتا ہے جب حضرت یامین حضرت یوسف کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں ۔ خوان کے لیے خوان دعوت، خوان نعمت وغیرہ مشہور صفات ہیں ۔ شاعر نے ان سے احتراز کر کے خوان فرہنگ لکھا ہے ۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خوان کو فرہنگ سے کیا مناسبت ہے ؟

کہ مسکین زلیخای فرہنگ جوی

بدین بندۂ خود سیہ کرد روی

(صفحہ ۱۳۰)

یہ وہ موقع ہے کہ عزیز مصر پر حضرت یوسف کی بے گناہی کا نقش جم جاتا ہے لیکن بدنامی کے خیال سے زلیخا کو بھی سزا دینا نہیں چاہتا ۔ اس موقع پر زلیخا کو 'فرہنگ جوی' کہنا کون سی خوش مذاقی کی دلیل ہے ۔

ذیل میں کچھ امثال شاہ نامے سے پیش ہیں :

(۱) چمانندۂ دیزہ ہنگام گرد

چرانندۂ کرگس اندر نبرد

فزایندۂ باد آورد گاہ

فشانندۂ خون ز ابر سیاہ

گرایندۂ تاج و زرین کمر

نشانندۂ شاہ برتخت زر

(صفحہ ۳۵ ، جلد اول)

(۲) گرایندہ گرز و کشایندہ شہر

ز شادی بہر کس رسانندہ بہر

کشنده درفش فریدون بجنگ
کشنده سرافراز جنگی پلنگ
(صفحہ ۳۹ ، جلد اول)

(۳) پناه گوان پشت ایرانیان
فرازندۂ اختر کاویان
سرافراز گردن کش پیل تن
سزاوار ہر شہر و ہر انجمن
خداوند نیروی و فرزانگی
نگہ دار گیتی بہ مردانگی
(صفحہ ۴۷ ، جلد اول)

(۴) نبیره جهان دار کاؤس کی
دل افروز و پردانش و نیک پی
(صفحہ ۲۷۴ ، جلد دوم)

(۵) خداوند دولت خداوند زور
جہان گیر و بخشنده بهرام گور
(صفحہ ۱۳۰ ، جلد سوم)

(۶) و زان پس شود شہریاری بلند
جہان دار و نیک اختر و سودمند
(صفحہ ۸۰ ، جلد سوم)

(۷) سخن گوی و روشن دل و یادگیر
خردمند و دانا و گرد و دبیر
(صفحہ ۷۷ ، جلد چهارم)

(۸) جهان دار بادا دو نیکو کنش
فشانندۂ گنج بی‌سرزنش

فزایندهٔ نام و تخت قباد
گزارندهٔ تاج و اورند و داد
(صفحہ ۳۸ ، جلد چہارم)

حروف عاطفہ کے ساتھ اسمائے صفت کو ترکیب دینا فردوسی کے ہاں زیادہ رائج ہے ۔ زلیخا میں یہ صورت خال خال موقعوں پر ملے گی ۔ علی ہٰذا ایسی ترکیبیں مثلاً نشانندهٔ شاه ، ستانندهٔ گاه ، فشانندهٔ گنج ، گزارندهٔ تاج ، فزایندهٔ نام ، زلیخا میں غیر حاضر ہیں ۔

عربیت

پیشتر ایما کیا جا چکا ہے کہ زلیخا میں عربی الفاظ کی آمیزش ایک غیر ضروری حد تک دیکھی جاتی ہے ۔ یہاں اس مفہوم کو زیادہ وضاحت دینے کے خیال سے اس قسم کی چند مثالیں دی جاتی ہیں ۔

امثال :

(۱) چنین گفت الٰہی بآلای خویش
باجلال و اعزاز و نعمای خویش
(صفحہ ۹۷)

(۲) ھمان شہرھا و نواحی تمام
همہ ملک معمور با آن نظام
(صفحہ ۱۵۱)

(۳) چو بر شد بمنبر بدین حسن‌وزیب
گسست از همه خلق‌صبروشکیب
(صفحہ ۹۳)

(۴) بدین ظن زنان جملہ دیدند فرض
بدو خویشتن جملہ کردند عرض
(صفحہ ۱۳۵)

(۵) وفا داده پد مر براهیم را
مر آن اصل تبجیل و تعظیم را
(صفحہ ۴۴)

(۶) ز نادانی آن خواب را خاص و عام
نهادند اضغاث احلام نام
(صفحہ ۴۴۱)

(۷) مرا باچنین حسن و چندین جمال
نخواهی حدیثی ست صعب ومحال
(صفحہ ۴۱۱)

عربی الفاظ کی فارسی افعال کے ساتھ ترکیب کی مثالیں

بنظم آوردن ، نظم آراستن ، لطف کردن ، تضرع نمودن ، فرح دادن ، سفر افتادن ، نسب ساختن ، کفارت کردن ، نقصان بودن ، معزول کردن ، مخذول کردن ، تحیات کردن ، عفو خواستن فضل داشتن ، عزت نهادن ، منع کردن ، فرو کردن ، بضاعت داشتن ، موقع فتادن ، عقوبت رساندن ، سیاست کردن ، ضائع شدن ، رسوم نهادن ، عقد بستن ، خطبہ خواندن ۔ فلاح یافتن ۔ ان مرکب افعال میں سے اکثر شاہ نامے سے غیرحاضر ہیں ۔

فارسی اضافت کے ساتھ عربی الفاظ کی ترکیب

اصل تبجیل، عیب عظیم ، تاویل احلام ، عزیز ذلیل ، مالک رقاب ، فرش عظیم ، حرمت عظیم ، کمال عظیم ۔

عربی فارسی الفاظ کی ترکیب

تعبیر خواب ۔ روی ایجاب ۔ آیت دوری ۔ کیش عظیم ۔ جاہ عظیم ۔ نقش مانی ۔ در عاشقی ۔ نقش چینی ۔ نامۂ عمر ۔ سلبہای زر ۔

کار سازی ۔ گل معجزہ ۔ خون مزور ۔

اضافت کا استعمال

قرصۂ شمس گیتی افروز ۔ سر رشتۂ صبر ۔ قرصۂ آفتاب ۔ شکر خدای جہان آفرین ۔

فارسی حروف کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال

ازین نوع ۔ بدین نوع ۔ بی مونس ۔ قضا را ۔ بارضا ۔ حرمتگہ ۔ کثیر و قلیل ۔ بی محابا ۔ با نظام ۔ اندک نظیر ۔

گزشتہ بالا ترکیبوں میں سے جو زلیخا سے منقول ہیں ، اکثر صورتیں شاہ نامے سے غیر حاضر ہیں ۔

زلیخا کے برخلاف شاہ نامے میں عربیت کا اثر نہایت دھندلا ہے ۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ فردوسی کے عہد تک فارسی زبان عربی کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی تھی ۔ ابتداءً صرف چند ضروریات کی بنا پر عربی خرمن سے خوشہ‌چینی کی گئی تھی ۔ ان میں سب سے پہلے مذہبی ضرورت تھی ۔ اس بنا پر ہر مسلمان کے لیے اپنی مذہبی مصطلحات کا جاننا ضروری تھا ، جو عربی تھیں ۔ مثلاً دعا ، درود ، سلام ، حلال ، حرام ، حمد ، ثنا ، حدیث وغیرہ وغیرہ ۔ دوسرے اس عہد کی ضروریات زندگی کی بنا پر بھی عربی الفاظ کا ایک محدود اور ضروری ذخیرہ مستعار لیا گیا تھا ۔ مثلاً صندوق ، شمع ، منبر ، قرطاس ، قیر ، قار ، ملجم ، معصفر ، منزل ، مجلس ، صحرا ، حرف ، جمال ، حسن ، عشق ، عید ، ساقی ، قدح ۔

تیسری ضرورت میں علمی اصطلاحات تھیں جن کے لیے فارسی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں تھا ۔ مثلاً نظم ، نثر ، شعر ، بیت ، غزل ، قصیدہ ، خط وغیرہ وغیرہ ۔

چوتھے قصائد میں شعرا لفظی شان و شوکت ، لفاظی اور قوافی کی ضروریات سے بھی عربی الفاظ مستعار لیتے رہے تھے ۔ تاہم یہ عربی ذخیرہ فارسی میں ایک محدود پیمانے پر تھا اور اکثر ایسا تھا جس کے بغیر چارہ نہیں تھا ۔

شاہ نامہ اس کی سب سے بہتر مثال پیش کرتا ہے ۔ اس میں وہی عربی الفاظ ملتے ہیں جو مختلف ضروریات کی بنا پر فارسی میں رائجُ الوقت ہو چکے ہیں اور فارسی روزمرہ میں داخل ہیں ۔ ان میں سے بعض کی امثال اوپر دی جا چکی ہیں ۔ علاوہ ازیں فردوسی خود بھی ایسے الفاظ عربی سے وام لیتا ہے ، جن کی اشد ضرورت محسوس کرتا ہے ۔ مثلاً بیت اور نظم ۔ فارسی میں ان کا کوئی مرادف نہیں ملا اس لیے ان ہی پر متصرف ہوگیا ۔ نظم و نثر کا ترجمہ اس نے پیوندہ اور پراگندہ کیا ہے لیکن اس پر خود اس کو اطمینان نہیں ہے ۔ قافیے کی ضرورت سے بھی وہ گاہے گاہے عربیت کا منت پذیر ہوتا ہے ، مثلاً منجنیق ؛ شاہ نامے میں اس لفظ کے بغیر گزارہ دشوار تھا اس لیے وہ تو لے لیا لیکن قافیے کی ضرورت سے ایک اور لفظ کی تلاش ہوئی ۔ فارسی میدان میں اس کی جستجو بے سود تھی ۔ ناچار عربی سے جاثلیق وام کیا ۔ اب شاہ نامے میں جہاں کہیں قافیۂ اول منجنیق ہے قافیۂ ثانی بلا استثنا جاثلیق ہے ۔ اسی طرح لفظ 'نیا' (جد مادری و پدری) کے قافیے کے لیے کیمیا اور کف کے لیے صف تلاش کیے گئے ۔

یا بعض مصطلحات جنگ ہیں مثلاً ساقہ ، میمنہ ، میسرہ ، قلب ، جناح وغیرہ ۔ ابتدا میں دقیقی کے تتبع میں فارسی راست ، چپ ، میان گاہ ، پس پشت ، یک دست اور دست دگر کی ترویج کی لیکن بعد میں ان کو ترک کر کے عربی اصطلاحات پر قناعت کر لی ۔ عربیت سے فردوسی کا اجتناب اس ایک چھوٹی سی مثال سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مختصر اور پیش پا افتادہ الفاظ تعبیر اور معبر سے اعراض کر کے

ان کی جگہ ایسے لمبے فارسی الفاظ مثلاً 'گزارش خواب' 'گزاریدن خواب' اور 'گزارندۂ خواب' لاتا ہے ۔ قدما نے یہی سلوک 'عید قربان' کے ساتھ کیا ہے جس کو 'جشن گو سفند کشان' یا ' عید گوسفند کشان' کہا جاتا تھا ۔ رودکی :

باد بر تو مبارک و خنشان

جشن نوروز گوسفند کشان

لیکن سلجوقی عہد سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ اقلیم زبان پر بھی انقلاب لاتا ہے ۔ اس دور کی نسلوں کا مذاق بدل چکا تھا ۔ اس عہد میں دری فارسی یا خالص فارسی لکھنا بد مذاق میں داخل تھا ۔ عربی نمونوں کے مطابق سجع نے فارسی میں بھی اپنا قدم جمایا جس کے خلاف بعض حلقوں میں صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی ۔ نئے مذاق اور سجع پسندی نے زبان پر عربی الفاظ کا عنصر غالب کر دیا جس کے لیے کوئی خطِ حد بندی قائم نہیں رہا ۔ اس زمانے کے ادیب خالص فارسی لکھنے سے لوگوں کو مانع آتے تھے ۔ امیر کیکاؤس قابوس نامہ میں لکھتا ہے :

"و اگر نامۂ بود پارسی ، پارسی مطلق منویس کہ ناخوش بود ۔ خاصہ پارسی دری کہ نہ معروف بود ۔"

(باب سی و نہم)

عربی کے واسطے جو جنون اس دور میں محسوس ہو رہا تھا اس کی وسعت اس مثال سے مفہوم ہو سکتی ہے کہ قدما کے ہاں 'شگفت بماندن ، ایک عام محاورہ ہے ۔ شاہ نامہ :

ز گفتار او ماند خسرو شگفت

چو شرم آمدش پوزش اندر گرفت

(صفحہ ۷٦ ، جلد چہارم)

اب یہ محاورہ اگرچہ جاری رہتا ہے لیکن اس اصلاح کے ساتھ کہ 'شگفت ماندن' کے بجائے 'عجب ماندن' نے رواج پایا اور

میدان وقت گزرنے پر موخرالذکر ہی کے ہاتھ رہا ۔

یہی سلوک قدما کے محاورے 'بند بستن' کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ شاہ نامہ :

(۱) بہ فرمود تا رفت سہراب پیش
بہ بستند بندی بہ آئین و کیش
(صفحہ ۴۴ ، جلد اول)

(۲) بہ بستند بندی بہ آئین و کیش
بدانسان کہ بود آن زمان دین و کیش
(صفحہ ۶۷ ، جلد اول)

متأخرین نے اس میں بھی یہی ترمیم کی کہ فارسی 'بند' کو ترک کر کے اس کی جگہ عربی 'عقد' کو رواج دیا ۔ زلیخا :

بتزویج پیغمبر پاک دین
بدین پرہنر دختر مہ جبین
بخوان خطبہ و عقد شان بستہ کن
دل ہر دو شان را ز ہم رستہ کن
(صفحہ ۲۲۲)

آج 'بند بستن' اسی قدر غیر معروف ہے جس قدر کہ اس کا قائم مقام 'عقد بستن' یا 'عقد کردن' مشہور ہے ۔

زلیخا کی عربیت پر نظر ڈالتے ہوئے مشکل سے امید کی جاتی ہے کہ وہ فردوسی یا اس کے عہد کی تصنیف ہو کیوں کہ جب شاہ نامہ اس نے زبان رائج الوقت میں لکھا ہے تو زلیخا کی زبان کو سکہ رائج نہیں کہا جا سکتا ۔ زلیخا کے عہد کی زبان پر عربیت زیادہ غالب تھی ۔ ان دونوں کی زبان کا فرق دکھانے کے لیے میں ذیل کی مثال پیش کرتا ہوں ۔ شاہ نامہ :

ازین راز جان تو آگاه نیست

درین پرده اندر ترا راه نیست

(جلد اول ، صفحه ۸۵ ، تمہید داستان سہراب)

زلیخا :

کس از سر این حکمت آگاه نیست

درین پرده مخلوق را راه نیست

(صفحه ۱۵۱)

صاحب زلیخا نے اپنے زمانے کے مذاق کے مطابق عربی الفاظ لا کر فردوسی کی زبان کی کہنگی کو بر طرف کر دیا اور شعر پر اپنا قبضہ کر لیا ۔

شاہ نامے پر ایک سرسری نظر

اس وقت تک تصویر کا ایک پہلو معائنہ کیا گیا ہے ۔ تصویر کے دوسرے پہلو کے بغیر ہماری تحقیقات کا پورا مرحلہ طے نہیں ہو سکتا ۔ اس مثنوی کا سرسری مشاہدہ، اس علم کے لیے کافی ہے کہ مصنف یوسف زلیخا ، فردوسی کے ایسے کلمات اور فقرات سے جو شاہ نامے میں روزمرہ کا حکم رکھتے ہیں اور فردوسی جن کی تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا ، یوسف زلیخا کے دوران میں بالکل اجنبی معلوم ہوتے ہیں ۔ یہاں ایسے سینکڑوں کلمات سے بخوف طوالت صرف چند نمونوں پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

ابی : کلمۂ نفی بمعنی بی ۔ امثال از شاہ نامہ :

(۱) ابی آن کہ بد ایچ بیماری

نہ از درد ها هیچ آزاری

(صفحہ ۴۸ ، جلد اول)

(۲) همه چین برو زار و گریان شدند
ابی آتش از درد بریان شدند
(صفحه ۹٦ ، جلد چهارم)

شاه نامے میں اگرچہ عموماً مستعمل ہے زلیخا سے قطعاً خارج کر دیا گیا ہے -

اسدی :

ابی آفتابا ترا چیست حال
چنین تیره شب دل گرفتم ملال
(گرشاسپ نامہ ، صفحہ ٦٧ ، طبع آقا محمد شیرازی ، بمبئی)

ایدون : بمعنی اکنون و چنین -

شاہ نامہ :

(۱) سر بالوانی و هم مهتری
من ایدون گمانم که تو مادری
(صفحه ۱۰۵ ، جلد اول)

(۲) من ایدون شنیدم که جای مهی
همی مردم ناسزا را دهی
(صفحه ۱۱۳ ، جلد چهارم)

یہ لفظ بھی زلیخا سے غیر حاضر ہے اور اسدی کے ہاں موجود ہے :

من ایدون ز طبعم بهار آورم
مر این شاخ را نو ببار آورم
(صفحه ۱۱ ، گرشاسپ نامه)

چنان چون : یہ ترکیب قدما کے ہاں اکثر رائج ہے - دقیقی :

نوشتم من این نامهٔ شاهوار
چنان چون بود در خور شهریار
(شاه نامه ، صفحه ۴ ، جلد سوم)

فردوسی :

(۱) بیامد ز بازار مردی هزار
چنان چون نہ زیبندۂ کار زار
(شاہ نامہ ، صفحہ ۱۳ ، جلد سوم)

(۲) چنان چون بدم کہتر کیقباد
کنون از تو دارم دل و مغز شاد
(شاہ نامہ ، صفحہ ۳۲ ، جلد سوم)

اسدی :

ز دل برکشد می تف درد و تاب
چنان چون بخار از زمین آفتاب
(گرشاسپ نامہ ، صفحہ ۱۵)

زلیخا میں متروک ہے ۔

تفت : بمعنی گرم ۔ شاہ نامے میں عام طور پر ملتا ہے ۔

امثال :

(۱) سپہ بد بدژ روی بنہاد تفت
بکردار بازارگانان برفت
(شاہ نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۲۳)

(۲) مقاتورہ از پیش خاقان برفت
بیامد سوی خرگہ خویش تفت
(شاہ نامہ ، جلد چہارم ، صفحہ ۸۸)

اسدی :

وزآنجا سپہ راند و بشتافت تفت
بشادی بشہری ز سنجاب رفت
(گرشاسپ نامہ ، صفحہ ۵۹)

زلیخا میں رائج نہیں ۔

یارمند : شاہ نامے میں عام طور پر ملتا ہے ۔ امثال :

(۱) بدارندهٔ آفتاب بلند
که باشم شما را بدو یارمند
(شاه نامه ، جلد چهارم ، صفحه ۷۳)

(۲) نخواهم که آید شما را گزند
مباشید با من به بد یارمند
(صفحه ۱۲۳ ، جلد چہارم)

اسدی :
بود کاخترت یارمندی کند
همه دشمنت دل لژندی کند
(ملحقات شاه نامه ، صفحه ۹)

گمانیدن : امثال از شاه نامه :

(۱) گمانند کین بیشه پر خون شود
ز دشمن زمین رود جیحون شود
(صفحه ۱۲۱ ، جلد چہارم)

(۲) ازان کو هم آواز و هم کیش اوست
گمانم که قیصر بتن خویش اوست
(صفحه ۱۰ ، جلد چہارم)

اسدی :
ز رستم همی چون که خواهی شنود
گمانی که چون او بمردی نبود
(گرشاسپ نامه ، صفحه ۱۰)

زلیخا میں نظر نہیں آتا ۔

گرایدونکه : قدما کے ہاں یہ ترکیب مستعمل ہے ۔ دقیقی :
گرایدونکه بپذیرد او پند ما
نساید همی پای او بند ما
(شاه نامه ، جلد سوم ، صفحه ۴)

فردوسی :

(۱) گرایدونکہ از دشت نیزہ وران
بنالد کسی از کران تا کران
(شاہ نامہ ، جلد چہارم ، صفحہ ۵)

(۲) گرایدونکہ باز آرد آن‌راکہ گفت
گناہ گزشتہ بباید نہفت
(شاہ نامہ ، جلد دوم ، صفحہ ۱۹۰)

زلیخا میں مہجورالاستعمال معلوم ہوتا ہے -

ورایدونکہ : زلیخا میں سکۂ غیر رائج ہے -

دقیقی :

ورایدونکہ نپذیری این پند من
بسای گران آہنین بند من
(شاہ نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۴)

فردوسی :

(۱) ورایدونکہ زین کار ہستم گناہ
جہان آفرینم ندارد نگاہ
(شاہ نامہ ، جلد اول ، صفحہ ۱۰۷)

(۲) ورایدونکہ پیران کنند دست پیش
بخواہد سپہ یاور از شاہ خویش
(شاہ نامہ ، جلد دوم ، صفحہ ۱۲۸)

ارایدونکہ : قدما اکثر یہ ترکیب استعمال میں لاتے ہیں -

دقیقی :

ار ایدونکہ بپذیری این نیک پند
ز ترکان بجانت نیاید گزند
(شاہ نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۴)

فردوسی :

بدو گفت ار ایدونکہ کین نیا

نجوئی ندار ی بدل کیمیا

(شاہ نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۱۵)

(۲) ارایدونکہ پیران نخواہد نبرد

بانبوہ لشکر بیارد چوگرد

(شاہ نامہ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۳۵)

زلیخا میں نامعلوم ہے ۔

برآنہم نشان : یعنی ہمان طور ۔ شاہ نامے میں یہ ترکیب کثرت سے ملتی ہے زلیخا میں نہیں ملتی ۔ شاہ نامہ :

(۱) بریزند خونش بر آنہم نشان

کہ او ریخت خون سر سرکشان

(صفحہ ۵۷ ، جلد چہارم)

(۲) برآن ہم نشان تا قباد بزرگ

کہ از داد اومیش شد خویش گرگ

(صفحہ ۷۸ ، جلد چہارم)

تنگ آندر آمدن : نزدیک آمدن ۔ بالعموم شاہ نامے میں آتا ہے ۔ شاہ نامہ :

(۱) چوجاماسپ تنگ اندر آمد ز راہ

ورا باز دانست فرزند شاہ

(صفحہ ۴ ، جلد سوم)

(۲) دو لشکرچوتنگ اندر آمد ز راہ

از آن سو سپہدار ازین سوی شاہ

(صفحہ ۲۶ ، جلد چہارم)

مثنوی یوسف زلیخا میں یہی مقصد یوں ادا ہوا ہے :

(۱) شدم تا بہ نزدیک آن شہر تنگ
کہ ناگہ برآمد یکی بوی و رنگ
(صفحہ ۱۰۶)

(۲) بہ گفت این و تنگ اندرون شد برش
کہ بوسہ رباید ز دو شکرش
(صفحہ ۱۰۹)

فرمان کردن : اطاعت کردن ۔ شاہ نامے میں کثرت کے ساتھ آتا[1] ہے ۔ امثال :

(۱) چنین داد پاسخ کہ فرمان کنم
بدین آرزو جان گروگان کنم
(صفحہ ۲۸۳ ، جلد دوم)

(۲) اگر باز خواہی تو فرمان کنیم
بنوی یکی تازہ پیمان کنیم
(صفحہ ۵۳ ، جلد سوم)

زلیخا میں غیر مستعمل ہے ۔

بزار : ای بزاری ۔ شاہ نامے میں آتا ہے ۔ امثال :

(۱) خروشی برآمد ز ایران بزار
جہان شد پر از نام اسفند یار
(صفحہ ۴۴ ، جلد سوم)

(۲) کہ بگریستی بر مسیحا بزار
دو رخ سرخ و مژگان چو ابر بہار
(صفحہ ۹۷ ، جلد چہارم)

---

۱ ۔ ابوالفتح بستی کا یہ شعر :

یکی نصیحت من گوش دار و فرمان کن
کہ از نصیحت سود آن کند کہ فرمان کرد

(مرتب)

زلیخا میں معدومیت کا حکم رکھتا ہے ۔

کیمیا : حیلہ و تدبیر ۔ شاہ نامے میں عموماً نظر آتا ہے ۔
امثال :

(۱) یکی آن کہ گفتی کہ کین نیا
بجستم من از چارہ و کیمیا
(صفحہ ۲۶ ، جلد سوم)

(۲) بزین اندر افگند گرز نیا
پر از جنگ سر دل پر از کیمیا
(صفحہ ۲۱۲ ، جلد دوم)

زلیخا اس لفظ سے واقف نہیں ۔

پیران سر : ای پیرانہ سر ۔ شاہ نامہ ۔ امثال :

(۱) مگر باز گردد ز بد نام من
بہ پیران سر این بد سرانجام من
(صفحہ ۲۱۳ ، جلد دوم)

(۲) نہ بینی کزین بی ہنر دخترم
چہ رسوائی آمد بہ پیران سرم
(صفحہ ۲۰۹ ، جلد دوم)

دست بکش کردن : ای دست بر سینہ[1] نہادن ۔ شاہ نامے میں عموماً آتا ہے ۔ امثال :

---

۱ ۔ حافظ کے اس شعر میں ، جو فرہنگ شاھنامہ میں ڈاکٹر شفق نے بھی دیا ہے ، بغل کے معنی دیتا ہے :

می بزیر کش و سجادۂ زاھد بر دوش
وای اگر خلق شود واقف ازین تزویرم
(مرتب)

(۱) بکاخ اندرون شد پرستار وش
بر شاه بردست کرده به کش
(صفحه ۲۰۹ ، جلد دوم)

(۲) به فرمود تا لنبک آب کش
بر شاه بر دست کرده به کش
(صفحه ۱۱۴ ، جلد سوم)

زلیخا میں نایاب ہے ۔

گروگان[1] **کردن :** ای گرو کردن ۔ بالعموم شاہ نامے میں ملتا ہے اور زلیخا میں نادر ہے ۔ امثال از شاہ نامہ :

(۱) شما داد جوئید و فرمان کنید
روان را به پیمان گروگان کنید
(صفحه ۹۰ ، جلد سوم)

(۲) همه پیش تو جان گروگان کنیم
ز دیدار تو رامش جان کنیم
(صفحه ۱۶ ، جلد سوم)

بادگشتن : شاہ نامے میں عموماً نظر آتا ہے اور زلیخا میں نہیں ملتا ۔ امثال :

(۱) کنون آنچه بد بود بر ما گزشت
گزشته همه نزد من باد گشت
(صفحه ۱۶ ، جلد سوم)

---

۱ ۔ گروگان : رهن ، مورد اعتماد ، مرهون ۔ از مسعود سعد :
من که مسعود سعد سلمانم
در کف جود تو گروگانم
(فرهنگ شاهنامه ، رضا زاده شفق ، صفحه ۲۳۱)
(مرتب)

(۲) بداراب گفت آنچہ اندر گزشت
چنان دان کہ‌یکسرهمہ‌باد گشت
(صفحہ ۵۳ ، جلد سوم)

باد در مشت یا بدست ماندن : شاہ نامے کا عام محاورہ ہے ۔
امثال :

(۱) کہ ما را کنون جان باسپ اندرست
چو سستی کند باد ماند بدست
(صفحہ ۵٦ ، جلد سوم)

(۲) سپاہ اندر آید پس پشت من
نماند بجز باد در مشت من
(صفحہ ۲۲۲ ، جلد دوم)

(۳) بہ گیرند گردن کشان پشت اوی
نماند بجز باد در مشت اوی
(صفحہ ۲۲۹ ، جلد دوم)

(۴) بدین شہر درویشی و رنج هست
ازین بگزری باد ماند بدست
(صفحہ ۷٦ ، جلد سوم)

زلیخا میں معدوم ہے ۔

هوش باز آوردن : زلیخا میں نظر نہیں آتا ۔ شاہ نامہ :

(۱) چنین داد پاسخ کہ باز آر هوش
کہ من پور قیدافہ ام قیدروش
(صفحہ ٦۷ ، جلد سوم)

(۲) بدوگفت گرگین کہ باز آر هوش
سخن بشنود بهن بکشای گوش
(صفحہ ۲۰۱ ، جلد دوم)

کام کژی خاریدن : شاہ نامے میں دیکھا جاتا ہے اور زلیخا

نا واقف ہے ۔ امثال :

(۱) بجان امشبی دادمت زینهار
بایوان رسی کام کژی مخار
(صفحہ ۳۹ ، جلد سوم)

(۲) چنین گفت با شاهزاده نخوار
کہ با مردمی کام کژی مخار
(صفحہ ۱۰۹ جلد چهارم)

آب از تارک برتر گزشتن : شاہ نامہ :

(۱) ز تارک مرا آب برتر گزشت
غم و شادمانی همہ باد گشت
(صفحہ ۹٦ ، جلد چهارم)

(۲) سپہ را زکوشش سخن درگزشت
ز تارک دم آب برتر گزشت
(صفحہ ۵۷ ، جلد سوم)

کسی را بکس نداشتن : شاہ نامہ :

(۱) بگیتی ندارد کسی را بکس
تو گوئی کہ نوشیروان ست و بس
(صفحہ ۱۷ ، جلد چهارم)

(۲) ندارد ز شاهان کسی را بکس
چہ کہتر چہ از شاہ فریاد رس
(صفحہ ۱۳ ، جلد چهارم)

کس بکس نشمردن : شاہ نامہ :

(۱) ز مردی و گردی بما ننگرید
ازین مرز کس را بکس نشمرید
(صفحہ ۱۲۸ ، جلد سوم)

(۲) ز دیدار من گوی بیرون برد
ازین انجمن کس بکس نشمرد

زلیخا میں عنقا ہے -

بیدار دل باش و روشن روان : ایک قسم کی دعا ہے جو شاہ نامے میں اکثر آتی ہے - امثال :

(۱) سپہ آفرین خواند بر پہلوان
کہ بیدار دل باش و روشن روان
(صفحہ ۱۸۱ ، جلد دوم)

(۲) چنین داد پاسخ بدو پہلوان
کہ بیدار دل باش و روشن روان
(صفحہ ۱۷۹ ، جلد دوم)

زلیخا میں نامعلوم ہے -

کلید و بند: ان کی ترکیب سے شاہ نامے میں کئی محاورے بنائے گئے ہیں - امثال :

(۱) خبر چون بہ نزدیک توران رسید
مر آن بند را ساختہ شد کلید
(صفحہ ۱۰۹ ، جلد اول)

(۲) ستم بر سیاؤش ازیشان رسید
کہ زو آمد این بند بد را کلید
(صفحہ ۱۸۷ ، جلد دوم)

(۳) بسی بر نیامد کہ پاسخ رسید
یکی نامہ بد بند او را کلید
(صفحہ ۲۶ ، جلد دوم)

(۴) منوچہر ازان تخمہ آمد پدید
شد آن بند ها را سراسر کلید
(صفحہ ۱۲۶ ، جلد چہارم)

زلیخا میں مطلق غیر حاضر ہے ۔ نظامی کے ہاں بند کے بجائے قفل آتا ہے ۔

آب و جوی : ان کی ترکیب سے شاہ نامے میں کئی محاورے ملتے ہیں ۔ امثال :

(۱) بمنذر چنین گفت بہرام گور
که اکنون که شد آب درجوی شور
(صفحہ ۱۰۹ ، جلد سوم)

(۲) یکی چاره سازم که بدگوی من
نراند بزشت آب در جوی من
(صفحہ ۸۶ ، جلد سوم)

(۳) چنین گفت رستم که این روی نیست
ره آب گردان بدین جوی نیست
(صفحہ ۲۰۰ ، جلد دوم)

(۴) همه زین شمارند و این روی نیست
مر این آب را در جهان جوی نیست
(صفحہ ۱۸۹ ، جلد دوم)

باد سرد از جگر کشیدن : فردوسی شاہ نامے میں اس محاورے کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہے اور بار بار اس کو دہراتا ہے اور تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا ۔ میں صرف چند امثال پر قناعت کرتا ہوں ۔ حیرت ہے کہ فردوسی کا نہایت مقبول محاورہ زلیخا سے بالکل متروک ہے ۔ شاہ نامہ :

(۱) چو پیغام گرگین برستم رسید
یکی باد سرد از جگر بر کشید
(صفحہ ۲۱۳ ، جلد دوم)

(۲) یکی باد سرد از جگر بر کشید
بسوی گلہ‌دار قیصر کشید
(صفحہ ۲۸۰ ، جلد دوم)

(۳) بد و داد پس گنجہا را کلید
یکی باد سرد از جگر بر کشید
(صفحہ ۹۴ ، جلد سوم)

(۴) چو رومی سر و تاج کسریٰ بدید
یکی باد سرد از جگر بر کشید
(صفحہ ۴۲ ، جلد چہارم)

محاکمہ

تصویر کے دونوں پہلو امتحان کرنے اور گزشتہ بیانات کو ذہن میں رکھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ نامے اور یوسف زلیخا کی زبان میں وہ فرق بین موجود ہے جو کسی صورت میں ایک ہی وقت کے دو معاصرین کی زبان میں تصور نہیں کیا جا سکتا چہ جائے کہ ایک ہی مصنف کی زبان میں خیال کیا جائے ۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ ان کو دو شخص مانیں اور وہ بھی ایسے جو مختلف العصر اور مختلف الوطن ہوں ۔ ہمارے وجوہ حسب ذیل ہیں :

(۱) دونوں مثنویوں کے مخصوصی خط و خال جو ایک مصنف کی جملہ تصنیفات کے عام جوہر ہونے چاہییں باہم مشترک نہیں ۔ مثلاً ابی ، ایدون ، گرایدونکہ ، ور ایدونکہ ، کیمیا ، پیران سر ، برآن هم نشان ، بزار ، گروگان کردن ، باد در مشت ماندن ، کس بکس شمردن ، باد سرد از جگر کشیدن ، و غیرہ وغیرہ جن سے شاہ نامے کے دوران میں علی‌التواتر ہم روشناس ہوتے رہتے ہیں ، زلیخا میں ابتدا ہی سے نامعلوم ہیں ۔ علیٰ‌ہذا زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً نکوئی ، خوار بار ، جلدی ، بمزاد ، غریو و غرنگ ، بند وکشای

وغیرہ وغیرہ شاہ نامے میں ایک نامعلوم کمیت کا حکم رکھتے ہیں ۔

(۲) بعض مفرس الفاظ مثلاً ملکت ، عفو ، لطف ، میشوم ، عمداً ، عماری ، مشاطہ کی ترویج بظاہر سلجوق عہد میں ہوئی ہے اسی لیے اس دور کے شعرا میں ان کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے یعنی منوچہری ، ناصر خسرو ، اسدی ، امیر معزی ، مسعود سعد سلمان ، عثمان مختاری ، حکیم سنائی ، عمعق بخاری ، ادیب صابر وغیرہ ۔ فردوسی جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا جا چکا ہے ان الفاظ کے لیے کم سے کم قاعدۂ تفریس سے بالکل بے خبر ہے اور جب زلیخا میں ان کا رواج ہے تو بدیہی ہے کہ یہ کتاب سلجوقی[1] دور میں کسی وقت لکھی گئی ہوگی ۔

(۳) بعض محاورے مثلاً گوش داشتن ، گرہ بر زدن ، جب کہ فردوسی کے ہاں اکثر لغوی معنوں میں آتے ہیں مثنوی یوسف زلیخا میں کنایات کا درجہ حاصل کر کے کچھ اور ہی مفہوم ادا کرتے ہیں اور یہ بات ایک عہد میں حاصل نہیں ہو سکتی ۔

(۴) بعض محاورے جو زلیخا میں بالعموم نظر سے گزرتے ہیں فردوسی ان سے واقف معلوم نہیں ہوتا مثلاً صورت بستن ، عتاب برداشتن ، دل برگماردن ، گرمی نمودن ، گمان زدن وغیرہ ۔ ان کی صورت کہہ رہی ہے کہ ہماری ولادت فردوسی کے عہد سے بہت عرصے بعد ظہور میں آئی جب کہ تکلف اور رنگینی زبان میں شائع ہو چکی تھی ۔

---

۱ ۔ حافظ صاحب کے اس قیاس کی صحت کا اندازہ اس وقت ہوا جب ایران میں یوسف و زلیخا کا ایک ایسا نسخہ ہاتھ لگا جس کے مقدمے میں یہ تصریح موجود تھی کہ یہ مثنوی ملک شاہ سلجوقی کے دور میں اس کے بھائی طغان شاہ کے لیے لکھی گئی تھی ۔

(مرتب)

(۵) بعض الفاظ جب کہ شاہ نامے میں رائج ہیں ، زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتے ہیں اور ان کے بجائے اور لفظ لائے گئے گئے ہیں ۔ مثلاً 'بویژہ' اور 'ویژگان' شاہ نامے میں ملتے ہیں اور زلیخا میں پہلے لفظ کے بجائے 'بخاصہ' آتا ہے ۔ شاہ نامے کے 'بندبستن' کے بجائے زلیخا میں 'عقد بستن' ہے ۔ شاہ نامے کے 'باد سرد' کا قائم مقام زلیخا میں 'آہ' ہے اور شاہ نامے کے 'گزارید نِ خواب' کے بدلے زلیخا میں 'تعبیر' ملتا ہے ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نامہ اور زلیخا کی زبانوں میں بہت فرق ہے ۔ اگر شاہ نامہ ، فردوسی کی زبان کا معیار صحیح ہے تو زلیخا فردوسی کے قلم سے ہرگز ہرگز نہیں لکھی گئی ۔ کیوں کہ فردوسی کے لیے یہ خیال کرنا کہ جب وہ آفتاب لب بام اور پا بلب گور ہو رہا تھا اس وقت اپنی تازہ تصنیف زلیخا کے لیے نیا اسلوب ، نئی اصطلاحات اور نئے معانی ایجاد کر رہا تھا ، ایک ناممکن اور محال عقیدہ ہے ۔

(٦) دونوں اساتذہ کی وطنیت میں بھی اختلاف ضرور پایا جاتا ہے ۔ ہمارے پاس اس خیال کے موید یہ قرائن ہیں ۔

فردوسی شاہ نامے میں 'ساربان' کو ہمیشہ 'ساروان' لکھتا ہے ۔ زلیخا میں 'ساربان' آتا ہے ۔ اب 'ساربان' اور 'ساروان' ایک ہی خطۂ ملک میں نہیں بولے جا سکتے ۔ علیٰ ہذالقیاس 'ارج' اور 'ورج' ایک ہی شہر میں نہیں بولے جائیں گے ۔ جس وطن میں 'خرید و فروخت' بولنے کے عادی ہیں وہاں 'خرید و فروش' رائج نہیں ہوگا ۔ جس شہر میں 'کاریگر' معمار کے معنی دیتا ہے وہاں یہ لفظ ملازم کے معنی نہیں دے سکتا ۔ جس وطن میں 'آذین بستن' عوام میں بولا جاتا ہے وہ 'آئین بستن' نہیں کہیں گے اور 'غریویدن' جہاں شور اور فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے وہاں اس کو گریہ و زاری کے معنوں میں نہیں بولیں گے ۔ علیٰ ہذا پرس اور 'پرسش' ایک جگہ نہیں بولے جاسکتے ۔ اسی طرح 'پوشیدن' بجائے 'پوشانیدن' ، 'پرھیزیدن' بجائے 'پرھیزانیدن' اور

شنیدن بجاے شنوانیدن ایک وطن کی بولیاں نہیں ۔ اگر فردوسی کے وطن میں یہ الفاظ جو زلیخا میں ملتے ہیں بولے جاتے تھے تو فردوسی شاہ نامے میں ان کو ضرور لاتا اور یہ مابہ الامتیاز فرق دونوں تصنیفات میں نہ پایا جاتا لیکن اس فرق کی موجودگی دلیل ہے اس امر کی کہ دونوں اساتذہ کی وطنیت میں اختلاف ہے ۔

(۷) بعض محاورے اور الفاظ جب کہ دونوں مثنویوں میں مشترک ہیں ان میں یہ امتیاز دیکھا جاتا ہے کہ زلیخا میں جب کہ وہ روزمرہ بن گئے ہیں شاہ نامہ میں من قبیل شاذ لائے گئے ہیں ۔ مثلاً گوش داشتن ، تخت زدن ، ہمزاد ، قضا را ، استوار وغیرہ ۔ اس سے یہی عقیدہ مستنبط ہوتا ہے کہ دونوں استاد مختلف العہد ہیں ۔

(۸) بعض امثال کے ذریعہ سے دکھایا جا چکا ہے کہ فردوسی جس حالت میں کہ اداے مطالب کے لیے ایک محدود میدان میں کد و کاوش اور تگ و دو کرتا نظر آتا ہے ، صاحب زلیخا ایک فضاے بسیط پر قابض اور متصرف معلوم ہوتا ہے ۔ اس سے یہی احتمال ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کو ایک مدت دراز ایک دوسرے سے جدا کر رہی ہے اور فارسی زبان اس عرصے میں ترقی کرکے بہت کچھ وسیع ہو چکی ہے ۔

(۹) فردوسی اور صاحب زلیخا کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دونوں اساتذہ کی معلومات میں فرق ہے۔ فردوسی ارژنگ کو جادو ، نیرنگ اور تصویر کے معنوں میں لاتا ہے اور یہ معنی ایسے ہیں جن سے صاحب زلیخا واقف تک نہیں ۔ یہ بہت غیر مشہور معنی ہیں اور دیگر اساتذہ بھی عام طور پر نہیں جانتے ۔ شاہ نامے میں ارژنگ پانچ موقعوں پر تصویر کے معنوں میں آیا ہے ۔ اس تکرار سے ظاہر ہے کہ فردوسی کے نزدیک یہی معنی تھے ۔ وضاحت کے خیال سے 'ارژنگ چین' بھی لکھ دیا ہے تاکہ کسی کو مانی کے ارژنگ کا دھوکا نہ ہو ۔

فردوسی اگر یوسف زلیخا لکھتا توکیا وجہ ہے کہ وہ اپنے معلومہ معنی زلیخا میں ارژنگ کو نہ دیتا ۔ زلیخا میں 'ارژنگ مانی' چار مقام پر آیا ہے اور ہر مقام پر مانی کی کتاب یا مانی کے نگار خانے کے معنی دیتا ہے لیکن شاہ نامے والے معنی کبھی بھول کر بھی نہیں آتے ۔ کیا بقول شاعر :

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

فردوسی کو اسی برس کی عمر کے بعد زلیخا تصنیف کرتے وقت محقق ہوا کہ ارژنگ مانی کی کتاب کا نام ہے نہ تصویر اور نیرنگ جو معنی اس نے شاہ نامے میں دکھلائے ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فردوسی مانی کی تاریخ سے واقف ہونے کی بنا پر مانی کی کتاب ارژنگ کے وجود کا قائل نہیں تھا اسی لیے شاہ نامے میں اس کا ذکر نہیں کرتا اور اگر زلیخا لکھتا تو اس میں بھی اس قسم کی غلطی کے ارتکاب سے پرہیز کرتا ۔

(۱۰) یہاں کچھ منٹ کے لیے میں اپنے مبحث اصلی سے اعراض کرکے چند الفاظ ایک نئے مضمون کے متعلق کہنا چاہتا ہوں ۔ اس سے میرا مقصد اسدی اور اس کا گرشاسپ نامہ ہے ۔ اسدی کے متعلق ہمارے ہاں بہت کچھ غلط بیانیاں رائج ہیں ۔ اکثر اس کو فردوسی کا استاد مانتے ہیں ۔ نیز شاہ نامہ داستان یزدگرد خاتم تاجداران عجم سے خاتمے تک اسدی کا نظم کردہ بتایا جاتا ہے لیکن یہ نا قابل تسلیم قصہ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ نامے اور گرشاسپ نامے میں پورے اٹھاون سال کا تفاوت ہے ۔ گرشاسپ نامہ سنہ ۴۵۸ ہجری میں تصنیف ہوا چناں چہ گرشاسپ نامہ :

ز هجرت بدور سپهری که گشت
شده چار صد سال و پنجاه و هشت

گرشاسپ نامے کا عہد معلوم کر کے سب سے پہلے ہمیں یہ تحقیق

کرنا ہے کہ آیا بحیثیت عمر گرشاسپ نامہ متقدم ہے یا مثنوی یوسف زلیخا ۔

گرشاسپ نامہ اور مثنوی یوسف زلیخا میں بعض الفاظ اور محاورے عام ہیں مثلاً از آدم درون تا الخ ، تخت زدن ، کلہ زدن ، قضا را ، مشاطہ ، غریووغرنگ ۔ اب یہ الفاظ زلیخا گرشاسپ نامے سے لے رہی ہے یا گرشاسپ نامہ زلیخا سے ؟ اس کا تصفیہ یوں ممکن ہے کہ 'قضا را' زلیخا میں اس کی مکمل شکل میں ملتا ہے جیسے بوستان میں لیکن گرشاسپ نامہ میں وہ محض 'قضا' ہے اور یہ ظاہر ہے کہ 'قضا' اور 'قضا را' میں قضا زیادہ قدیم ہے ۔ اسی طرح 'بویژہ' شاہ نامے اور گرشاسپ نامے میں عام ہے لیکن زلیخا میں متروک ہے اور اس کا قائم مقام 'بخاصہ' لایا گیا ہے ۔ ان میں ظاہر ہے کہ 'بویژہ' قدیم ہے اور 'بخاصہ' جدید ۔ اس استدلال سے یہ قرینہ برآمد ہوتا ہے کہ زلیخا گرشاسپ نامے کے بعد کی تصنیف ہے[1] ۔ لیکن اس قیاس کو درجۂ یقین تک ارتقا دینے کے لیے ہمیں شاہ نامے کی طرف رجوع کرنا چاہیے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ نامے اور گرشاسپ نامے میں ایسے الفاظ مثلاً ابی ، ایدون ، بویژہ ، چنانچون ، تفت ، یارمند ، گہانیدن وغیرہ عام ہیں لیکن یہی الفاظ مثنوی یوسف زلیخا میں مہجور الاستعمال ہیں ۔ اگر زلیخا گرشاسپ نامے سے مقدم ہوتی تو یہ الفاظ اس میں قطعی پائے جاتے ۔ چوں کہ زلیخا میں موجود نہیں اس سے یہی قابل پذیرائی نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے

۱ ۔ حافظ صاحب کا یہ اندازہ بھی آگے چل کر صحیح ثابت ہوا ۔ کیونکہ ملک شاہ سلجوقی کا دور جس میں مثنوی یوسف زلیخا تصنیف ہوتی ہے ۴۶۵ سے ۴۸۵ ھ تک ہے جبکہ گرشاسپ نامہ سنہ ۴۵۸ھ میں تکمیل کو پہنچ چکا تھا ۔

(مرتب)

کہ اگرچہ گرشاسپ نامے کے دور میں رائج تھے لیکن زلیخا کے عہد میں متروک مانے جا کر آرائش طاق نسیاں بنا دیے گئے تھے ۔ اس سے زلیخا پر گرشاسپ نامہ کا تقدم ثابت ہوتا ہے ۔ جب گرشاسپ نامے کا تقدم ثابت ہو گیا تو شاہ نامے کا تقدم خود بخود ظاہر ہے کیوں کہ شاہ نامہ تو اسدی کی تصنیف سے پورے اٹھاون سال بڑا ہے ۔

(۱۱) ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کے محاورے اور روزمرہ کے بیسیوں کیا بلکہ سینکڑوں الفاظ صاحب یوسف و زلیخا کے نزدیک مہجور الاستعمال ہیں اور یہ ہمیں ماننا ہو گا کہ سینکڑوں کی تعداد میں الفاظ اور کلمات ایک قلیل مدت یا مہلت میں قلمرو زبان سے اخراج نہیں پا سکتے کیوں کہ زبان کسی ایک شخص کی ملک نہیں ۔ وہ تمام قوم اور ملک کی زبان ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ جب تک تمام قوم کسی کلمے یا لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے وہ کلمہ ترک نہیں ہو سکتا ۔ ہزاروں بشر ایک دم میں قتل اور ہلاک کیے جا سکتے ہیں اور لاکھوں نفوس چشم زدن میں صفحۂ ہستی سے محو کیے جا سکتے ہیں لیکن الفاظ کا قتل عام اس طرح عمل میں نہیں لایا جا سکتا ۔ ان کی اگر موت ہوتی ہے تو اکثر طبعی ہوا کرتی ہے جب کہ ملک کو ان کی ضرورت نہیں رہتی اور ان سے بہتر جانشین اور قائم مقام پیدا ہوجاتے ہیں ۔ مثلاً فردوسی کا ''خورشید چون توان نہفتن'' اسدی کے ہاں 'خورشید بگل نتوان پوشیدن' بنا اور یوسف زلیخا میں 'شمس بگل اندودہ داشتن' بن کر لباب الالباب میں 'چشمہ آفتاب بگل اندودن' بن گیا ۔ وقس علیٰ ذالک فردوسی کی ضرب الامثال 'بفردا نمان کار امروز را' اور 'آب از تارک برتر گزشتن' اصلاح پاکر موجودہ شکل میں 'کار امروز بفردا مگزار' اور 'آب از سرگزشتن' بن گئے ۔

مختصر یہ کہ الفاظ اور محاورات کا روزمرہ سے اخراج ایک دور دراز عمل ہے اور یہ عمل عمروں میں ختم ہوتا ہے ۔ سینکڑوں

کلمات اور محاورات کا اقلیم زبان سے اخراج اور اس کا عمل دس بیس پچاس سال کا کام نہیں ہے بلکہ صدیوں کا ۔ اس سے میرا مقصد شاہ نامہ اور یوسف زلیخا کے زمانوں کی طرف ایما کرنا ہے جن کے درمیان میں میری رائے میں کم و بیش ایک اور نصف صدی کا فاصلہ حائل ہے ۔

زلیخا کے عصر تصنیف کو ایک خاص مدت میں حصر کرنے کے لیے میرے پاس دو قرینے ہیں ۔ پہلا گرشاسپ نامۂ اسدی سنہ ۴۵۸ھ ، اور یہ پیشتر دکھایا جا چکا ہے کہ زلیخا بہ لحاظ عصر گرشاسپ نامے سے متاخر ہے ۔ دوسرے سکندر نامۂ مولانا نظامی گنجوی جو سنہ ۵۹۷ھ میں تصنیف ہوا ہے :

بتاریخ پانصد نود هفت سال
که خوانندہ را زو نگیرد ملال

سکندر نامہ اور زلیخا میں مادہ فارق کی جستجو کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً 'ابا' بمعنی با ، 'ابر' بمعنی بر ، 'کجا' (بالکسر) (اردو میں جس کے معنی جو ، جب ، جہاں اور جیسے ہوں گے) خواندند ، راندند اور افشاندند (جن کے پڑھتے وقت پہلا نون بضرورت شعری پورا ظاہر کرنا ہوگا ۔ قدما میں یہ رواج بہت عام تھا ۔ مثلاً انوری :

اختران را شوکتت بر سمت طاعت راندہ
آسمان را نعمتت در زیر فرمان یافتہ

اس میں 'راندہ' کا نون بضرورت وزن پورا ظاہر کرنا ہوگا) سکندرنامہ میں یک قلم متروک ہیں ۔ اگرچہ یہ کلمات زلیخا کے عہد میں بھی آفتاب لب بام کا حکم رکھتے ہیں کیونکہ دیکھا جاتا ہے زلیخا میں وہ بہت کمی کے ساتھ آتے ہیں مثلاً کجا صرف پانچ مقام پر ملتا ہے اور خواندند وغیرہ صرف دو موقعوں پر ملتے ہیں ۔ اس سے یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ زلیخا کے ایام تصنیف ہی میں متروک ہو چلے تھے۔

آمدم بر سر قصہ جب یہ الفاظ زلیخا میں موجود ہیں اور سکندر نامہ میں غیر حاضر تو ظاہر ہے کہ سکندر نامہ زلیخا سے بعد کی تصنیف ہے اور زلیخا کا عصر سکندر نامہ سے مقدم ہے ۔ اس طرح قرن ششم کے منتصف[1] اول میں زلیخا کی تصنیف کے واسطے ہماری نگاہ جمتی ہے ۔

حدیقۂ حکیم سنائی جو سنہ ۵۲۴ و سنہ ۵۳۵ھ کے درمیان لکھا گیا ہے ۔ چناں چہ حدیقہ :

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام
پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اگرچہ بعض آثار اور علامات سے پایا جاتا ہے کہ وہ زلیخا کے ہم عہد ہے لیکن بعض خط و خال اس قسم کے ہیں جو حدیقہ پر زلیخا کے تقدم کو ثابت کرتے ہیں ۔ مگر اس سے میرا اسی قدر مقصد ہے کہ قرن سادس کا منتصف اول زلیخا کی ولادت کا بہتر زمانہ ہو سکتا ہے ۔ انھی ایام میں زلیخا کی تصنیف منضبط کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک اور قرینہ ہے اور وہ یہ ہے کہ :

علاوہ اور اسالیب ایاسی کے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے زلیخا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب افعال معطوف و معطوف علیہ آتے ہیں فعل معطوف علیہ عام اس سے کہ واحد ہو یا جمع ، غائب ہو یا حاضر یا متکلم فعل معطوف بصیغۂ واحد غائب لایا جائے گا ۔ امثال :

---

۱ ۔ جیسا کہ اس سے قبل حاشیے میں درج کیا جا چکا ہے مثنوی یوسف و زلیخا کا قرن پنجم کے منتصف دوم سے علاقہ دریافت ہو چکا ہے ۔

(مرتب)

شعر

قبا بست و چابک نوردیده دست
قبایش دریدند و دستش شکست
(بوستان سعدی ، سنہ ۶۵۵ھ)

اس مثال میں 'دریدند' کی تبعیت میں شکستند لایا جاتا ۔

مثال دیگر

"اسعاف ملتمس او را رحمہ اللہ لازم شمردم و اجابت دعوتش فریضہ دانست۔"

(المعجم فی معاییر اشعار العجم من شمس الدین محمد بن قیس۔ سنہ ۶۱۴ھ)

اس مثال میں 'فریضہ دانستم' آنا چاہیے تھا ۔

مثال دیگر

زندہ شد مردمی حاتم و مردی رستم
چون بہ بزم اندرنشستی و برزم اندر خاست

لطیف الدین زکی مراغۂ در مدح معزالدین سنجر حسین بن علی
(لباب ، باب یازدھم ، صفحہ ۳۷۶)

اس مثال میں 'خاستی' ہوتا ۔

مثال دیگر

از پای درفتادم و از دست شدکہ چشم
روزی نہ دید از تو مراعات سرسری

محمد بن علی الکاشانی ۔ (لباب ، باب ھفتم ، صفحہ ۱۸۴)
اس مثال میں 'از دست شدم' آتا ۔

مثال دیگر

دادی بوصل وعده وانگه بطنز گفت
چیزی که کس نیافت تو از من مدار چشم

جمال الدین الازہری المروزی (لباب ، فصل دوم از باب هفتم ، صفحه ۲۱۵)
اس مثال میں 'گفتی' موزوں تھا ۔

مثال دیگر

''و یکی از لطافت طبع او آن بود که مطائباتی که در حق او گفته بودند یاد داشتی و حکایت کرد ۔''

محمد عوفی (لباب الالباب ، باب یازدهم ، صفحه ۳۹۳)
یہاں 'حکایت کردی' درست تھا ۔

مثال دیگر

''آن اسیران را اگر برین جمله که فرمودیم باوطان و بلاد خویش نرسانند و یک کودک بازگیرند هرچه راندیم و بقلم آورد و بنوشت جمله بجا آوریم ۔''

نامۂ سلطان سنجر بعظیم الروم از انشای معین اصم ۔
(لباب ، تعلیقات میرزا محمد بن عبدالوهاب قزوینی ، صفحه ۳۱۷)
یہاں 'بقلم آوردیم و نوشتیم' لایا جاتا ۔
یہی اسلوب مثنوی یوسف و زلیخا میں مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔
امثال :

(۱) چو فارغ شد از پند و اندرز مرد
به بستند پیمان و سوگند خورد

(زلیخا ، صفحه ۵۱)
یہاں 'به بستند' کی تبعیت میں 'سوگند خوردند' لایا جاتا ۔

(۲) لہ سوگند خوردی و پیمان گرفت
گوا بر تن خویش یزدان گرفت
(زلیخا ، صفحہ ۵۱)

اس مثال میں 'گرفتی' لایا جاتا ۔

(۳) گرستند و یک چند زاری نمود
ولیکن گرستن نمی داشت سود
(صفحہ ۸۱ ، زلیخا)

اس موقع پر 'زاری نمودند' کہا جاتا ۔

(۴) سراسر بدان ده برادر سپرد
همہ راه کنعان گرفتند و برد
(صفحہ ۲۰۸ ، زلیخا)

اس مقام پر 'بردلد' آتا ۔

میں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلوب شاہ نامے سے مطلق غیر حاضر ہے ، نہ گرشاسپ نامے ، حدیقہ' سنائی اور سکندر نامے میں پایا جاتا ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تمام ممالک ایران میں اس کا رواج نہیں رہا ہے بلکہ خاص خاص خطوں میں جن میں ماوراءالنہر کا نام قابل ذکر ہے ۔ کیوں کہ امثلہ' بالا کے اکثر قائل ماوراءالنہری ہیں مثلاً محمد عوفی ، محمد بن علی الکاشانی اور لطیف الدین زکی مراغہ' ۔ جوں جوں خروج چنگیز خاں کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے یہ اسلوب اور بھی مقبول ہوتا جاتا ہے حتٰی کہ قرن سابع کے ربع اول کے مصنفین کے ہاں اس کو ایک ممتاز پایہ مل گیا ہے اور بقول علامہ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی یہ اسلوب غریبہ لباب الالباب ، جوامع الحکایات ، تذکرۃ الاولیا فریدالدین عطار اور المعجم فی معاییراشعارالعجم میں عام طور پر رائج ہے ۔

گزشتہ امثال میں اس اسلوب کا ایک پرانا نمونہ معین الدین اصم دیوان انشای سلطان سنجر کے ہاں ملتا ہے ۔ چوں کہ یہ سلطان

سنجرسلجوق کا عصر ہے اس لیے اسی دور میں مثنوی یوسف وزلیخائے فردوسی بھی کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی جس کا مصنف بھی غالباً ماوراءالنہری ہو گا ۔

صاحب زلیخا کی مضمون دزدی

فردوسی کے مضمون دزدوں میں اسدی ، امیر کیکاؤس ، سنائی ، نظامی ، سعدی ، خسرو ، اور جامی کا نام تو سر داستان ہی لیا جا سکتا ہے ، ان کے علاوہ اور بھی نامعلوم ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے فردوسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے اور جو آج گوشۂ خمول میں بالش نشین ہیں ۔ ان میں سے میں اپنے مضمون کے حد و اندازے کو نگاہ رکھتے ہوئے یہاں صرف صاحب زلیخا کی مضمون دزدی کے انکشاف پر قناعت کرتا ہوں ۔

مصنف یوسف زلیخا ، ایسا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ نامے سے بخوبی واقف تھا کیوں کہ وہ فردوسی کے مشہور شعروں کی اکثر نقالی یا مقابلے کی کوشش میں مصروف دیکھا جاتا ہے ۔ یہ ایک اور غیر مترقبہ تائید[1] ہے ہمارے اس دعوے کی کہ مصنفین شاہ نامہ و یوسف زلیخا دو مختلف ہستیاں ہیں کیوں کہ فردوسی کی نسبت یہ خیال کرنا کہ زلیخا کے دوران میں وہ اپنے مشہور اشعار کی ایک مبتذل قسم کی نقالی کرنے لگا تھا ، بعید از عقل ہوگا ۔

ذیل میں چند امثال پر جو بلا مزید تفحص میری معلومات میں آئیں قناعت کی جاتی ہے ۔ اگر توجہ سے اور تلاش کی جائے گی تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فہرست المضاعف ہو جائے گی ۔

۱ ۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے اس دلیل کو یوسف و زلیخا کے فردوسی کی تصنیف ہونے کی تائید میں پیش کیا تھا ۔ ملاحظہ ہو مجلہ مہر کا فردوسی نمبر ۔ (مرتب)

مرا خوشتر آید بزندان درون
بزیر زنخ دست کرده ستون
(یوسف زلیخا طبع طهران صفحه ۱۳۶)

ورا دید بادیدگان پر ز خون
بزیر زنخ دست کرده ستون
(شاه نامه طبع بمبئی سنه ۱۲۷۵ھ صفحه ۲۸۱ ، جلد ۲)

کسی کوگریزد ز خورشید و ماه
چگونه کند سوی اختر نگاه
(یوسف زلیخا صفحه ۱۳۶)

دل من چو شد بر ستاره تباه
چگونه توان شاد بودن به ماه
(شاه نامه صفحه ۳۲ ، جلد ۱)

چو من بودمی بر سرکار خویش
دلم بسته بر شغل بازار خویش
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۱۴)

بدین تندی از من میازار بیش
که دل بسته بودم ببازار خویش
(شاه نامه ، صفحه ۲۱۴ ، جلد ۲)

ازین هر دو تن راست گفتار کیست
وزین نر و ماده گنهکار کیست
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۲۹)

به بینم کزین دو گنهگار کیست
بباد آفره بر سزاوار کیست
(شاه نامه ، صفحه ۱۰۵ ، جلد ۱)

دعا کن مگر ایزد کردگار
نشاند مرا کودکی در کنار
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۰۷)

و دیگر که از تو مگر کردگار
نشاند یکی کودکم درکنار
(شاه نامه ، صفحه ۸۶ ، جلد ۱)

بهر هفت کشور درون کس نماند
که او نامهٔ نام نیکت نخواند
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۹۶)

بگیتی جز از پاک یزدان نماند
که منشور تیغ ترا بر نخواند
(شاه نامه ، صفحه ۸۱ ، جلد ۱)

کس از سر این حکمت آگاه نیست
درین پرده مخلوق را راه نیست
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۵۱)

ازین راز جان تو آگاه نیست
درین پرده اندر ترا راه نیست
(شاه نامه ، صفحه ۸۵ ، جلد ۱)

بزیر پی پیلتان افکنم
بن و بیختان از جهان برکنم
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۶۳)

وگر هیچ کژی گمانی برم
بزیر پی پیلتان بسپرم
(شاه نامه ، صفحه ۳۳ ، جلد ۱)

به آرامگه شد همه دام و دد
بخفتند هر جانور نیک و بد
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۸۲)

نه آوای مرغ و نه هرای دد
زمانه زبان بسته از نیک و بد
(شاه نامه ، صفحه ۱۰۵ ، جلد ۲)

ز کشور بکشور سپاهت بود
فلک زیر فر کلاهت بود
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۱۸)

ز دریا بدریا سپاه ویست
جهان زیر فر کلاه ویست
(شاه نامه ، صفحه ۴۴۲ ، جلد ۲)

شب و روز بادت چنین ارجمند
ز چشم بدانت مبادا گزند
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۹۶)

بکام تو بادا سپهر بلند
ز چشم بدانت مبادا گزند
(شاه نامه ، صفحه ۴ ، جلد ۳)

بدل گفت خورسند گردم برنج
که در رنج باشد سر انجام گنج
(یوسف زلیخا ، صفحه ۱۹۳)

برنج اندرست ای خرد مند گنج
نیابد کسی گنج نابرده رنج
(شاه نامه ، صفحه ۳ جلد ۱)

از آغاز بنوشت نام خدای
کہ بوده است وهمواره باشد بجای
(یوسف زلیخا ، صفحہ ۲۰۳)

سر نامہ کرد آفرین خدای
کجا هست و باشد همیشہ بجای
(شاہ نامہ ، صفحہ ٦۵ ، جلد ۳)

همی داشتش صدره از جان فزون
از اندازهٔ مهربانی فزون
(یوسف زلیخا ، صفحہ ۳۸)

همی داشتم چون یکی تازه سیب
کہ از باد ناید بمن بر نهیب
(شاہ نامہ ، صفحہ ۴ ، جلد ۱)

دگر روز هنگام بانگ خروس
بغرید بر درگہ شاہ کوس
(یوسف زلیخا ، صفحہ ۲۱۰)

بشبگیر هنگام بانگ خروس
ز درگاہ برخاست آوای کوس
(شاہ نامہ ، صفحہ ۲۹ ، جلد ۳)

ز آئینۂ پیل و هندی درای
خروش و نوا رفتہ تا دور جای
(یوسف زلیخا ، صفحہ ١٦٢)

ز بس نالۂ بوق وکوس و درای
همی آسمان اندر آمد ز جای
(شاہ نامہ ، صفحہ ١٦٣ ، جلد ۱)

ان امثال سے ناظرین پر یہ بھی روشن ہوسکتا ہے کہ صاحب زلیخا نے فردوسی کی طرز اڑانے میں ایک بڑی حدتک کامیابی حاصل کی ہے

لیکن شاہ نامے اور یوسف زلیخا کا پایۂ نظم کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔ جدت اور معنی آفرینی ، جوش اور برجستگی جو خدائے سخن کا حصہ ہے زلیخا سے مطلق غیرحاضر ہے ۔ مجھ کو کل دو تین شعر زلیخا میں پسند آئے :

(۱) زمین زان کند فخر بر آسمان
که دارد ز لعل سمندت نشان
(صفحہ ۱۹۵)

(۲) بناخن گرہ بافت از مشکناب
درآویخت از گوشۂ آفتاب
(صفحہ ۱۲۲)

حدائق البلاغت میں آخری شعر فردوسی کے نام پر ہی نقل کیا ہے ۔ نظامی کے ہاں اسی مضمون پر اور ان ہی قوافی میں مجھ کو تین شعر ملے :

(۱) نہ گیسو کہ زنجیر از مشکناب
فروهشتہ چون ابری از آفتاب
(سکندر نامہ بری ، صفحہ ۲۷۶ ، طبع مطبع نامی لکھنؤ سنہ ۱۸۹۸ع)

(۲) شکن گیر گیسوش از مشکناب
زدہ سایہ بر چشمۂ آفتاب
(سکندر نامہ بری ، صفحہ ۱۸۶)

(۳) کمر بستۂ زلف او مشکناب
کہ زلفش کمر بستہ بر آفتاب
(سکندر نامۂ بری ، صفحہ ۲۳۰)

سچ تو یہ ہے کہ نظامی کی تینوں کوششیں اس شعر کے مقابلے میں ناکام رہی ہیں ۔

ذیل میں کچھ مثالیں اس قسم کی دی جاتی ہیں جن میں فردوسی

اور صاحب یوسف زلیخا کو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کرتے دیکھا جاتا ہے ۔ ان مثالوں میں شاہ نامے سے مقابلے کی خاطر مجھ کو زلیخا سے کچھ اشعار نکال دینا پڑے ہیں اور ایک مقام پر ایک شعر اضافہ کیا ہے ۔

یوسف زلیخا

تن پاک پیوستہ دارم بتو
دل مہربان بستہ دارم بتو
بہر سان کہ فرماندهی برسرم
ترا چون پرستندہ فرمان برم

پانچ شعر کے بعد

بگفت این و تنگ اندرون شدبرش
کہ بوسہ رباید ز دو شکرش
چو یوسف چنین دید بر پای جست
ز دست زلیخا برون برد دست
کہ داند کہ ازشرم چون بودچون
کہ ازشرم رخساروی شد چو خون
چنان گشت لرزان ز بیم خدای
ندل ماند باوی نہ دانش نہ رای
(آمدن زلیخا نزد یوسف و صحبت داشتن ،
یوسف زلیخا صفحہ ۱۰۹)

شاہ نامہ

من اینک بہ پیش تو استادہ ام
تن و جان شیرین ترا دادہ ام

زمن هر چه خواهی همه کام تو
بر آرم نه پیچم سر از دام تو
سرش تنگ بگرفت ویک بوسه داد
همانا که از شرم ناورد یاد
رخان سیاوش چو خون شد ز شرم
بیاراست مژگان بخوناب گرم
چنین گفت با دل که از کار دیو
مرا دور داراد گیهان خدیو

(رفتن سیاوش بار دوم پیش سودابه، شاه نامه صفحات ۵-۳۰۱،
جلد ۱)

یوسف زلیخا

از آغاز تا دیده‌ام چهر تو
گرفتار اندر کف مهر تو
نماندست زین پیش آرام دل
همی داد خواهی مرا کام دل
(سه سال ست تا زار و دل خسته ام
ابا آتش و آب پیوسته ام)
(صفحه ۱۱۹)

گر امروز با من شوی ساز گار
درخت مراد من آری ببار
بمه بر نهم پایه تخت ترا
کنم بنده خورشید بخت ترا
ز شاهان سرت را کنم تاجدار
کمر بسته پیشت جهان بنده وار

اگر سر بتابی ز پیولد من
نیاری دل خویش در بند من
چو دیوانه زین خانه تازم برون
به تیره چه اندر فتم سرنگون
(رفتن زلیخا در آن عمارت و طلب نمودن یوسف و بستن درهارا، صفحه ۱۲۳)

شاه نامه

که تا من ترا دیده ام مرده‌ام
خرو شان و جوشان و آزرده ام
همی روز روشن نه بینم ز درد
بر آنم که خورشید شد لاجورد
کنون هفت سالست تا مهر من
همی خون چکاند ابر چهر من
یکی شاد کن در نهانی مرا
بهبخشای روز جوانی مرا
فزون زانکه دادت جهان دار شاه
بیارایمت تاج و تخت و کلاه
و گر تو نیائی بفرمان من
بهپیچی ز رای و ز فرمان من
کنم بر تو بر پادشاهی تباه
شود تیره بر چشم تو هور و ماه
(رفتن سیاوش بار سوم پیش سودابه ، صفحه ۱۰۵ ، جلد ۱)

یوسف زلیخا

من از پشت یعقوب پیغبرم
پرستندۀ خالق اکبرم
سرائیل الله جز او کس نبود
زبان خرد هوش او را ستود
چنان دان که یعقوب واسحاق راد
که پیغمبران را همه داد داد
ذبیح الله او بد ز پیغمبران
پسندیدۀ داور داوران
همیدان تو اسحاق پاکیزه رای
ز پشت خلیل ستوده خدای
براهیم کش خواند یزدان خلیل
فرستاد نزدش همی جبرئیل
(صفحه ۱۵۵)

شاه نامه

نژاد من از پشت گشتاسپ ست
که گشتاسپ خود پور لهراسپ ست
که لهراسپ بد پور اورند شاه
که اورا بدی آن زمان آب و جاه
هم اورند از تخمۀ کی پشین
که کردی پشین بر پدر آفرین
پشین بود از تخمۀ کیقباد
خردمند شاهی دلش پر ز داد

همی رو چنین تا فریدون شاه
که اصل کیان بود و زیبای گاه

(ستایش کردن اسفندیار پهلوانی و نژاد خود را در پیش رستم ،
جلد ۳ ، صفحه ۳۴)

میرا[1] مضمون اپنے آخری مراحل تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کو خاتمے تک پہنچانے سے پیشتر چند کلمات دیباچہ' زلیخا کے بیانات کی نسبت کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں - سنہ ۱۹۲۲ع میں میں نے اپنا یہ مضمون لکھا تھا - اس وقت ڈاکٹر ایتھے کا مرتب کردہ نسخۂ یوسف زلیخا میرے پاس نہیں تھا جس کا مجھ کو سخت افسوس رہا - اس زلیخا میں سبب تالیف بھی موجود ہے جو بدقسمتی سے ایرانی اور ہندوستانی نسخوں میں موجود نہیں - میں اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتا ہوں :

"یوسف زلیخا کو اس سے قبل دو شاعر نظم کر چکے ہیں - پہلا ابوالموید بلخی :

یکی بوالموید که از بلخ بود
بدانش همی خویشتن را ستود

اس کے بعد بختیاری شاعر نے نظم کیا :

پس ازوی سخن باف این داستان
یکی مرد بد خوب روی جوان
نهاده ورا بختیاری لقب
کشادی بر اشعار هر جای لب

نوروز کی تقریب میں بختیاری امیر عراق کے پاس اہواز گیا :

---

۱ - مضمون کا یہ حصہ سنہ ۱۹۴۲ع میں "فردوسی پر چار مقالے" کی اشاعت کے موقعے پر اضافہ کیا گیا تھا - (مرتب)

خداوند فرخ امیر عراق
که تختش سپهراست و اسپش براق
جهانگیر و قطب دول بحر جاه
نگه‌دار دولت ستون سپاه
هنرمند سرهنگ با آفرین
سپه دار سلطان روی زمین

پادشاہوں کی طرح امیر تخت پر بیٹھا تھا اور باقاعدہ دربار لگ رہا تھا ۔ عہدہ دار صف باندھے کھڑے تھے۔ سرود سرا اپنی موسیقی سے حاضرین کو محظوظ کر رہے تھے ۔ شعرا علیحدہ صف میں استادہ نظر آتے تھے اور قصیدے سنا رہے تھے ۔ بختیاری نے بھی حسب معمول قصیدہ سنایا ۔ شعرا کو انعام تقسیم ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا ۔ ایک روز نوروز کے چند دن بعد کوئی خوش الحان قاری امیر کو سورۂ یوسف سنا رہا تھا ۔ امیر کے دل میں اس وقت یہ خیال گزرا کہ اگر یہ سورت فارسی میں اس طرح نظم کر دی جائے کہ تفسیر اور مطالب بر حاوی ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی حق ادا ہو جائے تو بہت اچھا ہو ۔ وہ یہ خیال کر ہی رہا تھا کہ بختیاری شاعر بھی آ نکلا ۔ امیر نے اپنا خیال اس پر ظاہر کیا ۔ بختیاری نے بڑی مستعدی کے ساتھ اس قصے کو نظم کر دیا ۔ شاعر کہتا ہے ۔ اتفاقاً ایک روز میں بختیاری کی زلیخا کا قصہ تاج زمانہ اجل موفق سے بیان کر رہا تھا :

قضا را یکی روز اخبار آن
همی راندمش بی غرض بر زبان
به نزدیک تاج زمانه اجل
موفق[1] سپهر وفا و عمل

---

۱ ۔ بقول برون ڈاکٹر ایتھے کا خیال ہے کہ زلیخا فردوسی نے مجدالدولہ
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس ذکر سے میری کوئی خاص غرض نہیں تھی مگر امام نے مجھ سے فرمایا کہ میں چاھتا ہوں تم بھی کسی شغل میں لگو اور بہتر تو یہ

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

ابوطالب رستم سنہ ۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ کے لیے نظم کی - پروفیسر نلدیکی کا اعتقاد ہے کہ بہاءالدولہ سنہ ۳۸۰ھ و ۴۰۴ھ یا اس کے فرزند سلطان الدولہ سنہ ۴۰۴ھ و ۴۲۶ھ کے واسطے لکھی - انھوں کے خیال کی مويد کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں - اس سے اعراض کر کے میں نلدیکی کے نظریے کا ذکر کرتا ہوں جس کی تائید میں یہ باتیں ملتی ہیں - موفق بہاءالدولہ کا وزیر ہے جس کا پورا نام ابوعلی (الحسن بن محمد) بن اسماعیل ہے - اہواز کو بہاءالدولہ کی تاریخ میں زبردست اہمیت بھی حاصل ہے - بختیاری شاعر نے جس کا دیباچۂ زلیخا میں ذکر ہے عزالدولہ بختیار سنہ ۳۶۷ھ کے نام پر اپنا تخلص رکھا ہو گا جو اس عہد میں بویہ خاندان کا ایک امیر تھا -

اس نظریے کے خلاف میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ الاجل تاج الزمان موفق جس کا دیباچے میں ذکر ہے اور موفق وزیر بہاءالدولہ ایک شخص نہیں ہو سکتے - کمال الزمان یا تاج الزمان کی قسم کے القاب پانچویں اور چھٹی صدی میں ملتے ہیں - موفق بن اسماعیل وزیر بہاءالدولہ سنہ ۳۹۰ھ میں پہلی مرتبہ اور سنہ ۳۹۲ھ میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے اور عنقریب بعد وفات پاتا ہے - یوسف زلیخا کو شاہ نامے کے اختتام یعنی سنہ ۴۰۰ھ کے بعد لکھے جانے کا اعتراف ہے - اس عہد سے بہت قبل موفق کا انتقال ہو جاتا ہے - زلیخا میں جس موفق کا ذکر ہے وہ کوئی عالم معلوم ہوتا ہے جو صاف الفاظ میں شاعر سے کہتا ہے کہ میں تمھاری مثنوی کو وزیر امیر عراق کے پاس لے جاؤں گا -

برم نزد دستور میر عراق　　که گردانش خیلند و ایران و شاق

فردوسی سنہ ۳۸۸ھ سے سنہ ۳۹۴ھ تک غزنین میں موجود ہے اور اس زمانے میں سلطان محمود سے اس کے خوش گوار تعلقات قائم ہیں - اس لیے اسی زمانے میں اس کا اہواز جا کر مثنوی یوسف و زلیخا بہاءالدولہ کے لیے تصنیف کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے - (حاشیۂ مصنف)

ہوگا کہ سرمایہ جمع کر کے اس قصے کو نظم کر ڈالو ۔ لیکن نظم کو دانش سے ترکیب دینا ، اسقام و خطا سے بری رکھنا تاکہ دوسرے شعرا کو غلطی نکالنے اور اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے ۔ ترکیب اور بندش چست ہو ، معانی اور نکات دل پسند ہوں ، اشعار دلچسپ اور بولتے قافیے ہوں ، کلام نقص اور گنجلک سے پاک ہو ۔ علاوہ بریں دل کش ، پاکیزہ اور رواں ہو تاکہ میں وزیر امیر عراق کے پاس لے جاؤں اور کچھ حصہ اس کے سامنے بڑھا جائے ۔ اس سے تمھاری شاعری کا پایہ اس پر محقق ہو جائے گا اور تمھیں یہ فائدہ ہو گا کہ اس کی عنایت تم پر ہو جائے گی ۔ میں نے اس عالم اجل کی یہ گفتگو سن کر جواب دیا کہ میں آپ کا تابعدار ہوں ، جلد اس داستان کو نظم کر دوں‌گا ۔ اگر یہ قصہ عمدہ نظم ہو گیا اور بادشاہ نے پسند فرمالیا ، زمانے نے مساعدت کی اور شاہ میری خدمت گزاری سے خوش نود ہوگیا تو شاید اس بہانے سے میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے جس کی وجہ سے میری تشویش و افکار دور ہو جائیں ۔ اگرچہ میں اپنی نادانی کا اقرار کرتا ہوں لیکن خدا کی رحمت اگر شامل حال ہے ، پادشاہ کا پرتو مجھ پر پڑے گا ، جس سے مجھ کو از حد مسرت اور سرخروئی ہو گی ۔ میں اپنی لیاقت کے بموجب اس کام میں کوشش کروں گا اور اپنے بوتہ کے موافق نظم کردوں گا ۔"

اس بیان کی روشنی میں بغیر کسی تردد کے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ہم فردوسی سے دوچار نہیں ہیں بلکہ کسی اور شاعر سے جو فردوسی سے مختلف ہے اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نا معلوم ہے ۔ وزیر عراق سے اس کی تقریب کرانے کے لیے امام موفق اس کو زلیخا لکھنے کی ترغیب دیتا ہے ۔ شاعر اس قدر گمنام ہے کہ وزیر کے دربار تک خود نہیں جا سکتا ۔ اس کی مثنوی امام موفق کی وساطت سے اس تک جائے گی ۔ جب امتحاناً تھوڑا سا

مثنوی سے وزیر سن لے گا اور پسند کرے گا ، تب کہیں غریب شاعر کی قسمت چیتے گی ۔ اگر یہ شخص واقعی فردوسی ہے تو اہوازیوں کی اس حماقت کا جواب شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے کہ شاہ نامے کے ساٹھ ہزار اشعار پڑھنے کے بعد بھی ان کو فن شعر میں فردوسی طوسی خدائے سخن کا پایہ معلوم نہیں ہوا ، اس لیے اس کا امتحان لیا جاتا ہے ۔ اس کو بختیاری جیسے گمنام شاعر کے مقابلے میں کھڑا کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں اگر قدردانی کی امید رکھتے ہو تو اس کی مثنوی کا جواب لکھو لیکن خدارا اس طرح لکھنا کہ دوسرے شاعر انگشت نمائی نہ کریں :

مرا گفت خواهم که اکنون تونیز
بباشی بگفتار و شغلی به نیز
هم از بهر این قصه ساز آوری
ز هر گوشه معنی فراز آوری
سخن را بدانش مرکب کنی
ز شیب و عوارش مهذب کنی
بگوئی چنان کان دگر شاعران
نیابند زحف و تعدی در آن
اگر باشدش نظم و ترکیب نغز
معانی پسندیده و هوش و مغز
سخن گاه دل گیر هر جایگاه
قوافیش چون نای بر پایگاه
نه ناقص نه غامض نه یازیده سست
حسین و لطیف و روان و درست
برم نزد دستور میر عراق
که گردانش خیلند و ایران وشاق

بدان تا گرش رای باشد یکی
بخوانند نزدیک او اندکی
بداند ترا آن سپهر سپاه
که چون داری اندر سخن دستگاه
ازو مر ترا این کفایت بود
که این مایه بهتر عنایت بود

امام اجل کی اس ہدایت پر جو ایک مبتدی شاعر کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے یہ مبینہ فردوسی برا ماننے کے بجائے الٹا فخرکرتا ہے اور خوشامد کے لہجے میں کہتا ہے :

چو بشنیدم این گفتگوی اجل
دلم را شد اکثر امید اقل
چنین گفتمش کای جهان کرم
بجود و نوال و نهاد و نعم
خرد را مدار و سخن را سوار
پناه جهان ز آفت روزگار
تن و جان من زیر فرمان تست
روان در تن من ثناخوان تست
بود آن زمان حشمت من رهی
که بر من بدین کار فرمان دهی
بخواهی ز من بندهٔ مهربان
یکی آفرین با یکی داستان
بنام تو ای در جهان بی‌نظیر
بگویم من این قصهٔ دل پذیر
اگر طبع لیکو به پیونددش
اگر شاه فرزانه بپسنددش

مگر دست گیرد مرا روزگار
شود شاد ازین خدمتم شهریار
مگر من رهی یابم از فر شاه
بیابم ز حشمت یکی پایگاه
ز دل فکرتم پاک بیرون شود
بہ پیران سرم حشمت افزون شود
اگر چند در بند نادانیم
بدارد مگر ایزد ارزانیم
رساند برحمت مرا پایۂ
فتد بر سر از خسروم سایۂ
ازین سایہ من بندهٔ مدح گوی
شوم شادمان و بوم سرخروی
بکوشم باندازهٔ دستگاه
کنم بر فزود سخن ران نگاه

ان اشعار نے مجھ کو اپنے قدیم عقیدے میں اور راسخ کر دیا ہے کہ اس تصنیف کو فردوسی سے کوئی نسبت نہیں۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کہاں فردوسی اور کہاں یہ غریب شاعر! لیکن ہم نے بدقسمتی سے شبہ کو گوہر اور ذرے کو آفتاب مان لیا ہے۔ ان اشعار میں لفظ 'اجل' دو موقعوں پر استعمال ہوا ہے اور بحیثیت لقب یاد کیا گیا ہے۔ مجھ کو جہاں تک معلوم ہے فردوسی کے عہد تک اس لقب کا رواج نہیں ہوا۔ ان ایام میں اس کے بجائے لفظ 'جلیل' رائج تھا اور وزرا و امرا کے لیے آتا تھا۔ خاندان بویہ کے بعض وزرا کے لقب میں استاد جلیل شامل تھا۔ عضدالدولہ، نوح بن منصور کے وزیر کو "الشیخ الجلیل السید ابی الحسین عبیداللہ بن احمد العتبی" اور تاش حاجب کو "الحاجب الجلیل ابی العباس تاش" خطوں میں

لکھتا تھا - سلطان مسعود نے اپنے بھائی امیر محمد کا القاب "الامیر الجلیل الاخ" لکھا تھا - سلجوقیوں نے اپنے کارناموں کی ابتدا میں معز سوری کو یہ القاب لکھا تھا "اے حضرت الشیخ الرئیس الجلیل السید مولانا ابی الفضل سوری المعز -" (بیہقی ، صفحہ ۵۸۳) احمد بن عبدالصمد وزیر دوم سلطان مسعود ، ابونصر مشکانی کا القاب یہ لکھا کرتا تھا "الشیخ الجلیل السید ابی نصر بن مشکان -"

(بیہقی ، صفحہ ۳۶۱)

فرخی ، امیر یوسف بن ناصرالدین کا نام یوں ذکر کرتا ہے :

میر جلیل سید ابو یعقوب
یوسف برادر ملک ایران

اور خواجہ احمد میمندی کے فرزند کا ذکر اس طرح کرتا ہے :

وزیر زادۂ سلطان و برکشیدۂ او
بزرگ همت ابوالفتح سرفراز تبار
جلیل عبدرزاق احمد آن که فضل و هنر
بدو گرفته یمین و بدو گرفته یسار

منوچہری :

این هنر خواجه جلیل چو دریاست
با هنر بی‌شمار و گوهر بی‌حد

یمینی میں سلطان محمود کے وزیر کا نام یوں درج ہے "شیخ الجلیل شمس الکفاۃ اباالقاسم احمد بن حسن المیمندی -" تفریحاً کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اس لقب کو رواج نہیں دے سکتا تھا - بیہقی میں ایک فقرہ آتا ہے "امیر محمود روزی مرا گفت چرا لقب تو جلیل کرده‌اند و تو نہ جلیلی -" (صفحہ ۴۰۸)

جلیل کا قائم مقام اجل ہے - ابتدا میں خالی "اجل" ملتا ہے ، بعد میں ترکیب پا کر "صدر اجل" "امیر اجل" "شیخ اجل" "امام اجل" بن جاتا ہے - بہر حال اس لقب کا رواج سلجوقی دور میں ہوتا ہے -

پانچویں صدی میں زیادہ تر امرا کے لیے مخصوص ہے ۔ چھٹی صدی میں وزرا اور علما کے نام کے ساتھ بھی رائج ہو جاتا ہے اور اکثر ملتا ہے ۔ ناصر خسرو :

بسی دیدم اعزاز و اجلالہا
ز خواجہ جلیل و امیر اجل
ولیکن ندارد مرا ہیچ سود
امیر اجل چون بیاید اجل

ولہ

روا بود کہ بمیر اجل تو پشت کنی
اگر امیر اجل از تو باز دارد اجل

حدیقہ میں حکیم سنائی بہرام شاہ غزنوی کے وزیر کا نام یوں ذکر کرتے ہیں "الصاحب الاجل العالم صدرالدین نظام الملک ابی محمد الحسن قاینی" اور نائب وزیر کا نام "الاجل نظام الدین تاج الخواص ابی نصر محمد بن محمد المستوفی ۔" انوری :

امیر اجل فخر دین بوالمفاخر
امیری بصورت امیری بمعنی

ولہ

صدر عالی اجل جمال الدین
کہ چو دست تو ابر و جیحون نہ

ولہ

اگر برنج ندارد اجل نجیب الدین
کہ ہیچ رنج مبادش ز عالم بدکیش

سنہ ۸۲۹ھ میں شاہزادہ بایسنغر میرزا کے حکم سے شاہ نامے کا ایک نیا ایڈیشن تیار ہوتا ہے ۔ اس کے دیباچے میں سب سے پہلے مثنوی یوسف زلیخا کا تفصیلی مذکور آتا ہے کہ جب فردوسی سلطان محمود کے خوف سے بغداد میں جا کر پناہ گزین ہوتا ہے تو چونکہ

خلیفہ اور اہالی بغداد شاہ نامے کو بوجہ مدح ملوک عجم پسند نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے کتاب یوسف و زلیخا نظم کی ۔ یہ مثنوی عام طور پر بہت پسند کی گئی اور دربار خلافت میں اس سے فردوسی کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا (دیباچۂ بایسنغرخانی ، صفحہ ۱۳) ۔

بغداد میں فردوسی کا قیام جو ایک غیر تاریخی واقعہ ہے ایک تاریخی قصے کے انضمام سے پایۂ ثبوت کو پہنچایا گیا ہے ۔ وہ قصہ دیباچۂ بایسنغری میں اس طرح درج ہے کہ جب فردوسی کے قیام کی اطلاع سلطان محمود غزنوی کے گوش گزار ہوئی تو اس نے فردوسی کی طلبی کی امید میں ایک مکتوب بارگاہ خلافت میں روانہ کیا جس میں علاوہ اور شرر فشانیوں کے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر امیرالمومنین نے فردوسی کو میرے پاس روانہ نہ کیا تو میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور دارالخلافے کی خاک ہاتھیوں پر بار کروا کر غزنین لے آؤں گا ۔ مستقل مزاج خلیفہ القادر باللہ سلطانی تہدید سے مطلق مرعوب نہ ہوا ۔ اس نے جواب میں صرف ایک لفظ "الم" لکھ کر بھیجا ۔ محمود کے دبیر خلیفہ کے اس مختصر جواب کی عقدہ کشائی سے عاجز رہے ۔ انجام کار بڑے غور و خوض و تلاش و تجسس کے بعد سب نے یہ رائے قائم کی کہ چونکہ سلطان نے اپنے خط میں خلیفہ کو خاک بغداد کی نسبت ہاتھیوں سے تہدید کی تھی ۔ اس لیے جواب میں خلیفہ نے سورۃ الفیل کی طرف تلمیح کی ہے کہ "الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل ۔" سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا ۔

میں اس واقعے کی اصلیت پر کوئی اشتباہ پیدا کرنا نہیں چاہتا ۔ اس کا ذکر اکثر تاریخوں میں ملتا ہے ۔ اور سب سے پہلی تاریخ جس میں اس کا ذکر ہے اور میری نگاہ سے گزری ہے تاریخ گزیدہ ہے جو آٹھویں صدی کے ربع اول کی یادگار ہے ۔ تاریخ گزیدہ اور نگارستان

میں بنائے مخاصمت سلطان اور خلیفہ کے مابین بالتصریح فردوسی بتایا گیا ہے لیکن ان تاریخوں کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ واقع میں فردوسی کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ امر متنازعہ فیہ سلطان اور خلیفہ کے درمیان ملک ماوراءالنہر تھا ۔ سلطان خواہش‌مند تھا کہ ملک ترکستان پر متصرف ہو اور خلیفہ مانع تھا ۔ جب سلطان نے دیکھا کہ عجز و لجاج سے کار برآری دشوار ہے تو ضرورتاً تشدد کا لہجہ اختیار کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے وہ مشہور لفظ "الم" لکھا ۔ میرے بیان کا سب سے قوی اور بہتر ثبوت کتاب قابوس نامہ ہے جو فارسی نثر میں پانچویں صدی ہجری کے ربع سوم کی ایک شاندار اور وقیع یادگار مانی جا سکتی ہے ۔ اس کے مصنف امیر عنصر المعالی کیکاؤس والیِ طبرستان نے بعض تاریخی واقعے جو خود اس کی سرگزشت یا اس کے قریب زمانوں کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب میں درج کیے ہیں ۔ انھی قصوں میں اتفاقیہ سلطان محمود اور خلیفہ القادر باللہ کا واقعہ بھی لکھا گیا ہے ۔ یہاں (باب سی و نہم در آئین کاتب ، صفحہ ۱۸۵، ۱۸۷) ہم صاف دیکھتے ہیں کہ سلطان اور خلیفہ کے مابین بنائے مخاصمت حقیقت میں ملک ماوراءالنہر تھا نہ فردوسی ۔ قابوس نامہ میں یہ تمام واقعات برخلاف دیباچۂ بایسنغر خانی کے نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہیں (تاریخ روضۃ الصفا میں انھی بیانات کی تائید کی گئی ہے) ۔ قابوس نامہ سلطان محمود غزنوی کے صرف ترپن سال بعد تصنیف ہوا ہے اور اس واقعے کے لیے اس کتاب سے بہتر کوئی قدیم اور معتبر شہادت فی زماننا دستیاب نہیں ہو سکتی ۔ باوجود ایسی معتبر شہادت کے اس قصے کا انضمام فردوسی کے نام کے ساتھ ان قرون کی فردوسی پرستی کے تصور سے سمجھ لیا جا سکتا ہے اور بس ۔

فردوسی کی تعلیم

والد مرحوم اختر شیرانی نے سنہ ۱۹۳۱ع میں ''رومان'' کی اشاعت کا آغاز کیا تھا ۔ یہ رسالہ اس دور کے چوٹی کے ادبی پرچوں میں گنا جاتا تھا ۔ اس میں کبھی کبھار حافظ صاحب کے مضامین بھی نظر آ جاتے تھے ۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے تھے جو اختر صاحب اپنے والد کی میز سے کھسکا لیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں حافظ صاحب کا تحقیقی معیار نظر نہیں آتا بلکہ بعض جگہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ زیر نظر مضمون ''رومان'' کے اکتوبر ۱۹۳۸ع کے شمارے میں چھپا تھا ۔ (مرتب)

فردوسی کی تعلیم کیا ہے ، مختلف موضوع پر اس کے اپنے ذاتی خیالات ہیں ۔ ان آرأ کے مطالعے سے ہم اس کے دل و دماغ کی اعلیٰ قابلیت ، نگاہ کی وسعت اور خیالات کی بلندی کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ اس کی تعلیم کا پہلا اور آخری سبق خدائے پاک کی وحدانیت ہے ۔ توحید کے بارے میں جو کچھ اس نے کہا ہے فلسفیانہ زبان میں کہا ہے ۔ اس کا خدا وہ ہے جو روح اور عقل کا خالق ہے ۔ جس نے زمان اور مکان خلق کیے ، جو خورشید ، قمر ، زحل ، زہرہ اور مشتری کا مالک ہے ۔ وہ آسمان اور عالم کا خداوند ہے ۔ خاک ، آب ، ہوا اور آتش اسی کی ہستی پر گواہی دیتے ہیں ۔ دستور ، گنجور ، تاج و تخت ، کمی ، بیشی ، ناکامی اور خوش اقبالی سے بےنیاز ہے ۔ اس نے ہمارے لیے غذا ، خواب ، محبت اور عداوت مخلوق کی ۔ ہم اس کی ستائش سے قاصر ہیں کیونکہ

وہ نام و نشان سے بالا ہے ۔ عقل انسانی اسی چیز کا اقرار کرتی ہے جو مشاہدے سے گزر جائے ۔ لیکن خدائے مطلق ایسی ذات پاک ہے جس کو ہم آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ۔ حواس تو حواس ہمارا تخیل بھی اس کی حقیقت کی معما کشائی سے عاجز ہے کیونکہ وہ نام اور مقام سے بالا ہے ۔ حقیقت میں ہم ان حواس ، عقل ، نفس اور روح کے ذریعے سے اس ہستی پاک کی مدح سرائی نہیں کرسکتے ۔ عقل اور روح اس کی خلق کردہ ہیں اور ہمارے محدود اندیشے کو اس تک رسائی نہیں ۔ کائنات کا ادنیٰ سے ادنیٰ رکن حتیٰ کہ پائے مور بھی اس کی ہستی کی گواہی دے رہے ہیں ۔ ہم اس کے بندے ہیں اور بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کی ذات کی پرستش اور اس کے احکام کی تعمیل ہمارا فرض ہے ۔

مجھ کو معلوم نہیں اگر کسی نے یہ بات محسوس کی ہو کہ فردوسی نے شاہ نامے میں توحیدی مضامین پر کثرت سے قلم فرسائی کی ہے ۔ وہ ان کی بار بار تکرار سے کبھی تھکتا نظر نہیں آتا ۔ بر محل یا بے محل اس موضوع پر خیال بندی وہ ضروری سمجھتا ہے ۔ مشکل سے کوئی خط ایسا ہوگا جو حمدیہ اشعار سے شروع نہ ہوا ہو ۔ توحیدی موضوع کی کثرت کی بنا پر اگر شاہنامے کو قرآن العجم کہا جائے تو بالکل بجا ہے ۔

فردوسی کے نزدیک آفرینش میں عقل اولین جوہر ہے جو مخلوق ہوئی ۔ وہ جان یا نفس کے لیے بمنزلۂ چشم و چراغ ہے ۔ عقل ، اس کا قول ہے ، ہمارے پاس ایک آسمانی خلعت ہے ۔ وہ خدا کا بہترین عطیہ ہے جس کے ذریعے سے ہم دونوں جہان میں عزت پا سکتے ہیں ۔ دانائی اس کے نزدیک توانائی ہے ۔

مخلوقات کے سلسلے کا خاتم انسان ہے ، جو بہ لحاظ زمانہ سب میں مؤخر اور باعتبار شرف سب سے مقدم ہے ۔ شاعر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انسان جو اس قدر وسائل سے مخلوق ہوا ہے ؛ جو جماد ،

نباتات اور حیوان میں ممتاز مخلوق مانا گیا ہے ، کیا وہ ایک بے کار شے ہے ؟ نہیں اور ہرگز نہیں ، اس کا جواب ہے اور نتیجہ نکالتا ہے کہ اے انسان تو اپنے آپ کو مہملات میں ضائع مت کر۔

اس کا قول ہے ، چونکہ بوجہ عقل ہم کو یہ فضیلت ملی ہے اور کائنات میں ہم ممتاز مانے گیے ہیں اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم دانش سیکھیں ۔ حیوان جس میں نہ نطق ہے اور نہ عقل ، بدی نیکی کی تمیز سے واقف نہیں ، خدا اس سے بندگی بھی نہیں چاہتا ـــــــ ہم کو چاہیے کہ عقل کو ہم اپنا رہنما کریں اور اس کی مدد سے اپنی جان کی حفاظت کریں ۔ دانش مندوں کی پیروی میں اپنا راستہ تلاش کریں اور علم سیکھنے سے ایک لحظہ بھی غافل نہ ہوں ۔ اگر ہم دانا ہیں تو جان لیں گے کہ دانش کی انتہا نہیں ہے ۔ چونکہ ہم کو بد و نیک پر دسترس ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم نیکی کریں ۔

مسائل جبرو اختیار میں وہ صنف آخر کو تسلیم کرتا ہے ۔ اعمال خیروشر اس کے نزدیک ہمارے اپنے اختیار میں ہیں اور کنایہ میں ہم سے کہتا ہے ؛ دو قسم کے درخت ہوتے ہیں ، ایک شیریں ثمر دوسرے تلخ ثمر ۔ پہلی قسم کو باغ میں لگایا جاتا ہے اور اس کی پرورش کی جاتی ہے ۔ دوسری قسم کو تیشے سے کاٹ ڈالا جاتا ہے اور آگ میں جلاتے ہیں ۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہے یہ بنیں چاہے وہ بنیں ۔ اعمال میں انسانی آزادی کا وہ کہاں تک قائل ہے ، ہم کہہ نہیں سکتے ۔ لیکن اس کی حد بندی کا بھی وہ مقر ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے : ”جیسا آسمان نے بویا ہے ہمیں ویسا اگنا چاہیے ۔“

اس سے ہم اسی قدر درک کر سکتے ہیں کہ وہ تقدیر کا قائل ہے ۔ بہر حال نیکی کی بار بار وہ ہم کو ہدایت کرتا ہے اور کہتا ہے ”وہ آدمی اچھا ہے جس نے نیک بیج بویا ہے یا نیکی جس کی یادگار ہو وہی آدمی اچھا ہے ۔“ اور جب ہم جانتے ہیں کہ نیکی

بدی کے استعمال کے ہم قابل ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نیکی ہماری یادگار نہ رہے ۔ ”برائی کا بدلہ برائی ہے“ یہ اس کا ایک عام مقولہ ہے ۔ صفات حسنہ میں جس طرح وہ عدل اور کرم کی مشق کی تاکید کرتا ہے اسی طرح آز اور نیاز کی پر جوش الفاظ میں مذمت کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے آز کیا ہے ، بجائے خود ایک نیاز ہے ۔ نیاز سے اس کی مراد افلاس ہے ۔

وہ کہتا ہے ”مچھلی دریا میں اور گورخر صحرا میں اپنے بچوں کو پہچان لیتے ہیں لیکن انسان لالچ کی وجہ سے اپنی اولاد اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتا ۔“

ایک اور مقام پر گویا ہے ”ہمیں دنیا میں تین چیزوں کی ضرورت ہے ۔ غذا ، لباس اور بستر ۔ چونکہ ان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے اس لیے ان چیزوں کی خواہش کرنا واجبات سے ہے ۔ لیکن اس سے زیادہ ہوس کرنا لالچ ہے اور لالچ انسان کو بے آبرو کرتا ہے ۔“

وہ ایذا رسانی کے سخت خلاف ہے حتیٰ کہ چیونٹی کی ایذا بھی گوارا نہیں کرتا ۔ وہ کہتا ہے ”جان ایک قیمتی شے ہے ۔ اس لیے چیونٹی کو بھی ایذا مت دو کیونکہ وہ جان رکھتی ہے ۔ وہ آدمی نہایت ہی سیہ قلب ہے جو چیونٹی کا آزار پسند کرتا ہے ۔ یہ بات اس کی عقل میں نہیں آ سکتی کہ آدمی جان دار ہو کر جان ستانی کا پیشہ اختیار کرے ۔

وہ شد و مد کے ساتھ ہم کو مردانہ اور نامورانہ زندگی اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ اس کا عقیدہ ہے کہ پیدا ہونا اور سختی اور ناکامی میں جینا ، ایسے جینے پر رونا چاہیے ۔ ’مجد‘ (جس کو وہ مہتری کہتا ہے) حاصل کرنے کے لیے وہ کہتا ہے خون سے ہاتھ دھونے چاہئیں ۔ دنیا میں ہمیشہ کوئی نہیں رہا ، البتہ نام رہ جاتا ہے ۔ ایک شرمناک زندگی پر موت کو وہ ترجیح دیتا ہے ۔ چنانچہ

سباع کی زبان میں یہ مطلب یوں ادا کرتا ہے :
"کسی پلنگ نے ایک شیر سے جنگ کرتے وقت یوں کہا تھا کہ ناموری سے جان دینا بے حیا زندگی سے اچھا ہے ۔ عظمت اور بزرگی کی زندگی اگرچہ مستعجل ہو حاصل کرنے کے قابل ہے ۔"
چنانچہ کہتا ہے :
"انسان اگر ذرا دیر بھی بادشاہی کرے اور پھر مر جائے تو اس غلامی سے بہتر ہے جس میں برسوں جیتا رہے اور دوسروں کا دست نگر ہو ۔"

اولاد میں بھی جنگی اوصاف اور حمیت کی علامات کا وہ مداح ہے ، چنانچہ جنگل کے بہادروں کی زبان میں اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے :
"ایک شیر نے اپنی مادہ سے یوں کہا کہ اگر ہمارا بچہ بہادر نہ نکلا تو اس سے ہم محبت کا رشتہ توڑ دیں گے ۔ پھر دریا کا پانی اس کا باپ ہے اور جنگل کی خاک اس کی ماں ۔"
کسی دوسرے موقعے پر یہی خیال یوں ظاہر کیا ہے :
"ایک پلنگ کا قول ہے ، میرے دل میں جنگ کی آرزو موجزن ہے ۔ میرے باپ اور اس کے اسلاف سے ہمارے ہاں یہی پیشہ چلا آتا ہے ، اور تم جانو بیٹے میں باپ کی علامات کا پایا جانا ضروری ہے ۔ یہ بری بات ہے کہ وہ باپ سے کم ہنرمند ہو ۔ جس فرزند نے باپ کی رسم ترک کر دی وہ فرزند نہیں اجنبی ہے ۔"
ماں باپ اور اولاد کے تعلقات میں فردوسی نے بہت کچھ کہا سنا ہے لیکن اس مختصر مضمون میں سب کے لیے گنجائش نہیں ۔ میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا ۔ اس کا خیال ہے کہ :
"اولاد سے محبت کرنا پانی میں اپنا چہرہ دیکھنا ہے ۔ باپ اگر

بیٹے کو قید کر دے اس سے بہتر ہے کہ دشمن اس پر پھول برسائے۔ جس فرزند میں باپ کے اوصاف اور ہنرمندی نہیں پائی جاتی وہ فرزند نہیں اجنبی ہے۔"

قومی حمیت اور وطنی جوش فردوسی کی نمایاں خصوصیات سے ہیں۔ تمام شاہنامہ اور اس کی زبان اس کی شاہد ہیں۔ جوش وطن کے اثرات میں اس نے مذہب کو بھی فراموش کرکے عربوں کے خلاف یہ غیرفانی ابیات لکھے ہیں:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائی رسید است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو
تفو بر تو ای چرخ گردان تفو

اسی وطنی محبت میں اس کا 'سرود مازندران' لکھا گیا ہو گا جس کو میں 'سرود ایران' کہتا ہوں۔ و ہو ہٰذا:

کہ مازندران شہر ما یاد باد
ہمیشہ برو بومش آباد باد
کہ در بوستانش ہمیشہ گل است
بکوہ اندرون لالہ و سنبلست
ہوا خوش گوارا زمین پر نگار
نہ سرد و نہ گرم و ہمیشہ بہار
نوازندہ بلبل بباغ اندرون
گرازندہ آہو براغ اندرون
ہمیشہ بناساید از جستجوی
ہمہ سالہ ہر جای رنگست وبوی
گلابست گوئی بجویش روان
ہمی شاد گردد ز بویش روان

دی و بہمن و آذر و فرودین
همیشہ پر از لالہ بینی زمین
ہمہ سال خندان لب جویبار
بہر جای بازی شکاری بکار
سراسر ہمہ کشور آراستہ
ز دینار و دیبا و از خواستہ
بتان پرستندہ با تاج زر
ہمہ نامداران زرین کمر
کسی کاندران بوم آباد نیست
بکام از دل و جان خود شاد نیست

اس کا مرثیۂ ایران اگرچہ مختصر ہے لیکن عبرت، رفت اور حسرت کی تصویر ہے۔ چند الفاظ میں اتنے درد، حزن، غم اور یاس کس طرح جمع کیے جا سکتے ہیں، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ چوں کہ سب سے زیادہ یہ مرثیہ آج ایران کے حسب حال ہے اس لیے میں اس کو بھی یہاں درج کرتا ہوں:

دریغست ایران کہ ویران شود
کنام پلنگان و شیران شود
ہمہ جای جنگی سواران بدی
نشستنگہ شہریاران بدی
کنون جای سختی و جای بلاست
نشستنگہ تیز تگ اژدہاست
کسی کز پلنگان بخورداست شیر
درین رنج مارا بود دستگیر

بطور جملہ معترضہ یہ کہنا ضروری ہوا کہ فردوسی پر عام الزام یہ ہے کہ اس نے عربوں کی تحقیر اور تذلیل ہمیشہ کی ہے۔ یہ ایک عام عقیدہ ہے لیکن ناانصافی پر مبنی ہے۔ عربوں کی بہادری کا بھی

وہ اسی قدر ثنا خوان ہے جس قدر کہ حب وطن کے اعتبار سے ان کی تحقیر کرتا ہے ۔ فریدوں کی داستان میں ایک موقع پر خود عربوں کی زبان سے ان کے قومی خصائص کا یوں ذکر کرتا ہے :

اگر شد فریدون چنین شہریار
نہ ما بندگانیم با گوشوار
سخن گفتن و رنجش آئین ماست
عنان و سنان باختن دین ماست
بہ خنجر زمین را میستان کنیم
بہ نیزہ ھوا را نیستان کنیم

شرافت نسبی کے اثرات میں یہ ایک ایرانی قومی عقیدہ رہا ہے کہ رذیل اور کمینہ آدمی ہمیشہ پاجی رہے گا ۔ کوئی تعلیم اور تربیت اس کو سنوار نہیں سکتی ۔ اس وہم میں ہم ہر ایرانی مصلح اور محقق کو مبتلا دیکھتے ہیں ۔ سعدی کی تلقین یہی ہے کہ نا اہل کبھی تربیت پذیر نہیں ہو سکتا ع :

ناکس بہ تربیت نہ شود ای حکیم کس

یا خراب لوہے سے اچھی تلوار نہیں بن سکتی ۔ فردوسی با اینہمہ قدامت اس خیال میں سعدی کا ہم آہنگ ہے ۔ وہ اپنے الفاظ میں یہ خیال یوں ظاہر کرتا ہے :

"تو شیر کا بچہ پالتا ہے لیکن جب اس کے دانت تیز ہوجائیں گے تب اس کا اجر تجھ کو ملے گا ۔ جب وہ آمادۂ جنگ ہوگا ؛ سب سے پہلے اپنے پالنے والے پر ہاتھ صاف کرے گا ۔"

ایک اور مقام پر کہتا ہے :

"شیر کے بچے کو چاہے حریر میں لپیٹ کر بغل میں لیے پھرو ، دودھ اور شکر سے اس کی غذا کا انتظام کر دو ۔ لیکن جب بڑا ہوگا اپنی اصل پر آ جائے گا اور مست ہاتھی

سے خوف نہیں کھائے گا ۔"

یہی شیر اور شیر کے بچے کا خیال اسی پیرائے میں اس نے اکثر مقام پر لکھا ہے ۔

توحید کے بعد جس مضمون پر اس نے زیادہ طبع آزمائی کی ہے وہ مسئلۂ موت ہے ۔ موت فردوسی کے نزدیک ایک ایسا سبق ہے ، جس کو انسان کا فرض ہے کہ زندگی کے کسی لمحے میں فراموش نہ کرے ۔ موت اس کے عقائد اور مواعظ کا ایک ایسا اہم اور مہتم بالشان موضوع ہے کہ اس کو جس قدر کہا اور سنا جائے کم ہے ۔ کسی شاعر کا قول ہے :

مجلس وعظ رفتنت هوس است
مرگ همسایه واعظ تو بس است

موت کے وعظ کی تکرار جس قدر شاہنامے میں ہے شاید ہی کسی اور مضمون پر یہ تکرار دہرائی گئی ہو ۔ موت ، وہ کہتا ہے ، انصاف ہے اور ظلم نہیں ہے ۔ موت کا باعث صرف بڑھاپا نہیں ہے ، وہ جوانوں کو بھی آتی ہے ۔ ہر زندہ شے کا انجام موت ہے ۔ موت ایسا زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں ہے ۔ ہمارا خاکی ہیکل خاک میں ملے گا ۔ موت نہ دانا کو چھوڑتی ہے اور نہ زرہ بکتر والے اونچے کو ۔ ہم امیر ہوں یا غریب ، خوش ہوں یا نا خوش ، گلہ ہوں یا گلہ بان ، سب فنا ہوں گے ۔ بادشاہ ہو یا فقیر ، جو پیدا ہوا ہے مرے گا ۔ ہم خزاں کے موسم کے پتے ہیں اور موت باد خزاں ہے ۔ اس سے کوئی نہیں بچ سکے گا ۔ دنیا میں ہمیشہ کون رہتا ہے ۔ تم کیخسرو کے حال سے عبرت حاصل کرو ۔ قصہ پرانا سہی لیکن جدید مان لو ؛ باپ کا انتقام اس نے نانا سے لیا ؛ نانا کو مارا اور پھر خود بھی نہ رہا ۔

ہماری شادی و غم ، دم آنے تک ہی ہیں ۔ مہتری کے حاصل کرنے کے لیے لوگ کس قدر محنت کرتے ہیں لیکن انجام خاک کا بستر ہے ۔

الغرض اسی قسم کے مواعظ ہیں اور ان تمام کا نتیجہ چار چیزیں ہیں جن کو وہ خاص طور پر اہمیت دیتا ہے ۔ اس کی حکمت کے وہ اربع عناصر یہ ہیں :

(۱) خدا کی پرستش کرو ۔
(۲) اپنی موت یاد رکھو ۔
(۳) نیکی کرو ۔
(۴) کسی کو ایذا مت پہنچاؤ ۔

نجات کا راستہ اس کے نزدیک یہی ہے ۔ چناں چہ وہ خود لکھتا ہے :

ز روز گزر کردن اندیشہ کن
پرستیدن دادگر پیشہ کن
بہ نیکی گرای و میازار کس
رہ رستگاری ہمین است و بس

فردوسی کے خصائص سے ہے کہ بعض واقعات کو بیان کرکے ، اور ان پر استدلال کرکے ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے ۔ اصلی مقصد اس کا وہ نتیجہ ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے ۔ متکلم کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ سخاوت اور فیاضی اچھی صفات ہیں اور انسان کو ان کی عادت ڈالنی چاہیے ۔ اس مفہوم کو فردوسی اپنی زبان میں یوں کہتا ہے :

”فریدون نہ کوئی فرشتہ تھا اور نہ مشک و عنبر سے اس کی سرشت ہوئی تھی ۔ صرف داد و دھش سے اس نے یہ نیکنامی حاصل کی تھی ۔ تم بھی یہ عادت ڈالو اور فریدون بن جاؤ ۔“ چناں چہ :

فریدون فرخ فرشتہ نبود
ز مشک و ز عنبر سرشتہ نبود

بداد و دهش یافت این نیکوی

تو داد و دهش کن فریدون توی

دوسری مثال

کہنا صرف اس قدر تھا کہ موت انصاف ہے اور اس سے ہماری ناخوشنودی بیکار ہے ۔ یہ مقصد اس پیرایے میں ادا کیا ہے :

اگر باد تند کچے نیبو شاخ سے گرا دے تو اس فعل کو ہم ظلم کہیں یا انصاف ، برا کہیں یا اچھا ۔ اگر موت کا نام انصاف ہے تو پھر ظلم کیا ہے اور جب ہم نے اس کو انصاف مان لیا ہے تو اس کے خلاف یہ احتجاج کیسا :

اگر تند بادی برآید ز کنج

بخاک افگند نارسیده ترنج

ستمگاره خوانمش ار داد گر

هنرمند گویمش ار بی هنر

اگرمرگ داد است بیداد چیست

زداداین همه بانگ و فریادچیست

تیسری مثال

شاعر کا مقصد اس قدر تھا کہ ہمارے مر جانے کی دنیا کو مطلق پروا نہیں ؛ فردوسی اس کو اپنے طرز میں یوں کہتا ہے :

ایک چڑیا کسی پہاڑ پر بیٹھی اور اڑ گئی ۔ اس سے پہاڑ میں کیا گھٹا اور کیا بڑھا ۔ اب کہتا ہے تم وہ چڑیا ہو اور دنیا وہ پہاڑ ہے ۔ اگر تم چلے گئے تو اسے کیا پروا ہے :

یکی مرغ بر کوه بنشست و خاست

بر آن کوه چه افزود ازان کوه چه کاست

تو آن مرغی و این جهان کوه تست

اگر تو برفتی چه اندوه تست

میرے خیال میں فردوسی کا یہ انداز خاص نہایت موثر اور خوش‌آیند ہے ۔ علیٰ ہٰذالقیاس بعض‌اوقات غیر ذی روح یا خارج‌العقل اشیا سے وہ یہی کام لیتا ہے ۔ مقصد اتنا تھا کہ خدا سر دے تو عقل ضرور دے ۔ یہ مطلب یوں بیان ہوتا ہے :

''دیکھو تاج نے سر سے کیا کہا؟'' سامع ظاہر ہے کہ یہ غیرمعمولی تمہید سن کر چونکے گا ۔ اس طرح اس کو ہمہ تن گوش بنا کر کہا :

''اے سر تیرے مغز میں عقل ہونا ضروری ہے ۔''

مثال دیگر :

''تمھیں کیا پلنگ کی وہ بات یاد نہیں جو اس نے گھرے
دریا میں مگرمچھ سے کہی تھی کہ جب عقل پر طمع نے
غلبہ پا لیا تو پھر اس کے پنجے سے رہائی مشکل ہے ۔''

یہ مقولے جو میں نے جمع کیے شاہنامے سے ہیں فردوسی کے ایرانی دانشمندوں کے اقوال اور ضرب‌الامثال میں نے ترک کر دیے ہیں ۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ سب فردوسی ہی کے ہوں کیوں کہ ایسا خیال کرنا مشکل ہو گا ۔ البتہ جو غیر ذرائع سے مجھ کو معلوم ہوئے ہیں ، ان کو ترک کر دیا ہے ۔

تنقید و تبصره

دیباچۂ قدیم شاہنامہ

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت ماہ فروری ۱۹۲۸ع)

ہندوستان کی علمی دنیا کو جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اپریل ۱۹۲۷ع کے رسالۂ 'اردو' میں اس دیباچے کو شائع کر کے ہم کو فردوسی کے حالات کے قدیم ترین باب سے روشناس کیا ہے۔ موصوف نے اس پر ایک طویل الذیل دیباچہ بھی اضافہ کیا ہے جو قدیم نثری شاہ ناموں و دیگر کتب پہلوی پر مفید اطلاع کا حامل ہے۔ یہ اطلاع رسالۂ 'کاوہ' و دیگر مغربی ذرائع سے اخذ کی گئی ہے۔

مغربی فضلا کی تقلید میں حکیم شمس اللہ صاحب نے شاہ نامے کی تین اشاعتیں مانی ہیں؛ پہلی ۳۸۴ھ میں دوسری ۳۸۹ھ میں اور تیسری ۴۰۰ھ میں، بلکہ اس سے بھی کئی سال بعد جو ۵-۴۰۴ میں انجام کار ختم ہوتی ہے۔ لیکن ہم اس نظریے سے متفق نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ان کا خیال ہے کہ فردوسی اپنی عمر کے پینتالیسویں سال میں شاہ نامہ نظم کرنا شروع کرتا ہے اور پچاسی ویں سال ختم کرتا ہے جس سے تمام مدت نظم شاہ نامہ بجائے فردوسی کی بیان کردہ تیس پینتیس سال کے پوری چالیس سال بن جاتی ہے، اور ہم حیران ہیں کہ اس بیان کو فردوسی کے بیان سے کس طرح تطابق دیں۔ حکیم صاحب کا قول ہے کہ فردوسی۔ شعر

از امروز تا سال ہشتاد و پنج
بکاہدش رنج و ببالدش گنج

میں اپنی پچاسی سالہ عمر کی طرف اشارہ کر رہا ہے لیکن شاہ نامے کا متن ان کے دعوے کا موید نہیں ہے ۔ اسی طرح حکیم صاحب کا عقیدہ ہے کہ فردوسی سلطان محمود کے دربار میں ۳۹۸ھ سے لے کر ۴۰۴ھ تک موجود رہا ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔ کیوں کہ شاہ نامے میں ایک سے زیادہ موقعوں پر ابوالعباس فضل بن احمد اولین وزیر سلطان محمود کا ذکر موجود ہے جو اکثر تاریخوں کے بیانات کی رو سے صرف دس سال تک وزیر رہا ہے ، یعنی ۳۹۷ھ تک ۔ اب ظاہر ہے کہ فردوسی شاہ نامے میں ایک معزول شدہ وزیر کا ذکر کیوں کرنے لگا ۔ مزید برآں شاہ نامے میں جو شہادت موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ فردوسی سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت سے لے کر چھ سال تک برابر غزنین میں موجود ہے ۔ ہم اس تمام شہادت کا ، جو شاہ نامے میں ملتی ہے ، بہ خوف طوالت یہاں ذکر نہیں کر سکتے ۔ صرف ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں ۔

۳۹۴ھ میں سیستان میں سونے کی ایک کان برآمد ہوئی تھی ۔ چوں کہ سیستان پر سلطان محمود کا قبضہ بالکل تازہ تھا اس لیے اس واقعے کو عام طور پر سلطان کی خوش اقبالی کی طرف منسوب کیا گیا تھا ۔ چناں چہ تاریخ نگارستان میں اس کا ذکر اسی روشنی میں کیا گیا ہے ۔ فردوسی اس وقت غزنین میں موجود تھا اور دیباچۂ شاہ نامہ میں اس واقعے کا ذکر کرتا ہے :

ز خاور بیاراست تا باختر
پدید آمد از فر او کان زر

اصل یہ ہے کہ فردوسی نے اپنی عمر کے چھیاسٹھویں سال سے (جو سلطان محمود کی تخت نشینی کا زمانہ ہے) لے کر اکہترویں سال تک ، جو ۳۹۴ھ کے مطابق ہے ، شاہ نامے پر سرتوڑ محنت کی ہے اور اس کو تقریباً ختم کر دیا ہے ۔ چناں چہ ۴۰۰ھ میں خاتمۂ شاہ نامہ

لکھتے وقت کہتا ہے :

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج
فزون کردم اندیشہ و درد و رنج

چو سال اندر آمد بہفتاد و یک
ہمی زیر شعر اندر آمد فلک

یہی وہ چھ سال ہیں جن کا ذکر دیباچۂ قدیم میں آیا ہے ۔

حکیم صاحب نے دیباچۂ قدیم کا متن ایک ایسے نسخے سے حاصل کیا ہے جو گیارھویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے اور اکثر غلط ہے ۔ کاتب نے بھی اس کو احتیاط کے ساتھ نہیں لکھا ۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ کئی موقعوں پر فقرے کے فقرے چھوڑ دیے ہیں ۔ میں بہ سبیل نمونہ بعض مثالیں ذیل میں دیتا ہوں :

(۱) ''چون سنگ کہ افریدون بپای برداشت ۔''

یہاں عبارت یوں ہے :

''و چون ہمان سنگ کجا آفریدون بپای باز داشت ۔''

(۲) ''پس دانایان کہ نامہ خواہند ساخت ایدون سزد ۔''

میں 'خواہند ساخت' کے بجائے 'خواہند ساختن' چاہیے ۔ ان ہی دو مثالوں سے ظاہر ہے کہ حکیم صاحب کے اصلی نسخے میں قدامت کی علامات کو ترک کر دیا گیا ہے ۔

(۳) ''سہ دیگر خواص نامہ ، چہارم (خداوند نامہ) ۔''

یہ عبارت در اصل یوں ہے :

''سہ دیگر ہنرنامہ ، چہارم نام خداوند نامہ ۔''

(۴) ''ششم نشان دادن از دانش کہ نامہ از بہزاد است ۔''

صحیح فقرہ اس طرح ہے :

''ششم نشان دادن از دانش آنکس کہ نامہ از بہراوست ۔''

(۵) ''و از نامۂ پادشاہان فارس از گنج خانۂ مامون موبذ یزدگرد۔ سہریار ۔''

یہ فقرہ یوں ہے :

''و از نامۂ پادشاهان پارس و از گنج نامۂ مامون و از بهرام شاه سروان شاه کرمانی و از فرخان موبدان موبد یزدگرد شهریار۔''

(۶) ''و گودرز بگاه کیخسرو سالار بود و بیژن را بکشت ۔''

صحیح یوں ہے :

''و گودرز بگاه کیخسرو سالار بود که پیران را بکشت ۔''

(۷) ''بیژن پسر بود پسر بسوان پسر حسین ۔''

یہاں یہ عبارت ہے :

''و پیران پسر ویسه بود پسر حشو (کذا) پسر پشوان ۔''

(۸) '' و آنکه خسرو پرویز بدر روم شد کنارنگ پیشرو لشکر او بود و در هنگام شاده شاه ۔''

یہ عبارت اس طرح ہے :

''و آنکه خسرو پرویز بدر روم شد کنارنگ پیشرو لشکر پرویز بود و حصار روم بسته و نخستین کسی که بدیوار حصار برشد او بود که با قیصر روم بر آویخت و او را بگرفت و در پیش شاه آورد ، و در هنگام ساوه شاه ۔'' الخ

آخر میں کہا جاتا ہے کہ یہ دیباچہ ابھی مکمل نہیں ہے اور ایک بڑا حصہ چھوٹ گیا ہے ۔ یعنی ہجو کے اشعار کے بعد ایاز کا ہجو کو سلطان کے پیش کرنا ، سلطان کا برہم ہونا اور وزیروں اور دبیروں کو معزول کرنا ۔ اس کے بعد وہ حکایت آتی ہے جس میں عامل کی شکایت کے لیے فردوسی غزنین آتا ہے ۔ راہ میں تین شعرا سے ملتا ہے اور مصرع :

''مانند سنان گیو در جنگ پشن''

برجستہ کہہ کر ان کے شریک ہوتا ہے اور ان کی وساطت سے دربار سلطانی میں پہنچتا ہے اور شاہ نامہ نظم کرتا ہے ۔ اس کے بعد سلاطین ایران کی فہرست آتی ہے جس میں ان کے نام اور زمانۂ پادشاہی درج ہے ۔

شاہ نامے کا دیباچۂ قدیم

(از ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت ماہ فروری ۱۹۲۹ء)

جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے رسالہ اردو میں بابت ماہ اپریل ۱۹۲۷ء دیباچۂ قدیم شاہنامہ پر ایک طویل الذیل مضمون سپرد قلم کیا تھا ۔ موصوم کی خواہش سے اس پر اورینٹل کالج میگزین میں (بابت فروری ۱۹۲۸ء) ایک تبصرہ لکھا گیا ۔ تبصرہ نگاری کی خدمت راقم کے سپرد ہوئی تھی ۔ بعض امور میں راقم کو جناب حکیم صاحب سے اختلاف تھا ۔ میرے تبصرے کا جواب جناب حکیم صاحب بالقابہ نے جولائی ۱۹۲۸ء کے رسالۂ اردو میں دیا ہے ۔ سطور ذیل اس کی جواب الجواب ہیں ۔

افسوس ہے کہ مجھے حکیم شمس اللہ صاحب کے تین اشاعتوں والے نظریے سے اختلاف ہے ۔ اس قسم کا بیان میں پروفیسر برون اور پروفیسر نولدیکی کے ہاں بھی پڑھ چکا ہوں لیکن میرے خیال میں کافی شہادت موجود نہیں ہے ۔ محض خاتمے میں مختلف تاریخوں سے مختلف اشاعتوں کا نظریہ نہیں مانا جا سکتا ۔ نئی اشاعت ماننے سے پیشتر ہمیں ان اشاعتوں کا مختلف مواد مثلاً داستانوں میں رد و بدل ، بیانات کا فرق ، اشعار کی کمی و بیشی و دیگر واقعات میں فرق دکھانا ہو گا ۔ اگر کسی نسخے میں سنہ ۴۰۰ ہجری کی بجائے ۳۸۴ھ ملتا ہے اور باقی امور میں دونوں نسخے مماثل ہیں تو اس حالت میں ہمیں یہ حق نہیں کہ انھیں دو اشاعتیں مانیں ۔ قریب قریب شاہنامے کے تمام متداول نسخے ، الحاق مواد کے علاوہ ایسی داستانوں اور

حکایات میں جو فردوسی کی طرف منسوب ہیں اور جن کو شاہنامے کا قدیمی حصہ کہنا چاہیے ، باہم مماثل ہیں ۔ ان سب کی یکسانی دیکھ کر یہی حکم لگایا جا سکتا ہے کہ تمام نسخے ایک ہی اشاعت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اگر مختلف اشاعتیں ہوتیں تو ضرور تھا کہ اس وقت بھی موجود ہوتیں ۔

۳۸۴ھ کی اشاعت کے متعلق حکیم صاحب نے جن اشعار پر اس قدر اعتماد کیا ہے خود ان اشعار سے ان کے نظریے کی تائید نہیں ہوتی ۔ وہ شعر یہ ہیں :

سرآمد کنون قصۂ یزدگرد

بماہ سفندار مز روز ارد

ز ہجرت شدہ سی صد از روزگار

چو ہشتاد و چار از برش برشمار[1]

ان سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ داستان یزدجرد ۳۸۴ھ میں ختم ہوئی ۔ لیکن یہ داستان پورا شاہنامہ نہیں ہے ۔ اس لیے اس داستان کی تاریخ کو تاریخ اتمام شاہنامہ نہیں کہا جا سکتا ۔ اتفاق سے یہ داستان خاتمۂ شاہنامہ پر واقع ہے ۔ اس لیے یہ سہو ممکن ہوگیا کہ داستان کی تاریخ کو تمام شاہنامے کی تاریخ اختتام مان لیا گیا اور خاتمے کے اشعار میں اس کو داخل کر دیا گیا ۔ فردوسی خود کہہ

---

۱ ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی بنداری کے ترجمے اور اس شعر کی سند پر شاہنامے کی پہلی اشاعت کی تاریخ سنہ ۳۸۴ ہجری تسلیم کرتے ہیں ۔ چناں چہ :

"...این مطالب بجملگی موید این معنی است که پیش ازین نسخہ معمول نسخۂ مختصرتر و کوتاہ‌تری از شاہنامہ در سال ۳۸۴ تہیہ و تدوین شدہ بود کہ علی الظاہر فردوسی آنرا بنام کسی نکرد ۔"

(تاریخ ادبیات در ایران ، ذبیح اللہ صفا ، صفحہ ۴۷۳-۴)

(مرتب)

رہا ہے کہ ۳۸۴ ھ داستان یزدگرد کے ختم ہونے کی تاریخ ہے ۔ اس بیان کے باوجود یہ نظریہ قائم کرنا کہ "فردوسی نے پندرہ سولہ سال کی مدت میں شاہنامے کی مشہور حکایت کو منظوم کرکے ان کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا تھا اور اسے ۳۸۴ ھ میں اختتام کو پہنچا دیا تھا ۔" (اردو ، صفحہ ۳۰۱ - اپریل ۱۹۲۷ء) میرے خیال میں دور از کار ہے ۔ ان اوصاف کا کوئی مجموعہ موجود نہیں ہے اور فردوسی کے اپنے بیان کے مقابلے میں بنداری اور حاجی خلیفہ کے بیانات بھی قابل پذیرائی نہیں ۔

اس معاملے میں سب سے اہم فردوسی کا وہ بیان ہے جہاں کہتا ہے کہ سلطان محمود کے نام پر معنون کرنے سے بیشتر میں نے اس کتاب کو گنج مخفی کی طرح رکھا ہے اور بالکل اشاعت نہیں کی ۔ چناں چہ :

همی گفتم این نامه را چند گاه
نهان بود از چشم خورشید و ماه
چو تاج سخن نام محمود گشت
ستایش بآفاق موجود گشت

(جلد چہارم ، صفحہ ۱۷۶۴ ، طبع کلکتہ)

قریب قریب اسی مضمون کے اشعار شاہنامے کے اور مقامات میں بھی ملتے ہیں ۔

رہا شاہنامے کے نقش ثانی کا قصہ ، اس میں شک نہیں کہ مغربی فضلا نے برٹش میوزیم کے نسخے "Or 1403" کے خاتمے کے بعض اشعار کی بنا پر ، جن کو حکیم صاحب نے نقل بھی کر دیا ہے ، یہی رائے قائم کی ہے کہ فردوسی نے اپنی پہلی اشاعت ۳۸۹ ھ والی احمد بن محمد ابوبکر والیِ خالنجان کے نام پر معنون کی ہے لیکن انتساب کی شہادت ان اشعار سے تو نہیں ملتی اور نہ ڈاکٹر ریو نے انتساب کا ذکر کیا ہے ۔ میں ان اشعار کو یہاں اپنے مخدوم کے مضمون

سے نقل کر دیتا ہوں :

چو خواهش گری و نیازم نمود
بدین پرسشم چون زبان برکشود

همایون نهاد و پسندیده گل
خردمند و ارمیده و نیک دل

گرانمایه احمد که همسال او
بجوید بهرجا ازو آل او

ز باباش جوی تو نام درست
ابوبکرش آخر محمد نخست

سپاهانی و خان نشستن گهش
بنزد بزرگان ستوده دهش

چو در خان لنجان فراز آمدم
بهرج آن بگویی نیاز آمدم

مرا سوی خان خودش راه داد
چو بامن بدید او بخرگاه داد

خداوند این دفترم بنده کرد
لب هر مرادم پر از خنده کرد

(رسالۂ اردو ، صفحہ ۳۰۲ ، حصہ بست و ششم)

یہ ابیات فردوسی کے انداز سے مختلف معلوم ہوتے ہیں[1] ۔ ان کی بندشوں

۱ ۔ جدید ایرانی نقاد ڈاکٹر ذبیح‌اللہ صفا کی رائے بھی ملاحظہ ہو :

''در پایان یکی از نسخ محفوظ موزهٔ در بریتانیا (بشمارهٔ Or 1403)و همچنین در مقدمهٔ نسخ معمول یوسف و زلیخا ابیاتیست که بر روی هم ایجاد این تصور را میکند که فردوسی پس از سال ۳۸۴ سفری باصفهان و 'خان لنجان' و بغداد کرد و منظومهٔ یوسف و زلیخا را در بغداد بامیر عراق تقدیم

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

کی کمزوری اور بے ربطی بغیر کہے صاف نظر آ رہی ہے - بجائ
موجودہ کئی شعر معنی سے عریاں ہیں - رہے ذیل کے اشعار :

چو شد اسپری داستان بزرگ
سخنہای آن خسروان سترگ

بروز سیم شنبدی چاشتگاه
شده پنج ره پنج روزان ز ماه

کہ تازیش خواند محرم بنام
کہ از ارجمندیش ماه حرام[1]

اگر سال نیز آرزوت آمد ست
نہم سال و هشتاد یا سی صد است

میں نے ان کو صرف دو نسخوں میں دیکھا ہے - ان سے قبل پانچ شعر
حمد و نعت و منقبت اصحاب کے بھی ملتے ہیں لیکن اس تاریخ کا
ندرت کے ساتھ پایا جانا خود اس کے خلاف ہے -

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نمود و نسخہ ای از شاهنامہ را در ۲۵ محرم ۳۸۹ در اصفهان
بحاکم خان لنجان داد -''

بعد ازاں تینتیس اشعار درج کرنے (جن میں حافظ صاحب کے یہاں
دیے ہوئے ۸ + ۴ = ۱۲ اشعار بھی شامل ہیں) اور ان میں سے
بعض کی ہیئت کذائی کی جانب اشارہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

''این اشعار سست از فردوسی نیست و برای تقدیم شاهنامہ
بحاکم خان لنجان بر 'شاہ نامہ' افزوده نشده است . . . . .
و معلوم نیست چرا محققانی کہ علی العمیا صحت انتساب این
ابیات را بفردوسی پذیرفتہ اند در سستی آن ابیات و نارواپی
آنها دقت نکرده اند -''

(تاریخ ادبیات در ایران ، ذبیح اللہ صفا ، صفحہ ۵ - ۴۷۴)
(مرتب)

۱ - ڈاکٹر صفا کے ہاں ''ماہ تمام'' ہے (مرتب)

ڈاکٹر ایتھے اور پروفیسر نولدیکی نے بے شک ۳۸۹ ھ میں شاہنامے کی پہلی اشاعت بنام والیِ خالنجان مانی ہے ، لیکن یہ عقیدہ فردوسی کے بیانات کی روشنی میں ، جو مختلف مواقع پر شاہنامے میں ملتے ہیں ، ناقابل قبول ہے ۔ شاہنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی سلطان محمود کی تخت نشینی کے عین بعد غزنین میں چلا آتا ہے ۔ اس وقت وہ چھیاسٹھویں سال میں لگا تھا اور سن ۳۸۸ھ ہے ۔

جنگ کیخسرو کی تمہید میں فردوسی گویا ہے کہ جب میں اپنے دور عمر کے چھیاسٹھویں سال میں لگا ، پیری نے عصا میرے ہاتھ میں دے دیا ، عنبرین ریش کافوری ہو گئی ، بڑھاپے سے کمر جھک گئی اور آنکھوں سے کم سوجھنے لگا ، اس وقت میں نے ایک آواز سنی کہ فریدون کی کس کو تلاش تھی ۔ وہ دیکھو فریدون بیدار دل زندہ ہوگیا (محمود کی تخت نشینی کی طرف تلمیح ہے) ۔ جب میں نے یہ آواز سنی ، یہ کتاب اس کے نام پر معنون کردی تاکہ بادشاہ اس پیری کے زمانے میں میری دستگیری کرے ۔ جب مجھ کو ایسا جلیل القدر مخاطب مل گیا ہے ، میں اس داستان (جنگ کیخسرو) کے دوران میں سحر بیانی سے کام لے کر پتھر میں لالہ کاری کر دوں گا ۔ ذیل میں صرف ضروری اشعار پر قناعت کی جاتی ہے :

چو پنج از بر سال شصتم گذشت
بدانسان که باد بهاری بدشت

رخ لاله گون گشت برسان ماه
چو کافور شد رنگ ریش سیاه

ز پیری خم آورد بالای راست
هم از نرگسان روشنائی بکاست

خروشی شنیدم ز گیتی بلند
که اندیشه شد پیر و من بیگزند

که ای نامداران و گردن کشان
که جست از فریدن فرخ نشان

فریدون بیدار دل زنده شد
زمین و زمان پیش او بنده شد

بداد و به بخشش گرفت این جهان
سرش برتر آمد ز شاهنشهان

ازان پس که گوشم شنید این خروش
نخواهم نهادن بآواز گوش

به پیوستم این نامه بر نام اوی
همه مهتری باد فرجام اوی

که باشد به پیری مرا دستگیر
خداوند شمشیر و تاج و سریر

چو پیکار کیخسرو آمد پدید
ز من جادویها بباید شنید

بدین داستان در ببارم همی
بسنگ اندرون لالہ کارم همی

کنون خطبۂ یافتم زین نشان
که مغز سخن یافتم بیش ازان

داستان سکندر کے خاتمے پر شاعر خراج یکسالہ کی معافی کا ذکر کرتا ہے - یہ خراج سلطان نے اپنے جلوس کے پہلے سال تمام موانعات پر قابو پا کر رعایا کی تالیف قلوب کی غرض سے معاف کیا ہے - اس واقعے کی تاریخ ۱۴ شوال ۳۸۸ھ ہے - رعیت فرمان شاہی سننے کے بعد شہر سے باہر جا کر سلطان کے حق میں دعا کرنے کے لیے جمع ہوتی ہے اور ان کی دعاؤں اور شکریوں سے آسمان گونجنے لگتا ہے :

گذشته[1] ز شوال ده با چهار
"یکی آفرین باد" بر شهریار
ازین مژده دادند بهر خراج
که فرمان بد از شاه با فر و تاج
که سالی خراجی نخواهد ز پیش
ز دیندار بیدار وز مرد کیش
بدین عهد نوشیروان تازه شد
همان کار بر دیگر اندازه شد
ندارد کسی خوار فال مرا
کجا بشمرد ماه و سال مرا
ازین نامهٔ شاه دشمن گداز
که بادا همه سال بر تخت ناز
همه مردم از خانها شد بدشت
نیایش همی ز آسمان برگذشت
(جلد ثالث ، صفحہ ۱۳۶۳، طبع کلکتہ)

رہا یہ امر کہ شاعر غزنین میں موجود ہے ، اس کا ثبوت شاھنامے سے بہم پہنچ سکتا ہے ، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد داستانیں اس نے سلطان محمود کو سنائی ہیں ۔ چناں چہ داستان ہفت خوان اسفندیار لکھ کر کہتا ہے کہ اگر بادشاہ اس کو پسند فرمائے تو میری بہت عزت افزائی ہوگی :

۱ ۔ شعبان ۳۸۷ ھ میں بقول جتبی امیر سبکتگین وفات پاتا ہے ۔ امیر اسماعیل اس کے بجائے تخت نشین ہوتا ہے ۔ محمود اسماعیل سے لڑ کر تخت لیتا ہے ۔ اسماعیل ایک عرصے تک غزنین میں قلعہ بند رہا ۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ چھ ماہ بعد اس نے قلعہ حوالے کیا ۔ ان واقعات نے محمود کی تخت نشینی کو غالباً ۳۸۸ھ تک ملتوی کر دیا ہے اور اسی سال خراج یک سالہ کی معافی کا فرمان دیا گیا ہوگا ۔ (حاشیهٔ مصنف)

اگر شاہ پیروز بپسندد این
نہادیم بر چرخ گردندہ زین
(شاہ نامہ ، طبع کلکتہ ، صفحہ ۱۱۵۸)

ساسانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

ز ساسان و بابک چہ داری خبر
بخوان هین بشہ بر همہ سر بسر
نخست آفرین خوان ابر شہریار
کہ گردی تو از کار او کامگار
(از شاہ نامۂ قلمی)

۳۸۹ھ میں محمود کو خطاب یمین الدولہ و امین الملۃ ملتا ہے۔ شعر ذیل میں اسی واقعے کی طرف تلمیح ہے :

یمین دول شاہ محمود باد
سر تخت او افسر جود باد
(از خاتمۂ حالات بہرام بن شاپور)

قرینہ چاہتا ہے کہ شاعر نے خطاب ملنے کے وقت یہ شعرلکھے۔ بقول فرشتہ ۶ محرم ۳۹۲ھ کو پشاور پر محمود کا قبضہ ہوتا ہے اور تاریخ میں یہ اس کا پہلا حملۂ ہند مانا جاتا ہے ۔ فردوسی حملات ہند شروع ہونے کے بعد ہی اشعار ذیل لکھ سکتا ہے :

جہان بستد از مردم بت پرست
بدیبای دین بر دل آذین بہ بست
(جلد چہارم ، طبع کلکتہ ، صفحہ ۱۷۶۶)

جہان بستد از بت پرستان ہند
بہ تیغی کہ دارد چو وحشی پرند
(جلد چہارم ، طبع کلکتہ ، صفحہ ۱۷۶۴)

شاہ نامے کے دیباچے میں شعر ذیل آتا ہے :

ز خاور بیاراست تا باختر
پدید آمد از فر او کان زر

اس شعر میں ایک تاریخی واقعے کی طرف تلمیح ہے جو صاحب نگارستان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"در سن اربع و تسعین و ثلث مأته سلطان بواسطہ امر شنیعی کہ از خلف حاکم سیستان در وجود آمدہ بود بدانجا نہضت فرمودہ قلعۂ طاق بدست آوردہ آن ولایت را ضبط کرد و ہمدران سال در یکی از جبال آنجا معدن طلا بشکل درختی در زمین بدید آمد و چندانکہ می کندند و بزیر می رفتند دورش بیشتر می شد و زر خالص برمی‌آمد تابحدی رسید کہ دورہ اش سہ گز شد۔"

یہ واقعہ عہد سلطانی کے لیے نیک فال کی دلیل مانا گیا تھا۔ شاعر اس کا ذکر اپنے اشعار میں اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ واقعہ تازہ ہے۔ اس سے ہمیں دیباچۂ شاہ نامہ کی تاریخ ۳۹۴ھ معلوم ہو جاتی ہے۔

شاہنامے کے خاتمے میں فردوسی کہتا ہے کہ جب میں اپنی عمر کا پینسٹھواں مرحلہ طے کر چکا، تب میں نے شاہنامے پر انتہائی توجہ اور محنت و مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ جب اکہتروان سال آیا، شاہنامہ قریب قریب ختم ہوگیا۔ چنان چہ:

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج
فزون کردم اندیشہ و درد و رنج

چو سال اندر آمد بہفتاد و یک
ہمی زیر شعر اندر آمد فلک

ان بعض شواہد سے جن میں فردوسی نے چند واقعات عصری کی طرف تلمیحیں کی ہیں، صاف واضح ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر ان ایام میں غزنی میں ہے۔ یہ زمانہ ۳۸۸ھ سے شروع ہوکر ۳۹۴ھ پر ختم

ہوتا ہے اور وہی چھ سال ہیں جن کا ذکر دیباچہ قدیم میں آتا ہے۔ اور جب غزنین میں موجود ہے تو شاعر کو کیا ضرورت تھی کہ ۳۸۹ھ میں جا کر اپنی تصنیف خان لنجان کے نام معنون کرتا جو ایک معمولی رئیس تھا۔

میرا یہ بیان کہ فردوسی نے اپنی عمر کے پینتالیسویں سال میں شاہ نامہ شروع کیا اور پچاسی ویں (۸۵) سال میں ختم کیا، حکیم صاحب کے بیانات ذیل پر مبنی ہے:

(۱) "فردوسی ۳۲۰ھ یا ۳۲۱ھ کے قریب پیدا ہوا اور کم و بیش پینتالیس سال کی عمر میں ۳۶۷ھ کے قریب شاہنامے کو نظم کرنا شروع کیا۔"

(اردو، اپریل ۱۹۲۷ع، صفحہ ۳۰۰)

(۲) "فردوسی نے ۴۰۴ھ یا ۴۰۵ھ میں، جب کہ اس کی عمر پچاسی سال تھی، دقیقی کے اشعار شاہنامے میں شامل کیے۔ اور اپنے کلام سے دقیقی کے کلام کا مقابلہ کر کے سلطان سے اپنے کلام کی داد اور محنت کا صلہ طلب کرتا ہے۔"

(صفحہ ۳۰۶، اردو، اپریل ۱۹۲۷ع)

جب میرے محترم کے نزدیک فردوسی پینتالیس سال کی عمر میں شاہنامہ شروع کرتا ہے اور پچاسی ویں (۸۵) سال تک اس پر مصروف ہے تو میں نے صحیح تو کہا اگر یہ کہا کہ بروئے بیان حکیم صاحب تمام مدت نظم شاہنامہ بجائے فردوسی کے بیان کردہ تیس و پینتیس کے، پوری چالیس سال بن جاتی ہے۔ (۸۵ – ۴۵ = ۴۰)
اب میرے مخدوم کا یہ فرمانا کہ:

"ہم نے شاہ نامے کے بعض اشارات سے یہ امر اخذ کیا ہے کہ فردوسی نے اگرچہ ۴۰۰ھ میں شاہ نامہ ختم کیا لیکن اس کے بعد بھی ۴۰۵ھ تک اس میں بعض اجزا اضافہ کیے ہیں،

لیکن فردوسی نے ۴۰۵ھ میں کتاب کا جدید خاتمہ نہیں لکھا ہے اور نہ اس کے اختتام کی تاریخ ۴۰۵ھ بیان کی ہے اس لیے یہ زمانہ نظم شاہ نامہ کی مدت میں شامل نہیں ہوسکتا ۔"

(صفحہ ۴۶۳ ، 'اردو' جولائی ۱۹۲۸ع)

ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے جب ۴۰۵ھ تک اضافے مانے جاتے ہیں تو اضافوں کا یہ زمانہ فردوسی کے بیان کردہ پینتیس سال کے ساتھ جمع بھی ہونا چاہیے ۔ جب فردوسی پینتیس سال اور حکیم صاحب کے قول کے مطابق پانچ سال اور شاہ نامے پر مصروف رہا تو یہی کہنا پڑے گا کہ اس نے پورے چالیس سال شاہ نامے پر صرف کیے ۔

یہاں میرے مخدوم نے ۴۰۰ھ میں شاہ نامے کا ختم ہونا مان لیا ہے ، ورنہ دیباچہ قدیم میں (اردو ، نمبر ۳۶) انھیں اس سے بھی صاف انکار تھا ۔ چناں چہ وہاں فرمایا ہے :

"عام خیال یہ ہے کہ فردوسی نے ۴۰۰ھ میں شاہ نامے کو ختم کر دیا تھا لیکن شاہ نامے میں بعض اشارات ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۰ھ میں شاہ نامہ بالکل ختم نہیں ہوا تھا ، بلکہ اس کے بھی کئی سال بعد تک فردوسی اس میں اضافہ کرتا رہا ۔"

(صفحہ ۳۰۵ ، 'اردو' اپریل ۱۹۲۷ع)

اب میں اُن بعض اشارات پر غور کرتا ہوں جن کی رو سے ہمارے محترم شاہ نامے کا اختتام ۴۰۵ھ میں مانتے ہیں ۔ فردوسی جلد ثالث کی ابتدا میں ایک رات دقیقی شاعر کو خواب میں دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ جو گفتگو ہوئی اسے یوں بیان کرتا ہے :

چنان دید گوینده یک شب بخواب

که یک جام می داشتی چون گلاب

دقیقی ز جای پدید آمدی
بر آن جام می داستانها زدی
بفردوسی آواز دادی کہ می
مخور جز بآئین کاؤس کی
کہ شاهی گزیدی بگیتی کہ بخت
بدو نازد و تاج و دیہیم و تخت
شہنشاہ محمود گیرندہ شہر
ز گنجش بہر کس رسانیدہ بہر
از امروز تا سال ہشتاد و پنج
بکاہدش رنج و ببالدش گنج
وزان پس بچین اندر آرد سپاہ
ہمہ مہتران بر کشایندہ راہ
نبایدش گفتن کسی را درشت
ہمہ تاج شاهانش آید بمشت
بدین نامہ از چند بشتافتی
کنون هرچہ جستی ہمہ یافتی
ازین بارہ من پیش گفتم سخن
اگر بازیابی بخیلی مکن
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتی ہزار
بگفتم سرآمد مرا روزگار
گرآنمایہ نزد شہنشہ رسد
روان من از خاک بر مہ رسد

دقیقی فردوسی سے کہتا ہے کہ تمہیں محمود جیسے جلیل القدر بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے جس پر تخت و تاج کو ناز ہے اور پیشین گوئی کے انداز میں کہتا ہے کہ آج سے پچاسی سال آیندہ تک اس کی بلائیں دور اور خزانے معمور رہیں گے۔ زاں بعد وہ چین پر

لشکر کشی کرے گا اور سب لوگ اس کے مطیع و منقاد ہو جائیں گے ۔ تمام سلاطین کے تاج اس کے قبضے میں ہوں گے اور کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہوگی ۔ تم ایک عرصے سے اس کتاب پر مصروف ہو اور تمھارے دل کی مراد بر آ چکی ہے ۔ اس سلسلے میں میں نے بھی کچھ اشعار لکھے تھے ۔ یہ ذخیرہ اگر تمھیں مل جائے تو اس کی اشاعت میں بخل سے کام نہ لینا ۔ میں داستان گشتاسپ و ارجاسپ سے ہزار شعر لکھنے پایا تھا کہ میرا پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا ۔ اگر یہ کلام بھی بادشاہ کے معائنے میں لایا جائے تو میری بڑی عزت افزائی ہوگی ۔ ان اشعار میں شعر ذیل بھی شامل ہے :

از امروز تا سال هشتاد و پنج
بکاهدش رنج و بیالدش گنج

اس شعر میں حکیم صاحب کا خیال ہے کہ فردوسی نے اپنی پچاسی سالہ عمر کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ حکیم صاحب کس طرح اور کیوں کر اس نتیجے پر پہنچے؟ میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں ۔ اب یہ شعر تنہا نہیں ہے اور پہلے اور پچھلے ابیات سے مربوط ہے اور محمود سے تعلق رکھتا ہے ۔ 'گنجش' 'بکاهدش' 'ببالدش' 'نیایدش' 'شاهانش' کی تمام ضمائر سلطان کی طرف راجع ہیں ۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ اس شعر کو فردوسی کے متعلق مانا جائے ۔ لیکن میرے کرم فرما نے اس شعر میں ہشتاد و پنج کی بنا ہر ایک ایسا عجیب و غریب نظریہ ، جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا ، قائم کر لیا جو میں انھی کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں :

''فردوسی نے ۴۰۴ھ یا ۴۰۵ھ میں ، جب کہ اس کی عمر پچاسی سال تھی ، دقیقی کے اشعار شاہ نامے میں شامل کیے ۔''

(صفحہ ۳۰٦ - 'اردو' اپریل ۱۹۲۷ع)

اور اشعار بالا نقل کر کے کہا ہے کہ :

''اشعار بالا میں فردوسی نے جب کہ اس کی عمر پچاسی سال کی تھی، صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ شاہ نامے کو اس نے کئی سال کی محنت کے بعد منظوم کیا۔''

(صفحہ ۳۰۷ - 'اردو، اپریل ۱۹۲۷ع)

ہم اس کے متعلق کوئی رائے زنی نہیں کرتے اور دوسرے امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک اور انوکھا خیال ہمارے محترم کا یہ ہے کہ فردوسی اپنی عمر کے اٹھہترویں سال میں غزنیں آیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

''داستان کیخسرو کے خاتمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فردوسی ۳۹۷ھ یا ۳۹۸ھ میں، جب کہ اس کی عمر اٹھہتر سال کی تھی، غزنی میں آیا۔''

(اردو، بابت اپریل ۱۹۲۷ع، صفحہ ۳۰۳)

اور شعر ذیل کی بنا پر یہ نظریہ بنیاد پاتا ہے:

بدانگہ کہ بد سال ھفتاد وھشت
جوان بودم و چون جوانی گذشت

لیکن فردوسی نے دراصل اس شعر میں ''سال پنجاہ و ھشت' لکھا تھا، نہ 'ھفتاد و ھشت'۔ چناں‌چہ شاہ نامہ طبع کلکتہ و بمبئی میں صاف 'پنجاہ و ھشت' لکھا ہے[1] (دیکھو صفحہ ۴۴۲، جلد دوم طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ و صفحہ ۹۰۳ جلد دوم طبع کلکتہ)

---

۱ - شاہ نامہ طبع طہران میں بھی پنجاہ و ھشت مرقوم ہے:

بدانگہ کہ بد سال پنجاہ و ھشت
جوان بودم و چون جوانی گذشت

(جنگ بزرگ کیخسرو با افراسیاب، گفتار اندر ستایش سلطان محمود، جلد سوم، صفحہ ۳)

(مرتب)

اس فریب نگاہ پر حکیم صاحب فردوسی کو ۳۹۷ھ یا ۳۹۸ھ میں اور اٹھہتر سال کی عمر میں غزنین لاتے ہیں ۔ لیکن ایک ادنیٰ سی تبدیلی نے ان کے نظریے کے طلسم کو باطل کر دیا ۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ فردوسی نے دقیقی کے اشعار کے خاتمے میں سلطان محمود کو خطاب کر کے کہا تھا کہ میں بیس سال سے اس کتاب پر مصروف تھا اور کسی قدردان کا منتظر ، وغیرہ وغیرہ :

سخن را نگہ داشتم سال بیست

بدان تا سزاوار این گنج کیست

بیس کا عدد دیکھ کر حکیم صاحب کے ذہن میں معاً پہلی اشاعت کا سال ۳۸۴ھ گزرا ۔ آپ نے دونوں عددوں کو جمع کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ :

”فردوسی نے ۴۰۴ یا ۴۰۵ھ میں جب کہ اس کی عمر پچاسی سال تھی ، دقیقی کے اشعار شاہ نامے میں شامل کیے ۔“

(صفحہ ۳۰۶ - ’اردو‘ اپریل ۱۹۲۷ع)

اب اس قیاس کے ان کے پاس کیا وجوہ ہیں ، میں نہیں جانتا ، لیکن ارشاد کیا ہے :

”ظاہر ہے کہ فردوسی نے ان اشعار میں بیس سال کا وہ زمانہ مراد لیا ہے جو نقش اول کے اختتام سے اس کی عمر کے پچاسی سال تک گزرا ہے کیوں کہ نقش اول ۳۸۴ھ میں تمام ہوا ہے اور بیس سال اضافہ کرنے سے ۴۰۴ھ ہوتا ہے جو اس کی عمر کا ہشتاد و پنجم ہے ۔“

(صفحہ ۳۰۷ - ’اردو‘ اپریل ۱۹۲۷ع)

بظاہر یہ معقول معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی اس بیس سال میں تمام وہ مدت محسوب کر رہا ہے جو اب تک شاہنامے پر صرف کر چکا ہے ، نہ وہ مدت جو ہمارے مہربان کے مفروضہ ۳۸۴ھ کی اشاعت اول سے شروع ہوتی ہے ۔ آخر وہ مدت جو ۳۸۴ھ سے قبل شاہنامے

پر صرف کر چکا ہے اور جس کو حکیم صاحب یوں بیان کرتے ہیں :

"بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے پندرہ سولہ سال کی مدت میں شاہنامے کی مشہور حکایات کو منظوم کر کے ان کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا تھا اور اسے اختتام کو پہنچا دیا تھا ۔"

(صفحہ ۳۰۱ - 'اردو' اپریل ۱۹۲۷ع)

میں دریافت کرتا ہوں کہ یہ پندرہ سولہ سال کی مدت فردوسی نے سلطان سے کیوں چھپائی حالانکہ بقول حکیم صاحب اس وقت تک یہ مدت ۱۵ یا ۱۶ + ۲۰ = ۳۵ یا ۳۶ سال ہوتی ہے ۔ اور اگر عمر کا لحاظ کیا جائے تو پورے چالیس بنتے ہیں ۔ سلطان سے اس مدت کے پوشیدہ رکھنے میں آخر کیا مصلحت ہے ۔

ایک اور موقع پر فرمایا ہے کہ :

"فردوسی نے جنگ قادسیہ کی داستان اس زمانہ میں لکھی ہے جب کہ ۴۰۰ھ گزر چکا تھا ۔"

(صفحہ ۳۰۶ ، اردو ، اپریل ۱۹۲۷ع)

اس کے ثبوت میں یہ اشعار دیے ہیں :

کزان پس شکست آید از تازیان
ستارہ نگردد مگر بر زیان
بدین سالیان چار صد بگزرد
کزین تخمہ گیتی کسی نسپرد

میں اور وجوہ سے یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ داستان یزدجرد کا بعض حصہ ۴۰۰ھ میں لکھا گیا ہے ، جیسا کہ خاتمۂ شاہنامہ سے ظاہر ہے ، نہ اس بنا پر کہ پروفیسر نلدکی اور ان کے مقلد حکیم صاحب کی یہ رائے ہے ۔ اور یہ استدلال جو یہ بزرگ کررہے ہیں ، میری سمجھ سے باہر ہے کہ چونکہ ان اشعار میں چار سو سال آ گیا ہے اس لیے معلوم ہوا ہے کہ ۴۰۰ھ میں یہ نظم تصنیف

ہوئی تھی کیونکہ فردوسی اپنے ہی زمانے کا ذکر رہا ہے ، حالانکہ رستم سپہ سالار یزدگرد اپنے بھائی کو خط لکھ رہا ہے جس میں بروئے تنجیم پیشینگوئی کر رہا ہے ۔ ہمیں چاہیے کہ اس پیشینگوئی کو اس سے زیادہ وقعت نہ دیں جس کی وہ مستحق ہے ۔ اس سے کیا فائدہ کہ صوفیوں کے انداز میں ان اشعار سے حقیقی و مجازی معنی پیدا کریں ۔ ہم جانتے ہیں کہ کاتب و مکتوب الیہ دونوں زردشتی ہیں اس لیے ان کے ذہن میں جو سنہ ہے وہ یزدگردی ہے ، نہ ہجری اور یزدجردی سن اس زمانے میں ۴۰۰ نہیں ہو سکتا ۔

ایک موقع پر دیباچۂ قدیم میں آتا ہے "کہ غزنین آنے کے بعد فردوسی نے سلطان کے حکم سے چھ سال کے عرصے میں شاہنامہ ختم کر دیا ۔ اس میں غالباً صاحبِ دیباچہ کی مراد اس زمانے سے ہے جو فردوسی نے غزنین میں گزارا ہے ۔ خود فردوسی نے بھی خاتمۂ شاہنامہ میں اس مدت کو اپنی عمر کے پینسٹھویں اور اکہترویں سال کے مابین محصور کیا ہے ، جیسا کہ ہم اس مضمون کی ابتدا میں دیکھ چکے ہیں جو ۳۸۸ھ و ۳۹۴ھ کے مطابق ہے ۔ میرے مخدوم جو میں دیکھتا ہوں فردوسی کے بیانات پر اکثر اعتبار نہیں کرتے ، اس مدت کو ۳۹۸ھ و ۴۰۴ھ کے درمیان معین کرتے ہیں ۔

چنانچہ فرماتے ہیں :

> "جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ، فردوسی ۳۹۸ھ میں، جب کہ اس کی عمر اٹھہتر سال کی تھی ، سلطان محمود کے دربار میں پہنچتا ہے ۔ اس کے بعد چھ سال غزنی میں رہ کر متعدد حکایات شاہنامے میں اضافہ کرتا ہے اور ۴۰۴ھ تک اس کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے کیونکہ ۳۹۸ھ سے ۴۰۴ھ تک جو عرصہ گزرا ہے اس کی مدت چھ سال ہے ۔"

(صفحہ ۳۰۸ ۔ 'اردو، اپریل ۱۹۲۷ع)

جو لوگ شاہنامے کے مشاق صحرا نورد ہیں ، وہ حکیم صاحب

کی اس جدت طرازی کو موج سراب سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔ چونکہ ۳۹۸ھ سے ۴۰۴ھ تک فردوسی کا قیام اگر غزنی میں مان لیا جائے تو پھر لازمی طور پر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاہنامہ ۴۱۰ھ میں کہیں جا کر ختم ہوا۔ سلطان سے تعلقات کے قطع ہو جانے کے بعد ابھی فردوسی کو کئی ضروری کام کرنے باقی ہیں؛ مثلاً کئی داستانیں شاہنامے میں شامل ہونی باقی ہیں۔ ادھر عرصے تک سلطانی مرحمت کی امید میں انتظار کرتا ہے۔ جب بالکل مایوس ہو جاتا ہے تب امیر نصر کی خدمت میں جاتا ہے۔ یہاں ازسر نو اسے امیدواری کرنی پڑتی ہے اور ایک عرصے تک منتظر رہتا ہے۔ جب یہاں سے بھی جواب مل جاتا ہے تب شاید وطن کا رخ کرتا ہے اور حسین قتیب کی سرپرستی میں اپنا باقی کام ختم کرتا ہے اور پھر خاتمہ لکھتا ہے۔ اس لیے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۴۰۴ھ میں سلطان سے جھگڑا ہوا تو خاتمہ یقیناً ۴۱۰ھ میں لکھا جانا چاہیے۔ کیا میرے مخدوم شاہنامے کے واسطے یہ سنہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا نظریہ واپس لے لیں۔

داستان یزدگرد کے اشعار ذیل ۴۰۱ھ کے شدید قحط سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے:

تگرگ آمد امسال برسان مرگ

مرا مرگ بهتر بدی زان تگرگ

در هیزم و گندم و گوسپند

به بست این برآورده چرخ بلند

یہ اشعار ایسے نقصان زراعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مقامی ہے اور جس سے کسی خاص علاقے کی زراعت تباہ ہو گئی ہے۔ ایسے واقعے اکثر ہوتے رہتے ہیں اور شاہنامے میں ایک سے زیادہ موقعوں پر ان کا ذکر ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

بر آمد یکی ابر و برشد بماه
همی شیر بارید ز ابر سیاه
ندریا پدیداست و نه دشت و راغ
نه بینم همی بر هوا پر زاغ
حواصل فشاند همی هر زمان
چه سازد همی این بلند آسمان
نماندم نمکسود و هیزم نه جو
نه چیزی پدیداست تا جو درو
همه کار ها شد سر اندر نشیب
مگر دست گیرد حسین قتیب
(صفحه ۱۴۸٦ ، جلد رابع ، طبع کلکته)

اشاریہ

مرتبہ : ضیاء احمد رضوی ایم ۔ اے

اشخاص

چ

ح

خ

د

غ

ف

ق

ک

گ

ل

ن

و

ه

کتب

ر

ژ

س

ش

اصطلاحات

ن

مقامات

مجلس ترقیِ ادب لاہور کی چند مطبوعات

مقالات حافظ محمود شیرانی : مرتبہ مظہر محمود شیرانی	24.00
مقالات مولانا محمد حسین آزاد : مرتبہ آغا محمد باقر	8.00
ذوق — سوانح اور انتقاد : از ڈاکٹر تنویر احمد علوی	8.00
مومن (حالات زندگی) : از کلب علی خاں فائق	5.50
شاعری اور تخیل : از محمد ہادی حسین	6.00
اصول انتقاد ادبیات : از سید عابد علی عابد	15.00
ڈراما نگاری کا فن : از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	6.50
مرزا محمد ہادی مرزا و رسوا : از ڈاکٹر میمونہ بیگم	6.00
مباحث : ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات کا مجموعہ	13.50
میر امن سے عبدالحق تک : از ڈاکٹر سید عبداللہ	10.00
تذکرۂ مخزن نکات : از قائم چاند پوری	5.00
تذکرۂ گلستان سخن : از قادر بخش صابر دہلوی	22.00
تذکرۂ بہارستان ناز : از حکیم فصیح الدین رنج	4.50
مقالات سرسید (۱۶ حصے) : مرتبہ شیخ محمد اسماعیل	72.00
مکتوبات سرسید : مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	10.00
موعظۂ حسنہ : از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	4.00
کلیات قائم : مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن	18.00
کلیات نظام : مرتبہ کلب علی خاں فائق	9.00
مثنویات حسن (جلد اول) : مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	6.00
دیوان جہاں دار : مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	4.00
دیوان درد : مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی	3.50
کلیات نسیم : مرتبہ کلب علی خاں فائق	9.00
کلیات قلق : مرتبہ کلب علی خاں فائق	10.00
کلیات غالب فارسی : (تین جلدیں) مرتبہ فاضل لکھنوی	30.00
کلیات ذوق : مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی	15.00
کلیات سالک : مرتبہ کلب علی خاں فائق	11.00
تذکرۂ طبقات الشعرا : مرتبہ نثار احمد فاروقی	16.00
کلیات نثر حالی : (جلد اول) مرتبہ شیخ محمد اسماعیل	11.00
مغربی شعریات : از محمد ہادی حسین	18.00
دربار ملی (اردو) : ترجمہ خواجہ عبدالحمید یزدانی	20.00
تاریخ ایران : (جلد اول) از مقبول بیگ بدخشانی	25.00
مکارم الاخلاق : از مولوی ذکاءاللہ ، مرتبہ احمد رضا	11.00

مطبع عالیہ - ۱۲۰/۵ ٹمپل روڈ ، لاہور